دلّی کی شام

احمد علی



مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

دلّی کی شام

احمد علی

ترجمہ

بلقیس جہاں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

Dilli Ki Sham
by
Ahmad Ali
Rs.143/-



صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025 ☎ 011-26987295
Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔ 110006 ☎ 011-23260668
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔ 400003 ☎ 022-23774857
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔ 202002 ☎ 0571-2706142
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2012 تعداد: 1100 قیمت: -/143 روپے
ISBN:978-81-7587-865-5 سلسلۂ مطبوعات: 1667

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025
فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099
ای میل: urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
ہائی ٹیک گرافکس، ڈی 8/2، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز II، نئی دہلی 110020
اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

چند معروضات

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جس نے معتبر ادیبوں کی سینکڑوں کتابیں شائع کی ہیں اور اپنے ماضی کی شان دار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ مکتبہ کے اشاعتی کاموں کا سلسلہ ۱۹۲۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہوگیا تھا جو زمانے کے سرد وگرم سے گزرتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں۔ نامساعد حالات نے سمت و رفتار میں خلل ڈالنے کی کوشش بھی کی مگر نہ اس کے پائے استقلال میں لغزش ہوئی اور نہ عزم سفر ماند پڑا، چنانچہ اشاعتوں کا تسلسل کلی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

مکتبہ نے خلاق ذہنوں کی اہم تصنیفات کے علاوہ طلبا کی نصابی ضرورت کے مطابق درسی کتب بھی شائع کیں، اور بچوں کے لیے کم قیمت میں دستیاب ہونے والی دل چسپ اور مفید کتابیں بھی تیار کیں۔ ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنایا اور یہی عمل اس کا نصب العین قرار پایا۔ مکتبہ کا یہ منصوبہ بہت کامیاب رہا اور مقبول خاص و عام ہوا۔ آج بھی اہل علم و دانش اور طلبا مکتبہ کی مطبوعات سے تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ درس گاہوں اور جامعات میں مکتبہ کی مطبوعات کو بہ نظرِ استحسان دیکھا اور یاد کیا جاتا ہے۔

ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہوگیا تھا جس کے سبب فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کم یاب بلکہ نایاب ہوتی جارہی تھیں ان میں سے دو سو ٹائٹل قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے شائع ہو چکے ہیں اور ان سے زیادہ قطار میں ہیں (اسی دوران بچوں سے تعلق رکھنے والی تقریباً سو کتابیں مکتبہ نے بلا شرکت غیرے شائع کی ہیں)۔ زیر نظر کتاب مکتبہ جامعہ اور قومی کونسل کے مشترکہ اشاعتی سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔

مکتبہ کے اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور اس کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین محترم جناب نجیب جنگ صاحب (آئی اے ایس) وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جس خصوصی دل چسپی کا مظاہرہ کیا ہے وہ یقیناً لائق ستائش اور ناقابل فراموش ہے۔ مکتبہ جامعہ ان کا ممنون احسان رہے گا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ارباب حل وعقد کا شکریہ بھی ہم پر لازم ہے جن کے پُرخلوص تعاون کے بغیر یہ اشتراک ممکن نہ تھا۔ اوّلین مطبوعات میں کونسل کے سابق ڈائرکٹر کے تعاون کا کھلے دل سے اعتراف کیا جاچکا ہے۔ مکتبہ کی باقی کتابیں کونسل کے موجودہ فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کی خصوصی توجہ اور سرگرم عملی تعاون سے شائع ہو رہی ہیں، جس کے لیے ہم ان کے اور کونسل کے وائس چیرمین پروفیسر وسیم بریلوی صاحب کے ممنون ہیں اور تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ مکتبہ کو ہمیشہ ان مخلصین کی سرپرستی حاصل رہے گی۔

خالد محمود
مینجنگ ڈائرکٹر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

دیباچہ

یہ ناول پہلی بار ہوگارتھ پریس، لندن نے شایع کیا تھا۔ لیکن انگلستان، امریکہ اور دیگر مغربی ممالک اور ہندوستان میں مقبول ہونے اور غیر معمولی شہرت حاصل کرنے کے باوجود اُردو میں شایع نہیں ہوا۔ اب بلقیس جہاں کا یہ ترجمہ چھپ رہا ہے۔ اس کے بارے میں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ میں خود اس سے اچھا ترجمہ اُردو میں پیش نہیں کر سکتا تھا۔ اس ترجمہ کے شایع ہونے کے بعد اس ناول کے انگریزی ایڈیشن ہندوستان، امریکہ اور انگلستان میں الگ الگ شایع ہو چکے ہیں۔

ناول کے کردار اور اس کا قصہ فرضی ہیں، لیکن واقعاتِ زندگی اور دِلّی کے حالات تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ گو آج ہم دِلّی کی گہما گہمی سے محروم اور اس کی یاد سے بھی دُور ہیں مگر اس کو بھول نہیں سکتے:

گرچہ یاراں فارغند از یادِ من
من از ایشاں را ہزاراں یاد باد

احمد علی

حصّہ اوّل

شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا

— حافظ

شہر پر رات کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں گلیاں، مکان اور چھتیں بے چین نیند سو رہے تھے جوں جوں گرمی ناقابلِ برداشت ہوتی جاتی ان کے سانس لمبے اور بھاری ہوتے جاتے تھے۔

دن بھر کی محنت و مشقت سے چور، تھکے ہارے نیم برہنہ انسان کھڑی چارپائیوں پر گلیوں میں اور صحن، کوٹھوں اور راہ گزاروں پر پڑے تھے۔ اِکّا دُکّا اس وقت بھی خوش گپیاں کرتے ہوئے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے پھر رہے تھے۔ کسی کسی کے ہاتھ میں موتیا کے گجرے تھے۔ پھولوں کی مہک کچھ دور فضا کو معطر کرتی اور پھر گرمی کی حدت میں کھو جاتی۔ کُتّے غذا کی تلاش میں نالیاں سونگھتے پھرتے۔ بلیاں دوسکانوں کے آگے نکلے ہوئے پٹڑوں کے نیچے سے دبے پاؤں باہر نکلتیں اور دودھ کے ان چھوٹے آبخوروں کو چاٹنے لگتیں جو دودھ پینے کے بعد لوگ پھینک گئے تھے۔ اِدھر اُدھر گلیوں اور چوراہوں پر پڑے ہوئے کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں پر کُتّے لڑ رہے تھے اور بلیاں غرّا رہی تھیں۔

درو دیوار اور زمین سے گرمی کے بھبکے نکل رہے تھے۔ نالیوں میں سیل اور سڑاند تھی۔ جہاں جہاں موریاں بدرو میں آکر ملتیں وہاں سخت تعفن اور غلاظت تھی لیکن پھر بھی انسان ان ہی موریوں پر کھٹیاں ڈالے سو رہے تھے۔

ہر محلے میں جگہ جگہ مسجدیں اپنے سفید سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ ان کے گنبد کسی عریاں عورت کی چھاتیوں کی طرح یوں پھیلے ہوئے تھے گویا ستاروں کی سب روشنی اپنی سطح میں جذب کر لیں گے۔ ان کے مینار کہہ رہے تھے کہ خدا واحد اور اکبر ہے۔

دلّی جو قرنوں پہلے کس تمنا اور آرزوؤں سے بسائی گئی، جس کے لیے فتح و نصرت کے مقابلے ہوئے، جس کی خاطر نفرت اور رقابتوں کی معرکہ آرائیاں ہوئیں جس کے لیے نوحے بھی گائے گئے اور شادیانے بھی بجے، جو چھ سات بار اُجڑی اور بسی، آج بھی زندہ و سالم نیند کی آغوش میں پڑی سو رہی ہے۔

یہ سرزمین کبھی شہنشاہوں، تاجداروں، امرا اور رؤسا، داستان گو اور شاعروں کا مسکن تھی۔ مگر اب نہ کوئی بادشاہ ہے، نہ محافظ، نہ شاعروں کے قدر دان۔ پرانے باسی گو آج بھی زندہ ہیں مگر غیروں کے محکوم، اپنا فخر و اقتدار، اپنا نام و نمود اور تمکنت سب کچھ لٹا بیٹھے ہیں۔

شہر آج بھی آباد ہے۔ قلعے، مقبرے، محلات اور عمارتیں جو گزرے دنوں کی یاد تازہ کرتی ہیں، جوں کی توں زندگی کا دامن اس اعتماد سے تھامے کھڑی ہیں جو ادراک اور گمان سے بالاتر ہے۔

اس کی بنیاد ۱۴۵۰ قبل مسیح مہابھارت کی مشہور جنگ کے بعد مہاراجہ یودھشٹر نے رکھی اور اس کی خاطر عظیم اور تاریخی لڑائیاں ہوئیں۔ اندرپرستھ اس کی تخلیق اور لہو اس کی رگ و پے میں ہے۔ اس نے کیسے کیسے پُرشکوہ

بادشاہوں کا عروج و زوال دیکھا، کتنے وجود ظہور کے دکھ درد سنے ہیں۔ نزع کی بے تابیوں کی شاہد اور پیدائش کی خوش کن آوازوں کی سامع یہ موت و زیست کا مرقع ہے۔ انتقام اس کی سرشت اور بدلہ اس کی فطرت ہے۔

اس کے افلاک تلے دغا و فریب کے کھیل کھیلے گئے، بے وفائیاں ہوئیں اور اس کی خاک نے شہزادوں کے خون کی لذت چکھی ہے۔ مگر آج بھی ایک عالم کی ہمہ گیر آرائش دنیا کی آنکھوں کا نور اور جاذبیت کا مرکز ہے۔

پر اب اس کی وہ تابانی اور درخشانی کہاں؟ وہ منور زمانے ختم ہوئے۔ وہ لوگ رخصت ہو چکے جن کے دم قدم سے یہ آبادی تھی؛ جنہوں نے کبھی اس کو آبِ حیات بخشا تھا۔ نہ وہ کورو رہے نہ وہ پانڈو، نہ خلجی۔ کہاں ہیں وہ سید کدھر ہیں وہ بابر، وہ ہمایوں، وہ جہانگیر؟ اب کہاں ہے وہ شاہجہان آباد کا بانی؟ کہاں ہے وہ مغموم شاعر بہادر شاہ جو تاجوروں کا آخری کنارا تھا؟ سب موت سے ہمکنار ہو کر خاک سے بغلگیر زمین تلے پڑے ہیں۔ نہ اب جاہ ہے نہ حشم، صرف چند نشانیاں اس عظمتِ رفتہ کی پرملال کہانیاں سنانے کو باقی ہیں۔ قطب مینار اور ہمایوں کا مقبرہ، لال قلعہ یا جامع مسجد اور ان المناک تحریرات پر نوحہ زن چند اشعار:

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

اس شاعر بادشاہ کی آواز بازگشت بن کے موت کی بے اعتنائی اور خاموشی پورے شہر پر مسلط ہو گئی۔ گلی کوچے ویران ہو گئے اور سڑکوں پر خاک اڑنے لگی۔

نیم صدی تک اس نے اپنے وقار کو بلند اور اپنی روایات کو برقرار رکھا لیکن اب اس کے تمدن کی پاکیزگی اور معاشرے کی نفاست ملیامیٹ ہو چکی۔ ایک

زمانہ تھا کہ وہ شاعر جس نے اس کے آخری نوحے لکھے ہیں، شکرم میں لکھنؤ جاتے ہوئے اس لیے مُہر بہ لب بیٹھا رہا کہ کہیں اس کی زبان نہ بگڑ جائے اور جب مشاعرہ میں لکھنؤ والے اس کی وضع و کس مپرسی پر ہنسے اور وطن پوچھا تو یوں بولا:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دِلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
جس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

لیکن وہ شاعر بھی مر چکے اور وہ تہذیب بھی۔ رسّی جل چکی پر اُس کے بل پُرانی عظمت کی یاد دلاتے ہیں۔ ادبار اس کی عمارتوں پر چھا چکا اور نکبت و عسرت اس کے گلی کوچوں اور شاہراہوں پر برسنے لگی ــــ تاروں کی ٹھنڈی ماندی روشنی میں سارا شہر تاریک و لب مرگ معلوم ہوتا ہے۔ مٹی کے تیل کے چراغ ضرور جل رہے ہیں لیکن ان کا اُجالا راہ گذاروں اور شاہراہوں کے لیے ناکافی ہے اور نہ اس روشنی کو دوبارہ لا سکتا ہے جو کبھی جمنا کے کنارے اور شہر کے قلب میں چراغاں تھی۔ اَب تو شہر کسی پِٹے پٹائے کتّے کی طرح شکست سے بے پروا رات کی سیاہی میں بے حس پڑا ہے۔

ایک آدھ دودھ والے کی دوکان اب بھی کھلی ہے۔ کوئی آتا ہے اور دو چار پیسے کا دودھ پیتا ہے اور آب خورے کو پھینک دیتا ہے۔ بلّیاں کونوں کھدروں سے نکل آتی ہیں اور جھوٹے آب خورے کو چاٹنے لگتی ہیں۔ اکّا دُکّا فقیر بھی ابھی تک دل سوز صدائیں لگاتے، زمین کے پتھروں کو اپنے ڈنڈوں سے

کھٹکھٹاتے اور در در پھرتے گیت گاتے بھیک مانگتے پھر رہے ہیں یا ڈیوڑھیوں کے سامنے گڑگڑا رہے ہیں :

"اللہ کے نام دے دے مائی۔ تیرے بچوں کی خیر۔"

یا کوئی پھول والا بغل میں پھولوں کی ٹوکری دبائے ایک کان پہ ہاتھ رکھے لہک لہک کر آواز لگا رہا ہے :

"پھول لو جی موتیائی کے۔ کیا بہار ہے موتیائی میں۔"

لیکن شہر خاک آلود اور تپتے ہوئے آسمان کے نیچے مضطرب نیند سو رہا ہے۔ شاید ہی کوئی اس وقت پھول خریدتا ہو یا فقیر کو بھیک دیتا ہو۔ وہ پری پیکر معشوقائیں سو چکیں اور عشاق جا چکے ہیں۔

صرف تنگ و تاریک گلیاں بساطِ شطرنج کی طرح پُرفریبی سے پھیلی ہوئی ہیں جو اندرون شہر کو کچھ اسی طرح منقطع کرتی چلی جاتی ہیں جس طرح گلیوں کے دونوں طرف بہنے والی نالیاں۔ آگے بڑھ کر یہ راستے اور بھی تنگ ہو جاتے ہیں پھر کسی مکان کے سامنے یا تو ختم ہو جاتے یا آگے بڑھتے ہوئے اور گلیوں کو حسبِ معمول قطع کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان میں ایک دفعہ گھسنے کے بعد دم گھٹ کر موت کا احساس ہونے لگتا ہے۔

ایسی ہی پراسرار گلیوں کا ایک جال لال کنوئیں سے ہوتا ہوا کوچہ پنڈتاں کے عمق میں جا کر داہنے ہاتھ پر محلہ نیاریان میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس محلہ کی اپنی گلیاں ہیں اور ان کا اپنا جال ہے اور اس جال میں سے ایک شاخ راہِ حیات کی طرح پیچ در پیچ، بل کھاتی ہوئی میر نہال کے مکان پر آ کے ٹھہر جاتی ہے۔ مقابل میں لکھوری اینٹ کی ایک چار دیواری ہے جس میں صرف ایک پھاٹک نظر آتا ہے۔ جب ڈیوڑھی میں سے ہو کر گھر میں داخل ہو تو اندر کا صحن آ جاتا ہے۔ صحن کی سیدھ

میں ایک نیچا کوٹھا ہے اور کوٹھے کے نیچے دو چھوٹے چھوٹے کمرے، بائیں طرف لال اینٹوں کا چبوترہ ہے اور چبوترے پر محرابدار دُوہرا دالان۔ دالان کے عقب میں اسی کے برابر لمبا شہ نشین اور چبوترے سے ملحق دو صحنچیاں ہیں اور ڈیوڑھی کے قریب ایک پاخانہ اور مختصر سا غسلخانہ۔ اس کے بعد باورچی خانہ ہے جس کی دیواریں لکڑی کے دھوئیں سے کالی بھٹ ہو چکی ہیں۔ انگنائی کے بیچوں بیچ ایک کھجور کا پُرانا درخت آسمان کی طرف سر بلند کیے کھڑا ہے جس کے لمبے لمبے پتوں نے آسمان کے کچھ حصے کو چھپا کر نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔ اس کا تنا بیچ میں سے خمیدہ ہے جو رات کے اندھیرے میں اور بھی بدہیئت اور سیاہ نظر آتا ہے۔ اس کی جڑ میں مہندی کا ایک پیڑ ہے، جس کی ٹہنیوں پر گوریّوں نے گھونسلے بنا رکھے ہیں۔ اس پر دو مٹی کی کونڈیاں اُن جنگلی کبوتروں اور چڑیوں کے دانے پانی کے لیے تاروں سے لٹک رہی ہیں جنہوں نے دالان کی کارنس اور محرابوں کی سُرخ و سفید باناتی کے پردوں میں گھونسلے بنا رکھے ہیں۔

کوٹھے کی دیوار کے پاس تخت ہیں جن پر قند کا فرش بچھا ہے چبوترے اور صحن میں کچھ بان کے پلنگ پڑے ہیں جن پر اُجلی اُجلی سفید چادریں بجھی ہوئی قندیل کی ہلکی ہلکی روشنی میں بہت بھلی لگ رہی ہیں۔

ایک بڑی بی جو پچاس سے اُوپر ہوں گی انگنائی میں پلنگ پر لیٹی ہیں۔ برابر ہی دوسرے پلنگ پر ان کی سب سے چھوٹی بیٹی مہرو زمانی جو چودہ پندرہ برس کی تندرست و توانا لڑکی ہے، لیٹی ہوئی ہے اور اس ہی کے پاس ان کا تیرہ سالہ بھتیجہ مسرور لیٹا ہوا ہے۔ بیگم نہال نے بیٹی سے کہا:

"اے بی ساڑھے گیارہ بج گئے ہوں گے تمہارے ابا ابھی تک نہیں آئے۔ جاؤ تم بھی اب سو جاؤ بہت اودیہہ ہو گئی ہے۔"

"نہیں بی اماں مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی، تم جو کہانی سنا رہی تھیں بڑی مزیدار تھی۔ اچھی ایک اور سنا دو، نا۔"

پنکھا جھلتے ہوئے بڑی بی بولیں۔ "تم نے آج کافی سن لیں، اب کل کے لیے اٹھا رکھو۔"

مسرور نے پیٹ کے بل لیٹ کے دونوں ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھ لیے اور امید بھری آنکھوں سے پھوپی کو دیکھتے ہوئے کہا:

"نہیں پھوپی جان! ایک وہ کہانی اور سنا دیجیے۔ کیا نام تھا اس کا جس میں سانپ بادشاہ بن جاتا ہے۔ مجھے بڑی اچھی لگتی ہے وہ۔"

پھوپی بولیں: "اے چندا کل ہی تو سنائی تھی تجھے راجہ باسط کی کہانی۔"

"نہیں بھئی وہ تو ہم ہزاروں دفعہ سن چکے ہیں بہت پرانی ہے۔"

مہرو زمانی پنکھا ہلاتی ہوئی بولی۔ "اماں ہمیں تو غدر کی باتیں سنا دو۔ غدر میں کیا کیا ہوا تھا۔ ایک بار تم کہہ رہی تھیں کہ فرنگیوں نے سب مسلمانوں کو لوٹ کر شہر بدر کر دیا تھا۔"

"یہ تو لمبی کتھا ہے بیٹی کسی اور دن فرصت سے سناؤں گی، اب تمہارے ابا بھی تو بس آتے ہی ہوں گے۔ توبہ گرمی کس بلا کی ہے دم گھٹا جاتا ہے۔"

بچے چپ ہو جاتے ہیں۔ رات بہت ہو گئی تھی اور نیند کے جھونکے ان کو تھپکنے لگے تھے۔ مہرو اپنے بچھونے پر لیٹ کر ستاروں کو دیکھنے لگی۔ اس کے ذہن میں عجیب عجیب خیال آ رہے تھے، بادشاہوں، شہزادوں اور سپاہیوں کے اور ان کے ساتھ ہی ایک انجان آدمی کا جو دور پردیس میں رہتا تھا اور جس کا پیغام مہرو کے لیے آیا تھا۔ وہ کیسا ہوگا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ مہرو نے کبھی اس کو دیکھا نو نہ تھا صرف اتنا سنا تھا کہ وہ شکار کا بہت شوقین ہے۔ بڑے امیر کبیر اور دولت مند لوگ

ہیں۔ اس کا نام معراج ہے۔ نام تو خاصا پیارا ہے۔ لیکن وہ صورت مرتب نہ کر سکی اور معراج اس کو کہانیوں کا وہ خوبصورت اور بہادر شہزادہ معلوم ہونے لگا جس سے شہزادی کو محبت ہو گئی تھی۔ مگر ساتھ ہی اس کو اپنے ماں باپ بھائی بہن اور گھر چھوٹنے کے خیال نے کچھ افسردہ کر دیا۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کے آنکھیں بند کر لیں اور دوبارہ اپنے تصورات میں کھو گئی۔ مسرور کبھی کا سو چکا تھا۔

بیگم نہال اٹھیں، پٹاری قریب کھسکائی، پان کا ڈنٹھل توڑ کر کتھا چونا لگایا اور باریک کٹی ہوئی چھالیہ الائچی اور زردہ ڈال کر گلوری منہ میں رکھ لی، پھر لیٹ کر پنکھا جھلنے لگیں اور کبھی کبھی اپنے قریب لیٹی ہوئی بیٹی کو بھی جھلتی جاتی تھیں......

"اے ہے میرا پنکھا کہاں گیا، بی انجم! کیا تم سو گئیں؟ میرا پنکھا دیکھا ہے؟" کوٹھے پر سے آواز آئی۔

"اے مجھے تمہارے پنکھے کی کیا خبر، ہو گا وہیں کہیں پلنگ پر۔"

"یہاں تو نہیں ہے۔"

"تو پھر نیچے گر گیا ہو گا......"

پھر ایک مکمل سکوت سارے گھر پر چھا گیا۔ لو کا ایک جھونکا آیا، کھجور کے پتے کھڑکھڑائے، لالٹین کی لو بھڑکی اور پھر ٹھہر گئی......

شمس کی نئی نویلی دلہن گھر کی بہوت بہو جو چبوترے پر اپنے میاں کے پاس سو رہی تھیں اٹھیں اور مٹکے میں سے لوٹا بھر کے پاخانے چلی گئیں۔ جب وہ واپس آ کر لیٹیں تو ڈیوڑھی کے کواڑ چرچرائے اور ایک مرد کے کھنکارنے کی آواز آئی۔ بیگم نہال اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ سرہانے سے دوپٹہ کھینچ کر اوڑھ لیا اور ماما کو آواز دی:

"دلچین! اری دلچین! اٹھ میاں آ گئے۔"

دلچین جھٹ پٹ اٹھ بیٹھی اور آنکھیں ملتی ہوئی باورچی خانے کی طرف

چلی گئی۔ میر نہال اندر آئے۔ یہ دراز قد اور دُہرے بدن کے جامہ زیب آدمی تھے۔ سفید تنزیب کا انگرکھا پہنے ہوئے تھے اور کڑھی ہوئی گول ٹوپی پٹھوں پر بانکپن سے ترچھی رکھی ہوئی تھی۔ ان کی بنی سنوری چڑھی ہوئی سفید ڈاڑھی کی مانگ کا ایک بال بھی بے جگہ نہ تھا۔ ان کے چہرے پر رعب و دبدبہ اور ان کی چال میں وجاہت اور شاہانہ وقار تھا۔

"آج تم بغیر کھائے پیے ہی چلے گئے" بیگم نہال نے ذرا تنک کر کہا "کون وقت ہو گیا کب سے راہ دیکھ رہی ہوں۔"

"ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں۔" میر نہال نے دبے لہجے میں جواب دیا۔ "گلی کے نکڑ پر گھنٹہ کی آواز آئی تھی۔"

اتنے میں دلچین سینی میں کھانا لے آئی۔ بیگم نہال نے تخت پر دسترخوان بچھا کر کھانا چن دیا۔ میر نہال نے انگرکھا اتار کر گاؤ تکیہ پر رکھ دیا۔ جا کر ہاتھ دھوئے اور اُکڑوں بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ بیگم نہال قریب بیٹھی پنکھا جھلنے لگیں اور پھر میاں سے بولیں:

"اصغر اللہ رکھے بائیسویں میں ہے۔ اب تمہیں اس کے بیاہ کی فکر کرنی چاہیے خدا نہ کرے کہیں ایسے ویسے فعلوں میں نہ پڑ جائے۔"

"میں خود تم سے کہنے والا تھا۔ کیا سو گیا؟"

"نہیں کھانا کھا کر کہیں گیا ہے۔ ابھی تک نہیں آیا۔"

"صاحبزادے تشریف لے کہاں گئے ہیں؟" میر نہال نے پوچھا۔

"لو اور سنو! مجھے کیا خبر۔ کسی بھائی وائی کے گھر گیا ہوگا۔"

"جی نہیں آپ کے چہیتے اپنے رشتے داروں میں نہیں جایا کرتے" میر نہال ذرا برہم ہو کر بولے "بس وہیں ہوں گے مرزا شہباز بیگ کے ہاں میں تم سے

ہزار بار کہہ چکا ہوں مجھے اس کا بُندو سے یارانہ قطعی پسند نہیں ہے مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے اس کو جا و بیجا ڈھیل دے رکھی ہے۔ جہاں سینگ سماتے ہیں منہ اُٹھا کر چلا جاتا ہے، جس ہما شما سے جی چاہتا ہے ملتا ہے اور آماں جان ہیں کہ ہوں سے توں نہیں کرتیں۔"

بیگم نہال بولیں "اوئی تم تو مجھ ہی پر برس پڑے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ پھر مرد ذات۔ کیا چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھ جائے؟ اپنے ہم عمروں سے نہیں ملے گا تو کیا بڈھے کھڈوں میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرے گا؟ بُندو اور وہ بچپن سے ساتھ پڑھے ہیں اور پھر تمہارا بھانجا اشفاق بھی تو وہیں رہتا ہے۔ اس کے پاس چلا جاتا ہوگا۔"

میر نہال نے دھیمے پڑتے ہوئے جواب دیا:

"مگر تم کو خوب معلوم ہے اشفاق کی شادی مرزا شہباز کے ہاں میری مرضی کے خلاف ہوئی اور نہ مجھے اصغر کا میل جول بُندو سے ایک آن گوارا ہے۔ تم اس کو منع کیوں نہیں کرتیں آخر؟"

اس مرتبہ بیگم نہال تیز ہوتے ہوئے کہنے لگیں:

"اللہ بلا بر گردنِ مُلّا! ہر بات میں تم مجھ ہی کو قصور وار ٹھہراتے ہو۔ تمہاری ان باتوں سے تو میرے مرچیں لگتی ہیں۔ آخر وہ تمہارا بھی تو بیٹا ہے۔ تم خود کیوں نہیں کہتے، اور اسی لیے میں اس کی شادی کا کہہ رہی تھی۔" پھر بات کا رُخ بدلتے ہوئے بولیں "تم اللہ رکھے باہر کے پھرنے والے۔ گھر کی تمہیں خبر نہیں۔ میری جان کو ایک فکر ہو تو کہوں، سیکڑوں غم لگے ہیں۔ تمہاری مہرو ہی کا فکر کھائے جاتا ہے۔ تو تم سے کہنا ہی بھول گئی۔" پھر اُنھوں نے مُڑ کر اپنی بیٹی کی طرف دیکھا جو بے خبر سو رہی تھی۔ جوں ہی وہ مُڑیں لالٹین کی روشنی اُن کے چہرے پر پڑی اور ان کی محراب دار پیشانی پر تین بل نمایاں ہو گئے۔ "ہاں تو میں کہہ رہی تھی بھوپال سے خط

آیا ہے۔ اُن لوگوں کو جلدی ہے۔"

میر نہال کی تیوری چڑھ گئی اور انھوں نے گردن اٹھا کر بیوی کو دیکھا۔ اُن کے سُرخ و سفید چہرے پر تفکّر کے آثار پیدا ہو گئے۔

"تمہیں اِس کی آخر ایسی کیا جلدی پڑی ہے۔ مہرو ابھی بچّہ ہے۔ پردیس کا معاملہ ہے۔ ٹھونک بجا کر دیکھ لینا چاہیے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ وہ لوگ میری سمجھ میں تو آئے نہیں۔"

بیگم نہال کہنے لگیں۔" لو جلدی کی بھی خوب کہی۔ بچّوں کا بیاہ کوئی گڈّے گڑیا کا تو کھیل ہے نہیں۔ آخر دُو چار برتن بھانڈے گہنے پاتے کا بھی انتظام کرنا پڑے گا اور تم تو جو پیغام آتا ہے اُسی میں ہندی کی چندی نکالنے لگتے ہو۔ ساری دُنیا اُن کے گُن گاتی ہے۔ میر وہاج الدین کی جائداد ہی کوئی لاکھ سوا لاکھ کی ہے۔ سُننے والے تو مہرو کی تقدیر پر رشک کرتے ہیں۔"

میر نہال بیوی کو سمجھانے لگے:

"مگر ذرا یہ تو سوچو اصغر بڑا ہے۔ مہرو کی شادی بھلا اس سے پہلے کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے بھی کوئی لڑکی ڈھونڈی؟"

"ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے؟ لڑکیوں کا کوئی کال ہے؟ کُنبے ہی میں ہزاروں ایک سے ایک بڑھ کر موجود ہیں۔ مگر تم سے آج کہتی ہوں میری نظر تو ہمیشہ سے بھائی نصیر الدین کی چھوٹی بیٹی پر ہے۔"

میر نہال نے ہوں کی اور کہا:

"تم نے اصغر کو بھی ٹٹولا کیا کہتا ہے اس کے بارے میں؟"

اتنے میں جال میں کبوتروں کے زور زور سے پھڑپھڑانے کی آواز آئی اور میر نہال نے کان اُدھر لگا کر کہا: "کیا چیز ہے؟"

"ہوگی کوئی بلی ولی۔"

جانور پھر پھڑپھڑائے۔ میر نہال نے لالٹین اٹھائی اور کبوتروں کے جال کی طرف لپکے۔ قریب پہنچ کر جال کی پتواروں میں روشنی ڈالی۔ مگر کوئی چیز بھی دکھائی نہیں دی۔ وہ بیٹھے ہی تھے کہ کبوتروں نے پھر پھڑپھڑانا شروع کیا۔ میر نہال نے جال کا دروازہ کھول کر لالٹین کی روشنی میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ایک کابک کے پیچھے کالی رسی ہلتی ہوئی دکھائی دی۔

"سانپ ہے سانپ!" میر نہال چلائے: "دلچین! لائیو میرا ڈنڈا!"

دلچین بدحواس ہو کر ڈنڈا لانے کوٹھری میں گھسی اور اُس کے ساتھ ہی کسی برتن کے گرنے کی جھنکار اور ایک عورت کی ڈری ہوئی "اوئی" سنائی دی۔ اتنی دیر میں سانپ ایک کابک سے نکل کر دوسری کے نیچے چلا گیا۔

"جلدی لا دلچین! جلدی لا!" میر نہال نے پھر چیخ کر کہا۔

دلچین گھبراہٹ میں ایک کنڈالی سے ٹھوکر کھاتی ہوئی ڈنڈا لے کر پہنچی۔ سانپ کو باہر نکالنے کے لیے میر نہال نے کابک پرے سرکائی مگر وہ سرے انگنائی میں پہنچ گیا۔ میر نہال تیزی سے باہر نکل آئے اور اُس کے پیچھے دوڑے۔ پیشتر اس کے کہ وہ اس پر ایک وار کریں سانپ موری میں گھس گیا۔ میر نہال نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ اپنا پورا ہاتھ موری میں ڈال دیا۔ تخت پر سے بیگم نہال چلائیں۔

"ہائے ہائے، ایسا غضب نہ کرنا" اور وہ جلدی جلدی انہم یکیدون کیدا پڑھ کر سانپ کو کیلنے لگیں۔

لیکن میر نہال نے سانپ کی دم پکڑ کر اُسے باہر کھینچ لیا اور اس زور کا جھٹکا دیا کہ اس کی کڑیاں ٹوٹ گئیں۔ سانپ تڑپتا رہا مگر آگے نہ بڑھ سکا۔ میر نہال نے ڈنڈے سے اس کا پھن کچل دیا۔ تھوڑی دیر تو سانپ بل کھاتا رہا پھر ٹھنڈا ہو گیا۔

کوٹھے پر سے میر نہال کی بھاوج جمال بیگم نے پوچھا:
"ہے ہے کیا تھا؟"
"کچھ نہیں بھابی جان، سانپ تھا۔ میں نے ماردیا" یہ کہہ کر میر نہال مسکرائے اور خوشی سے ان کی باچھیں کھل گئیں۔
"اللہ نے بڑی خیر کر لی"
شمس بھی شور سے اٹھ گیا اور سانپ کو دیکھتے آپہنچا۔ دلچین نے جو ابھی تک سانپ کو الٹ پلٹ رہی تھی شمس کو ساری داستان سنائی۔ میر نہال مسکراتے ہوئے جال کے اندر گھس گئے اور کبوتروں کو دیکھنے لگے۔ ان کے شیرازی کے ایک پٹھے کو سانپ نے ڈس لیا تھا اس کا انھیں بہت قلق ہوا۔ کیونکہ کئی جھول ضایع ہونے کے بعد یہ ایک بچا تھا کبوتر کو ڈبے پر ڈال کے میر نہال ہاتھ دھو کر کھانا ختم کرنے بیٹھ گئے۔ کھانے سے فارغ ہو کر انگرکھا سنبھال کے بیٹھک کی طرف چل دیے۔ جیسے ہی ڈیوڑھی میں پہنچے اصغر چوروں کی طرح دبے پاؤں آتا دکھائی دیا۔ اصغر خوبرو تھا۔ چوڑا سینہ متناسب ہاتھ پاؤں اور نکلتا ہوا قد۔ اس وقت اس کے بالوں میں تیل پڑا ہوا تھا، کلائی میں موتیا کا گنٹھا تھا، اور سر پر ترکی ٹوپی بڑی ادا سے اوڑھ رکھی تھی۔ شیروانی کے اوپر کے بٹن کھلے ہوئے تھے جس میں سے انگریزی کالر کی رنگین قمیص دکھائی دے رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مردانہ حسن سے زیادہ نسوانیت کا احساس ہوتا تھا۔ میر نہال تھم گئے اور بگڑ کر بولے:
"کیا شریفوں کے بچے کہیں آدھی آدھی راتوں کو گھروں میں گھستے ہیں؟ کہاں غائب رہتے ہو؟ تمہارے لچھن مجھے اچھے نظر نہیں آرہے۔ دنیا بھر کے لچے لفنگے آپ کے یار ہیں۔ تم سمجھتے ہو جیسے ابا کو کچھ خبر ہی نہیں۔ باوا دادا کا نام

خوب روشن کرو گے۔"

اصغر کچھ دیر گردن جھکائے کھڑا رہا۔ جب اندر جانے کو بڑھا تو اُس کے ولایتی بوٹ چرچرائے اور میر نہال جاتے جاتے رُکے اور پھر اصغر سے کہنے لگے:

"تمہیں معلوم ہے مجھے ان انگریزی جوتوں سے چڑ ہے۔ نہ ادب رہا نہ لحاظ۔ باپ کے کہنے کو اس کان سُنا اُس کان اُڑا دیا۔ میر نہال کا بیٹا اور انگریزی بوٹ میں اکڑتا پھرے۔ ذرا گریبان میں مُنہ ڈال کر دیکھو۔ کس کا خون ہو۔ میری اولاد اور یہ طور! کان کھول کر سُن لو میاں صاحبزادے! جب تک میں زندہ ہوں تمہاری فرنگیت اس گھر میں نہیں چلے گی۔ جاؤ پھینکو ابھی ان جوتوں کو۔ بس آخری بار کہہ رہا ہوں۔ آئندہ کسی قسم کی بے راہ روی مَیں نہ دیکھوں ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"

میر نہال باہر چل دیے۔ اصغر کھسیانا سا ہو گیا۔ اُس نے چپکے سے لالٹین اٹھائی اور کمرے کا رُخ کیا چبوترے پر سے کسی عورت کی کھُسر پُھسر سنائی دی:

"رہنے دو یہ چونچلے۔ وقت دیکھو نہ محل۔"

اصغر کمرے سے نکل آیا۔ کھجور کے پتوں میں ہوا سَرسَرائی۔ ایک تارا ٹوٹ کر سُرخ روشنی چھوڑتا ہوا زمین کی طرف گرا اور کھجور کی آڑ میں نظروں سے اوجھل ہو گیا اور رات کی تاریکی تمام دُنیا پر پھیل گئی۔

۳

اصغر چھت پر اکیلا سوتا تھا۔ وہ اوپر جا کر اپنے بچھونے پر لیٹ گیا گرمی سخت تھی اور ہوا بالکل بند۔ ایک پتہ تک نہ ہلتا تھا۔ وہ گرمی سے بے چین اِدھر اُدھر کروٹیں بدلتا رہا۔ کبھی اُٹھ کر پانی پیتا، کبھی آنکھیں زور سے بھینچ کر لیٹ جاتا۔ نیند اس سے کوسوں دور تھی اور خیالات اسی طرح منتشر۔

جب رات ڈھلنے لگی تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سر سرائی اور اصغر آسمان کو ٹکٹکی باندھ کر تکنے لگا۔ اَن گِنت ستاروں کے جھرمٹ جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ چھوٹے بڑے ستارے الگ الگ شان و شوکت سے یوں چمک رہے تھے گویا اپنا دربار سجائے بیٹھے ہوں۔ ہر ستارا ایک دوسرے پر خندہ زن تھا اور ہر ایک سلطنت گردوں لوٹ لینا چاہتا تھا۔ ستاروں کی چشمک اسی طرح چلی جا رہی تھی۔ نور کے ننھے ننھے خدنگے ہر طرف برس رہے تھے جن کی ضیا پاشی نے فضائے آسمانی کو حسین و دلفریب بنا دیا تھا۔

ہر وضع قطع کے ستارے جڑاؤ زیوروں کی طرح یوں جھلمل جھلمل کر رہے تھے جیسے کسی ہار کے موتی یا کسی حسینہ کے ماتھے کا جھومر۔ سات سہیلیوں کا جھمکا عین اصغر کے سر پر جگہ جگہ کر رہا تھا اور اس کا بڑا ستارا کسی کے ماتھے کی بندیا کی طرح چمک رہا تھا۔

آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ جدھر بھی نگاہ جاتی تھی تارے ہی تارے تھے، اور ہر ستارے میں ایک دلکش دنیا آباد تھی۔ گویا ہر ستارا اپنی جگہ ایک حسین دوشیزہ تھا ان کی جادو بھری دنیا میں اصغر کچھ ایسا کھویا کہ اس کو نہ اپنا ہوش رہا نہ دنیا و مافیہا کی خبر۔ ایک کشش تھی جو اس کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اور وہ آہستہ آہستہ بادِ سحر کے پروں پر خلا کی پہنائیوں میں ایک آزاد پرندے کی طرح بے تکان اُڑنے لگا۔ وہ ابھی مصروفِ پرواز ہی تھا کہ رفعتیں کم ہونے لگیں اور زمردی جہاں اس کے قریب تر آنے لگے۔ ہر ستارے کی حسینہ مسکرا مسکرا کر اس کی طرف دیکھتی، انوار کی تجلیاں فضا میں بکھر جاتیں اور اصغر کی پرواز زیادہ تیز ہو جاتی۔ پھر جیسے ہی ایک شوخ چشم حسینہ نے اُسے اپنی طرف بلایا، ستاروں نے اپنے محور چھوڑ دیے اور اس کی طرف اترنے لگے اور جوں جوں نیچے اترتے بڑے ہوتے جاتے تھے۔ اصغر پر ایک نامعلوم سا خوف چھا گیا۔ اس نے اپنی رفتار تیز کی۔ لیکن ستارے بھی اُسی تیزی سے گردش کرتے ہوئے بڑھنے لگے، یہاں تک کہ زمرد کی بڑی بڑی چٹانیں دکھائی دینے لگیں۔ یہ سبز چٹانیں اس کی طرف ایک ایک کر کے لگاتار اُترنی شروع ہوئیں اور اس کے اتنے پاس آ گئیں کہ اصغر کی نگاہوں سے آسمان اوجھل ہو گیا اور یہاں سے وہاں تک صرف لاجوردی پہاڑ ہی پہاڑ نظر آتے تھے۔ وہ ڈرا اور دہشت سے تھر تھر کانپنے لگا۔ بے دم ہو کر وہ زمین کی طرف گرنے لگا اور دل تھا کہ ڈوبا جاتا تھا خوف سے مجبور وہ بے کراں خلا میں معلق تھا۔ ارد گرد سہارے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔

ایک حد پر آ کر چٹانیں ٹھہر گئیں اور وہ خود بھی گرتے گرتے رُک گیا ——

ٹھہرتے ہی ہمت اور شوق بھی بڑھ گئے۔ چنانچہ وہ پھر بلندیوں کی طرف مائلِ پرواز
ہو گیا۔ ستاروں کا بڑا ہونا اور اُترنا ختم ہو چکا تھا اور وہ آسمان کی رفعتوں میں
آزادانہ اِدھر سے اُدھر اُڑنے لگا۔ اُڑتے اُڑتے وہ ستاروں کی لاجوردی دنیا میں
پہنچ گیا۔ کوکب و انجم اس کے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ درخشاں اور پری چہرہ
شہزادیاں کرنوں کا لباس پہنے ستاروں میں سے رقص کرتی ہوئی نکلیں اور اصغر کو اپنے
حلقے میں لے لیا۔ اُن کے بدن سیمیں اور سڈول تھے۔ اُن کی آنکھیں بڑی بڑی اور
روشن تھیں۔ ان آنکھوں میں بے پایاں مسرت کے پیغام تھے اور نشاطِ ابدی کی
دعوت۔ ان کے سیاہ بال ہوا کے ساتھ لہرا رہے تھے۔ اُن کا رقص مستانہ تھا جس
کی ہر حرکت اور بھاؤ کے ساتھ اُن کے سینے مدوجزر کی طرح ڈوبتے اور اُبھرتے تھے۔
ہر ہر طرح سے وہ اس کو لبھاتیں رِجھاتیں اور نو بہ نو ترغیبیں دیتیں۔ لیکن ہجومِ حسن و
رعنائی سے وہ ایسا محوِ حیرت تھا کہ ناچنے کا خیال بھی اُس کے دل میں نہ آیا۔ لیکن پھر آپ
ہی آپ اُس کے ہاتھ اور پیر والہانہ انداز سے جنبش میں آگئے۔ وہ کشاں کشاں ان کے
رقص میں شامل ہو گیا۔ اپنی بے خودی میں اُس نے اپنی دیرینہ محبوبہ مشتری بانی کو بھی آتے
ہوئے نہ دیکھا مگر جب وہ ہوش میں آیا تو مشتری بانی کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ خوشی سے اس
کے ہاتھ پاؤں کی رفتار تیز ہو گئی۔ پھر تمام ستارے ایک ایک کر کے معدوم ہونے لگے اور
مشتری بانی بھی رخصت ہو گئی۔ اسے کسی چیز کا بھی احساس باقی نہ تھا۔ نہ وہ خود باقی تھا نہ
مشتری بانی۔ جو کچھ بھی تھا وہ محض اس کا اپنا تن تھا جس سے اس کو محبت تھی۔ وہ اپنے ہی
عشق میں آپ گرفتار تھا۔ پھر یہ منظر بھی جس طرح سامنے آیا تھا اسی طرح غائب ہو گیا جب
اس کی آنکھ کھلی ہے تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ تنہا پلنگ پر لیٹا ہوا ستاروں کو دیکھ
رہا تھا۔ مگر وہ کہکشاں جو تھوڑی دیر پہلے جھمک رہی تھی کہاں چلی گئی؟ وہ جو منظر
اُس نے ابھی ابھی دیکھا تھا وہ خواب تھا یا حقیقت؟ اسی خیال میں اس کی آنکھیں

بند ہو گئیں ۔

دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی تو کہکشاں آسمان پر اس سرے سے اُس سرے تک ایک تابناک لکیر کی طرح کہیں سے کشادہ کہیں سے پتلی ہوتی ہوئی دور اُفق تک چلی گئی تھی اور اُسے وہ واقعہ یاد آ گیا جب رسول اللہؐ کہکشاں پر چلتے ہوئے عشق کی اس لافانی ساعت کے لیے فردوسِ بریں پہنچے تھے، اور آپ کے قدموں نے اس راہ گزر کو جو انھیں خدا تک لے گئی تھی متبرک و درخشندہ کر دیا تھا۔ اور اصغر کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ خود بھی کہکشاں پر چلتا چلا جا رہا ہو۔ اس سے بہت آگے کہکشاں کی متوازی منوّر راہ پر ایک پری پیکر بال بکھیرے قدسیانہ شان سے چلی جا رہی تھی۔ دیکھتے ہی اُس نے بلقیس کو پہچان لیا۔ جذبِ محبت سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اور وہ بھی قدم بڑھا کر اُس کے پاس پہنچ گیا۔ پھر دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دوش بدوش کیف و مستی سے مخمور آگے بڑھتے رہے۔ لیکن اُفق کا کنارا نزدیک آ چکا تھا اور راہ گزرِ کہکشاں ختم ہو گئی جس کے آگے سوائے ایک عمیق اور تاریک خلا کے کچھ اور نہ تھا۔ جب اس کی نگاہ اس پُرہول اور بے پایاں گہرائی پر پڑی تو اس کا سر چکرانے لگا اور پیشانی پر پسینے کی بوندیں آ گئیں۔ کچھ کہنے کو وہ بلقیس کی طرف مڑا لیکن وہاں نہ بلقیس تھی نہ کوئی دوسرا اور اس لامحدود خلا کے کنارے وہ تن تنہا ظلمتوں میں حیران و پریشان کھڑا تھا۔ . . . .

اِسی اثنا میں ایک بڑا ستارا جو اور ستاروں سے کہیں زیادہ روشن تھا اس کی طرف بڑھا اور اصغر کے قریب پہنچ کر مسکرانے لگا۔ پھر ایک ماہ وش دوشیزہ کا روپ لے کر اس نے اصغر کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے ساتھ رقص کرنے لگا۔ جب یہ دونوں قریب ہوئے تو اُسے بلقیس کا دل آویز چہرہ نظر آیا۔ یکایک وہ اُس سے ہم آغوش ہو گیا۔ ان کے ہونٹ ایک دوسرے سے مل گئے اور اصغر

ایک روحانی لذّت اور سرخوشی سے سرشار تھا۔ جو اِس دنیا میں میسّر نہیں ....

اصغر نے آنکھیں کھولیں۔ اس کے ہونٹوں پر ابھی تک ہلکی سی لرزش تھی۔ آسمان پر کاروانِ کہکشاں جا چکا تھا۔ صرف ایک بڑا سبز ستارا اُفق کے کنارے پر جگمگ جگمگ کر رہا تھا اور اصغر ستاروں کے روشن تصور میں غافل سو گیا۔

۳

نثار احمد کی پُر از شان و شکوہ اذان نے دُنیا کو عالمِ خواب سے بیدار کر دیا۔ ان کی دلنشین آواز ہلکورے لیتی ہوئی کسی نغمہ کی طرح گونج اُٹھی اور ایمان والوں کے لیے عبادت کی دعوت اور پیامِ امید و سرخوشی لیے ہوئے گلی کوچوں میں بلند ہوئی اور دُور دُور پھیل گئی۔ ابھی شب کی تیرگی باقی تھی اور افق پر انجم فروزاں، لیکن مشرقی گوشوں میں آثارِ زندگی ہویدا ہو چلے تھے۔

نیند سے چُور لوگوں نے شیریں خوابوں میں اُن کی آواز سُنی۔ کچھ کلبلائے، نیم بیدار ہوئے اور پھر لذتِ شبانہ کی سرمستیوں میں گم ہو گئے۔ کچھ آنکھیں مَلتے ہوئے اُٹھ بیٹھے اور نماز کی تیاریاں کرنے لگے۔

اذان کے ساتھ ہی ساتھ چڑیاں بھی ایک ایک دو دو کر کے جاگ اُٹھیں اور چُوں چُوں کر کے وہ شور مچانے لگیں کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کا غل اُبدی ہے اور کبھی ختم نہ ہوگا۔ کتے بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور کھانے کی تلاش میں زمین کو

سونگھنے اور گندگی میں تھوتھنیاں ڈالنے لگے۔

رفتہ رفتہ ہلکی سبز روشنی سارے جہان میں پھیل گئی۔ ستارے ماند پڑ گئے، پل بھر کو ٹمٹمائے اور اپنے چہروں کو دامنِ سحر میں چھپا لیا۔ اُن کے اوجھل ہوتے ہی زمین کے تاریک کونوں میں بھی اُجالا پھیل گیا۔ شوخ آفتاب نے بڑھ کر زمین کو جھانکا اور اس کی رنگ برنگی کرنیں جمنا کے سینے پر مچل گئیں پانی میں گلابی، سرخ اور اودے رنگ دَمک اُٹھے، اُس کی شعاعیں جامع مسجد کے اونچے میناروں کو چومتی ہوئی سنگِ مرمر کے گنبدوں پر منعکس ہوئیں اور گمٹیوں اور عمارتوں پر پھیل گئیں اور سارے شہر میں روشنی کا سیلاب اُمنڈ آیا۔

آسمان کبوتروں کی ٹکڑیوں سے ڈھک گیا۔ اُن کے غول ہر سمت میں اُڑتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ یہ غول ایک دوسرے سے لڑتے تھوڑی دیر تک کاٹے کاٹتے پھر ان میں سے ٹکڑیاں کٹ کٹ کر الگ ہو جاتیں اور کبوتر جوڑ جوڑ کر اپنی اپنی چھتوں پر اُتر جاتے۔ کبوتر بازوں کی آؤ آؤ اور کوہا کا مستقل شور ہر طرف سنائی دیتا تھا۔

چھتوں پر یہ دھوم تھی اور نیچے گلی کوچوں میں چنے والے میلے کچیلے کپڑے پہنے، کمر پر جھولے ڈالے چنے بیچتے پھر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ہی فقیر بھی آنے شروع ہو گئے۔ کوئی اکیلا آتا تو کچھ ٹولیوں میں۔ کوئی شعر گاتا تو کوئی کشکول جھنکاتا اور کوئی دستِ پناہ بجا بجا کر آٹے، روٹی یا پیسے کی صدا لگاتا۔ دھمال ڈال کر جھومتے، دائیں بائیں پیر پٹخ کر کودتے، سر دھنتے اور دھما دھم موصلی بجا بجا کر زور زور سے گاتے:

دھم قلندر اللہ ہی دے گا۔ دودھ ملیدہ اللہ ہی دے گا
شکر شیرہ اللہ ہی دے گا۔ دھم قلندر اللہ ہی دے گا

بوڑھا جوان ہر رنگ کا فقیر آتا اور ہر ایک کی وضع نرالی ہوتی۔ گورے کالے،

ڈڑھیل، سنڈ مسنڈ، بے ڈاڑھی مونچھ، کسی کے سر پر کلاہ تو کسی کے سر پر کنٹوپ یا کوڑیاں ٹکی ہوئی ٹوپی ہوتی۔ کسی کا سر گھٹا ہوتا تو کوئی زلفیں بکھیرے ہاتھوں اور گلوں میں رنگ برنگی پتھر کے موتیوں کی مالائیں ڈالے کلائیوں میں کڑے اور پاؤں میں جھانجن پہنے کوئی کمبل پوش تھا تو کسی کی قبا کے دامن ہوا میں لہراتے، کسی کا پیراہن ٹاٹ کا ہوتا اور کوئی پیوند پارے کی گدڑی کاندھے پر ڈالے یا میلی تہہ بند باندھے ہوئے۔ مکانوں کے دروازے کھلتے، ٹاٹ کے پردے ہٹتے اور کسی نازک اندام کے گورے گورے ہاتھ یا تو فقیر کو پیسے دیتے یا باسی کوسی کھانا اس کی طرف بڑھا دیتے۔ فقیر گھر والوں کو نام بنام دعائیں دیتے اور آگے بڑھ جاتے۔

مرد اپنے اپنے کاروبار میں مشغول ہو گئے۔ گلیوں میں چاندی کے ورق کوٹنے کی آوازیں اس طرح آنے لگیں جیسے بھری ہوئی بوتلوں کے کاک یکے بعد دیگرے کھل رہے ہوں اور ان آوازوں کے ساتھ ٹین والوں نے بھی زور زور سے چادریں پیٹنی اور ٹھناٹھن شروع کر دی۔ شہر میں محنت اور مشقت کا آغاز ہوتے ہی ہر سمت سے شور و شغب کی آوازیں گونج اٹھیں اور زندگی کی پیہم جد و جہد شروع ہو گئی۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

بیگم نہال منہ اندھیرے ہی جاگ اٹھیں، نماز سے فارغ ہو کر تخت پر ہل ہل کے تلاوت کرنے لگیں۔ مہرو بھی اٹھ گئی تھی اور سیڑھے پر بیٹھی منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔ مسرور مدرسے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ البتہ شمس ابھی تک سو رہے تھے اور ان کی دلہن پاخانے میں تھیں۔ کوٹھے پر جمال بیگم اپنی بیوہ بھاوج پر غصے ہو رہی تھیں؛

"بی انجم! تم نے تو میری زندگی اجیرن کر دی۔ مجھ بدنصیب کو نہ دن چین

ہے نہ رات ......"

اتنے میں چنے والے کی آواز آئی۔ بیگم نہال پڑھتے پڑھتے ٹھہر گئیں اور مڑ کر منہ ہی منہ میں ہُوں ہُوں کرنے لگیں۔ دلچین باورچی خانہ میں میٹھی دیگچی کا پیندا جونے سے مانجھ رہی تھی۔ بیگم نہال کی ہُوں ہُوں سُن کر اٹھی اور بڑبڑاتی ہوئی کہ "مجھ کو موت بھی نہیں آتی" اُن کے پاس آئی۔ بیگم نہال نے ازار بند میں سے ایک پیسہ کھول کے اس کو دیا، اور چنے والے کی آواز کی طرف اشارہ کیا۔

مسرور میلی اچکن اور چیکٹ تر کی ٹوپی اُوڑھے ہوئے کمرے میں سے نکلا اور بستہ بغل میں دبا مدرسہ چل دیا۔ مہرو نماز میں مشغول ہو گئی، اور شمس کی دُلہن پاخانہ سے نکل کر غسلخانہ میں گھس گئیں اور کوئلے سے دانت مانجھنے لگیں۔

مہندی پر گوریّاں چوں چوں کر رہی تھیں اور کھجور کے درخت پر ایک کوّے نے کائیں کائیں کی برابر رٹ لگا رکھی تھی۔

٭ ٭ ٭

میر نہال کے اُڑان کبوتر کوٹھے پر پلے ہوئے تھے۔ انھوں نے جا کر کبوتر کھولے۔ وہ ابھی جال میں سے نکلے ہی تھے کہ جھپی نے میر نہال اُن کی طرف لپکے اور زور سے ہش کُو کی آواز لگائی۔ کبوتر اُڑ گئے۔ اُن کی ٹکڑی میں ہر طرح کے جانور تھے، کاسنی اور لال بند، کھیرے اور چپ، جنگلے اور شیرازی۔ کبوتروں نے چھت کا چکر لیا پھر جھنڈی کا اشارہ دیکھ کر مشرق کی سمت تیر کی طرح چل دیے جہاں خواجہ اشرف علی کے رنگین اُڑ رہے تھے۔ خواجہ صاحب کی ٹکڑی کے قریب پہنچتے ہی انھوں نے ایک کڑکی لی اور ان کے کبوتروں سمیت پلٹ گئے اور فوراً گھر کا رُخ کیا۔ انھیں آتا دیکھ کر میر نہال نے دو انگلیاں منہ میں ڈالیں اور سیٹی بجانے لگے۔ آواز سنتے ہی کبوتروں نے رُخ پھیرا اور دُور نکل گئے۔

خواجہ اشرف علی گلا پھاڑ پھاڑ کے آؤ، آؤ چلاّنے لگے۔ لیکن ان کے کبوتروں کو نہ آنا تھا نہ آئے۔ میر صاحب کی ٹکڑی خواجہ صاحب کے کبوتروں کو لپیٹے دور اور کبوتروں سے کشتی کرتی ہوئی اور جھلڑوں سے لڑ گئی یہاں تک کہ کبوتروں کا ایک غول ہو گیا جو دُور پہنچ کر صرف ایک نقطہ سا دکھائی دینے لگا۔ دوسرے کبوتر باز بھی چلاّ چلاّ کر اپنے کبوتروں کو بُلا رہے تھے۔ بہت سے کٹ کٹ کر اس غول سے الگ ہوتے اور پَر جوڑ کر اپنی اپنی چھتوں پر اُتر جاتے۔ خواجہ صاحب کے بھی دو تین گرد ان کبوتر لوٹ آئے لیکن باقی اس غول میں ملے ہوئے ابھی تک دُور اُڑ رہے تھے۔ میر نہال نے سیٹی بجانی بند کر دی اور بیٹھ کر اپنے کبوتروں کی طرف دیکھنے لگے۔ خواجہ صاحب اپنے کوٹھے کی منڈیر پر سے اُچک اُچک کر کبوتروں کو دیکھ رہے تھے اور چلاّ چلاّ کر انھیں بُلا رہے تھے۔

بہت دیر کے بعد دور مٹیوں پر ایک دھبہ سا دکھائی دیا اور جوں جوں یہ قریب آیا آؤ آؤ کی آوازیں اور بھی زور زور سے آنے لگیں۔ جیسے ہی غول میر نہال کی چھت کے قریب پہنچا خواجہ اشرف علی نے بَولا کر اور بھی زور سے گلا پھاڑنا اور آؤ بیٹا کرنا شروع کر دیا، اور پانی کے بجائے مٹھیاں بھر بھر کے دانا اچھالنے لگے۔ جب غول میر نہال کی چھت پر پہنچا تو انھوں نے ہنڈیا میں سے پانی لے کر اچھالا اور ایک ٹکڑی چھت پر اُتر آئی۔ لیکن دوسروں کے بہت سے کبوتر کٹ کٹ کے نکل گئے۔ چھوٹی سی ٹکڑی تو خواجہ صاحب کے ہاں پہنچی مگر باقی دوسری طرف چلے گئے۔ میر نہال نے کبوتروں پر نگاہ ڈالی۔ کئی ایک نئے کبوتر ڈرتے ڈرتے دانا اٹھا رہے تھے۔ میر نہال ایک فاتحانہ انداز سے مسکرائے اور جال کے اندر دانا پھینکا۔ بھوک کے مارے کبوتر اندر چلے گئے میر نہال نے جھٹ دروازہ بند کر دیا اور نیوں کو پکڑ پکڑ کے برابر کے جالی میں ڈالی

اپنے کبوتروں کو دوبارہ کھول دیا۔

خواجہ اشرف علی ابھی تک کھڑے میر نہال کی طرف دیکھ رہے تھے اور دھوپ میں ان کا تمام سراپا آئینہ کی طرح چمک رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب اُن کا کوئی بھولا بھٹکا کبوتر نظر آتا تو اُسے آؤ آؤ کر کے بلاتے۔ میر نہال اپنے کبوتروں کو چکنا دَ دینے لگے۔ دوسرے کبوتر باز ابھی تک اسی طرح ہاکو ہاکو کر رہے تھے۔ چار سُو کبوتر ہی کبوتر تھے اور ان کے پروں سے آسمان چھپ گیا تھا۔

لیکن جوں جوں گرمی میں اضافہ ہوا اور لُو چلنے لگی آوازیں ایک ایک کر کے آنی بند ہوگئیں اور بس ایک آدھ ہی کبوتر دکھائی دیتا تھا۔ آسمان تانبے کی طرح تپنے لگا اور جیسے گرد و غبار چڑھتا گیا اُس کا رنگ ملگجا ہوتا گیا۔ دوپہر بھر چیلوں کا چلچلانا اور رٹرمیوں کی گھڑگھڑاہٹ دل خراش معلوم ہوتی تھی۔ فضا میں تکلیف دہ ہمواری تھی اور ہر گوشہ میں سورج کی تیز روشنی پھیل گئی اور ہر چیز پر سستی اور نیند کا غلبہ ہونے لگا۔ لوگ کمرے بند کر کر کے لیٹ گئے۔ کتے بھی تمازتِ آفتاب سے بچنے کے لیے ٹھنڈے کونوں کھدروں میں چھپ گئے اور چڑیاں مہندی کی شاخوں میں دُبک کے بیٹھ گئیں۔ صرف کبھی کبھی کوئی جنگلی کبوتر دالان کے پردوں یا کارنس سے اُڑتا اور بیٹھ کے غوں غوں کرنے لگتا جس سے کوفت اور یکسانیت کا احساس اور بھی بڑھ جاتا۔

سورج ڈھلنے پر بھی گرمی میں کوئی کمی نہ ہوئی اور روشنی اسی طرح آنکھوں میں چبھتی رہی۔ دراز وں میں اور گلی کوچوں میں ہوا شائیں شائیں چل رہی تھی اور ٹین والوں اور ملائی کی برف اور سودا بیچنے والوں کی آوازیں بے کیف معلوم ہوتی تھیں لیکن جب سورج اور بھی نیچا ہو کر زمین سے ملنے لگا تو لوگ ٹھنڈے ٹھکانوں سے باہر نکل آئے اور کام کاج میں مشغول ہو گئے۔

۴

تیسرے پہر اصغر گھر سے نکلا۔ گرمی ابھی تک کافی تھی اور لو کے جھکڑ بدستور چل رہے تھے۔ جب وہ محلّے میں پہنچا تو دوکان دار اپنی اپنی دوکانوں کے سامنے چھڑکاؤ کر رہے تھے۔ سودے والے طرح طرح کی چیزیں بیچ رہے تھے، خربوزے اور تربوز، کھیرے اور ککڑیاں، شہتوت اور فالسے، اور فضا اُن کی آوازوں سے گونج رہی تھی. کالے کالے لگا دیے ہیں شربت کو۔

اصغر پھلوں کے چھلکوں اور چھڑکاؤ کے پانی سے بچتا بچاتا جا رہا تھا۔ ایک گلی کے نکڑ پر کچھ لفنگے ایک پاگل عورت کو گھیرے ہوئے تھے وہ ننگی تھی اور اس کی بجلجی چھاتیاں تھنوں کی طرح لٹکی ہوئی تھیں جو چلنے میں جھکولے کھاتیں۔ اس کا چھوٹا سا گھٹا گھٹا ہوا سر اُس کے توانا جسم پر اخروٹ کی طرح رکھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ جب لڑکے اسے گالیاں دیتے یا پتھر مارتے تو وہ لاچاری سے ایں ایں کر کے چلاتی اور اس کے منہ سے رال بہنے لگتی۔ ایک سیانا لڑکا اُسے چھیڑ رہا تھا:

"اری بتا تو رات کہاں رہی؟"

پگلی ایں ایں کر کے تھر کنے لگی اور اصغر کو آتا دیکھ اُس سے التجا کرنے لگی کہ میرا پیچھا چھڑاؤ۔ لیکن اصغر کتراتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہیں ایک چھوٹی سی اندھیری سی کوٹھڑی میں خلیفہ کی دوکان تھی اور یہ تماشا دیکھ کر اس نے قہقہہ لگایا۔ وہ اوباش قسم کا آدمی تھا اس کی سیاہ گھونگر دار ڈاڑھی اور تیل میں بھیگی ہوئی لٹیں اور کاجل بھری آنکھیں اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ جونہی اصغر قریب آیا تو خلیفہ نے اسے بوالہوسی سے دیکھا مگر اسی وقت مرزا دودھ والے نے لونڈوں کو للکارا:

"ابے حرامزدو! بیچاری عورت کو کیوں دِق کر رہے ہو؟ شرم نہیں آتی تم کو۔ جاؤ گھروں کو دفعان ہو یہاں سے۔"

اصغر سڑک پر لوگوں کے ہجوم میں مل گیا۔

سامنے ایک ضعیف العمر شخص خالی قمیص پیجامہ پہنے تشری ٹوپی اوڑھے جا رہا تھا۔ اس کی غمزدہ آنکھوں میں ایک عجیب اضطرار جھلک رہا تھا، جیسے وہ کسی کھوئی ہوئی چیز یا بچھڑے ہوئے حبیب کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ اسے دیکھ کر اصغر کو بھوپال کے وہ دن یاد آ گئے جب اُسے نہ کسی سے محبت تھی اور نہ وہ عشق سے واقف تھا۔ مگر وہ زمانہ خواب ہو چکا تھا جب دنیا اس کے لطف و عنایت کی محتاج تھی اور وہ پھیلے ہوئے دامنوں کو بھرنے والا تھا۔ آج جب کہ وہ خود ناداروں کی طرح تہی دامن تھا اُسے معلوم ہوا کہ محبوب بننا کس قدر آسان ہے۔ جب اس کو یہ خبر نہ تھی کہ عشق کی راہ میں ایسے سخت مقام بھی آتے ہیں کہ مایوسی اور ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ نہ معلوم اس نے کتنوں کے دل توڑے ہوں گے۔ مگر اس نے دیدہ و دانستہ کسی کی حسرتوں کو کب مٹایا تھا؟ اگر خودکسی نے اس پر جان دی تو یہ اس کا اپنا قصور تھا۔ تاہم اُسے اپنے ان چاہنے والوں میں سے ایک کا خیال

آ گیا جس کی آنکھوں میں وہی ادا سی رہا کرتی تھی جو آج اس ضعیف العمر شخص کی آنکھوں میں دکھائی دے رہی تھی۔ مگر اصغر نے کبھی اس کی حالتِ زار پر رحم نہ کھایا تھا، اور اس کی چھوٹی سے چھوٹی خواہش کو بھی بے التفاتی سے ٹھکرا دیا تھا۔ عاجز ہو کر اصغر کی بے مہری پر اُس نے کہا تھا:

"اللہ کرے آپ بھی عاشق ہوں کسی پر"

یہ شاید اسی دل جلے کی بد دعا کا اثر تھا جو آج وہ اپنی حالت سے بے گانہ تھا۔

وہ نہ جانے کب تک پُرانی یادوں میں گم رہتا۔ مگر بندو کا گھر آ گیا تھا۔ سامنے وہ قدیم اور شاندار پھاٹک تھا، جس کے دونوں طرف پتھر کی نشستیں بنی ہوئی تھیں جن پر بیٹھ کر بندو اور اصغر گپ شپ کیا کرتے تھے، اور اسی چار دیواری میں وہ مست ناز تھی جس کی خوشبو در و دیوار میں بس چکی تھی، جس کے دیدار کا طالب بن کر وہ بھکاریوں کی طرح دروازہ پر کھڑا تھا۔ اُس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ہچکچاتے ہوئے اس نے کُنڈی کھٹکھٹائی۔

اندر سے ایک نازک آواز آئی:

"چنبیلی ذرا دیکھ تو دروازے پر کون دستک دے رہا ہے؟"

کیا یہ آواز بلقیس کی تھی؟ اور اس خیال سے اس کا دل اور زور زور سے دھڑکنے لگا۔ گلی میں ایک بچہ لکڑی کا گھوڑا بنائے خوش خوش بھاگتا چلا گیا اور گلی کے پرلے سرے سے ایک آدمی کی جادو بھری آواز سنائی دی:

"آنکھ کا کاجل صاف چرالیں چوریاں اس بلا کے ہیں"

لیکن پھیری لگانے والا دور چلا گیا اور آواز کبوتر بازوں کی سیٹیوں اور ہا ہو میں کھو گئی۔ چنبیلی نے کھڑکی میں سے منہ نکالا اور اصغر کو دیکھ کر مسکرائی۔ اصغر نے پوچھا:

"بندو ہیں ؟"

"بندو میاں تو نہیں ہیں اور اشفاق میاں بھی ابھی ابھی باہر گئے ہیں۔ لیکن اندر آ بیٹھئے نا۔ آپ کی بھابی جان ہیں۔"

لمحہ بھر وہ کشمکش و پیچ میں رہا، پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اندر چلا گیا۔ صحن کے بیچوں بیچ ایک حوض تھا اور اس کے ارد گرد موتیا اور گل شبّو لگی ہوئی تھی۔ چھڑکاؤ ابھی ابھی ہوا تھا اور بازار کے مقابلے میں اندر ٹھنڈک تھی۔ اشفاق کی دُلہن پلنگ پر بیٹھی ہوئی موتیا کا ہار پرو رہی تھیں۔ کانوں میں جھومتی ہوئی بالیوں نے ان کے بالوں کی سیاہی کو اور بھی سیاہ کر دیا تھا۔ اور ان کی کالی کالی آنکھیں پھولوں کے سفید ہالے میں چمک اٹھی تھیں۔ ان کا رنگ گندمی تھا اور حنا نے انگلیوں کی زینت اور بڑھا دی تھی۔

اصغر قریب جا کے بیٹھ گیا اور اشفاق کی دُلہن نے چنبیلی سے شربت منگوایا۔ کمرے میں سے کسی نے پوچھا:

"اے میاں تمہارے ہاں سب خیریت ہے؟ مہر و کی تاریخ ٹھہر گئی یا نہیں؟"

"وہ گھڑی کب آئے گی جب تمہاری شادی کی خبر سنیں گے؟" اس کی بھاوج بولیں۔

یہ سُن کر ایسا معلوم ہوا کہ اصغر کے دل کا چور پکڑ گیا اور اس کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ بات ٹالنے کے لیے وہ کڑھے ہوئے تکیہ کے غلاف کی تعریف کرنے لگا۔ دالان میں کسی چیز کے گرنے کا چھنا کا ہوا۔ چڑیوں کا ایک جوڑا حوض کی منڈیر پر آ بیٹھا اور چوں چوں کرنے لگا اور ایک اڑتے ہوئے کبوتر کی بیٹ اصغر کے قریب ہی آ کر گری۔ اشفاق کی دلہن نے کہا:

"معلوم ہوتا ہے تمہیں پسند آیا۔ بلقیس کے ہاتھ کا کڑھا ہوا ہے۔"
اس نام کے سنتے ہی ایک بجلی سی کوند گئی اور دید کی تمنّا نے دلِ مہجور کو اور بیتاب کر دیا۔ پیروں کی آہٹ سُن کر اس نے کن انکھیوں سے دیکھا لیکن چنبیلی شربت لے کر آ رہی تھی۔ شربت سے بھی اس کا اضطراب کم نہ ہوا، اجازت لے کر وہ باہر نکل آیا۔

٭ ٭ ٭

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور اس کی آنکھوں میں ریت گھس گئی۔ ایک بگولا اپنے ساتھ کاغذ کے پُرزے کبوتروں کے پر اور گرد و غبار لیے چکر کھاتا ہوا چھتوں کے اوپر بلند ہوا اور زور ختم ہونے پر کوڑا کرکٹ ایک ایک کر کے زمین پر گرنے لگے۔ قریب ہی ایک بوسیدہ مکان سے دو عورتوں کی لڑنے کی آوازیں آئیں؛

"مجھ جنم جلی کو رزق ہے نا موت! میں تو اس زندگی سے تنگ آ گئی"؛
اصغر نے باری کے مکان کا رُخ کیا جو اسی محلہ میں رہتا تھا۔ اس کے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے اور وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ زینہ میں کبوتروں کے پر اور خاک پڑی ہوئی تھی۔ مکڑیوں نے جگہ جگہ جالے تن رکھے تھے جن میں مکھیوں اور چیونٹوں کے ڈھانچے اٹکے ہوئے تھے۔ اصغر چھت پر پہنچا۔ باری اس وقت پتنگ اُڑا رہا تھا اور اِدھر اُدھر پرانی پتنگیں اُلجھی ہوئی ڈور اور ٹوٹے ٹھڈے پھیلے ہوئے تھے۔ باری نوعمر تھا۔ اس کا رنگ زردی مائل اور سر کے بال سَن کی طرح بھورے تھے جو بالکل نقلی معلوم ہوتے تھے۔ پھول دار چکن کے کرتے میں پاندار زنجیروں والے بٹن تھے اور سیدھے بازو پر سیاہ غلاف میں تعویذ بندھا ہوا تھا۔ اصغر کی آواز سُن کر پتنگ سے نگاہ ہٹائے بغیر کہنے لگا:
"ارے یار بہت دنوں بعد دیدار ہوئے کہاں تھے؟"

اصغر نے جواب دیا:

"زندگی دوبھر ہوئی مرنے کا ساماں ہوگیا
عرصۂ ہستی سمٹ کر تنگ زنداں ہوگیا"

باری نے چرخی پر ڈور لپیٹتے ہوئے کہا:

"اماں کیا شیریں فرہاد کی داستان سن کے آئے ہو! یاروں کے سامنے ایسے شعر نہ پڑھا کرو۔ آخر ایسی کیا بپتا پڑی ہے؟"

آسمان پر پتنگوں کا اژدھام تھا۔ کالی، سفید، نیلی، پیلی، چپ، چرڑے، گنڈیریل، بھیڑیے، چاند تارا، نعلدار، منہ دار، گلاس دار، آنکھوں دار، شکر پارے، چوریاں، مانگ دار، سبھی طرح کی پتنگیں تھیں اور ان میں دم چلیں بھی تھیں اور دھیر چلیں بھی، پونے بھی اور ادھے بھی، نیچی پتنگیں بھی تھیں اور آسمان میں تارا بنی ہوئی بھی۔ کچھ ناچ رہی تھیں، کچھ ٹھمکی لگا رہی تھیں اور کچھ تنی کھڑی تھیں۔ کہیں کہیں پیچ ہو رہے تھے، کہیں پیچوں کی تیاریاں۔

باری ایک گنڈیریل اڑا رہا تھا۔ پیچ ہوتے ہی اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں بھینچ کر زور زور سے ڈور کھینچنی شروع کی۔ پھر پتنگ کو ہوا کے دھارے پر لانے کے لیے ہلکے ہلکے ڈھیل دینے لگا۔ اس کے مخالف نے زور سے اچیم کی اور باری کی گڈی کٹ گئی۔ آس پاس کی پتنگیں اسے لپٹانے کی کوشش کرنے لگیں۔ دور سے شور ہوا، "وہ کاٹا" اور برابر کے کوٹھے پر ایک لڑکا گانے لگا:

"دو مانجھوں میں کاٹی ٹکل تیری لمڈے جان"

باری ڈور کھینچنے لگا اور بولا:

"بُرے کٹے یار۔ اُڑاؤ گے؟"

یہ کہہ کر وہ ایک کونے میں گیا جہاں گڈیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا، لیکن سب ہی کہیں نہ کہیں سے ٹکلی ہوئی تھیں۔ دُور سے آوازیں اور زور سے آنے لگیں:

"پیری ہے بے لمڈے کی۔ پیری ہے۔"

اصغر نے جواب دیا:

"کچھ جی نہیں چاہ رہا۔" اور چھجے پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔

شام ہو رہی تھی اور ڈوبتے ہوئے سورج کی سُرخی مغرب میں پھیل چکی تھی۔ ریلوں کا دھواں بل کھاتا ہوا اوپر اٹھ رہا تھا جس سے سرخی کے کنارے سیاہ ہو گئے تھے۔ کبوتروں کے غول کھیتوں سے اُڑتے اور آسمان کی لامتناہی وسعتوں میں کھو جاتے۔ دُور دُور جہاں نظر جاتی تھی مکان ہی مکان دکھائی دیتے تھے۔ کہیں کہیں نئی عمارتیں بن رہی تھیں اور ان کی پاڑیں اور مچان جُھٹ پٹے میں ہیولوں کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ شمال میں نیچی نیچی پہاڑیوں کا سلسلہ ایک سیاہ لکیر کی طرح نظر آتا تھا۔ دوسری طرف گھنٹہ گھر اپنا بدنما سر اٹھائے کھڑا تھا اور اس سے پرے جامع مسجد کے سفید گنبد شام کی دُھندلی روشنی میں گُجلا کر سُرمئی ہو گئے تھے۔

اتنے میں ایک مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے ٹھہرے ہوئے پانی میں پتھر پھینک کر تھوڑی دیر کو ہل چل پیدا کر دی ہے۔ پھر دوسری مسجدوں سے اذانوں کی آوازیں گونجنے لگیں اور ان کے ساتھ ہی ساتھ نثار احمد کی آواز ان سب سے بلند ہوتی ہوئی قریب ہی اصغر کے محلے سے آئی اور سکون و راحت کا نغمہ سناتی ہوئی اور قلوبِ مطمئن کو بے مقصدیٔ حیات اور بے ثباتیٔ دنیا کا یقین دلاتی ہر طرف پھیل گئی۔ اصغر چپ چاپ اذان سنتا رہا یہاں تک کہ آواز ڈوب گئی اور فضا پر خاموشی چھا گئی۔ دن کی روشنی

ختم ہو چکی تھی اور ہوا کی سائیں سائیں اور بھی تیز معلوم ہونے لگی۔

نماز کے بعد اصغر چارپائی پر لیٹ گیا۔ افق پر شام کا ستارا پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور ایک دلکش سبز روشنی ہر طرف پھیل گئی تھی۔ باری بھی پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اصغر نے پوچھا:

"کیا اس دنیا میں خوشیاں ناپید ہیں اور انسان کے لیے محض دکھ اور درد ہیں جن کا کوئی علاج نہیں؟"

باری نے کہا:

"یار رجب سے آئے ہو مرثیہ خوانی کر رہے ہو۔ اماں کچھ کہو گے بھی، یا نئی نویلی کی طرح پٹسوے ہی بہاتے رہو گے؟ آخر کون سا قہر نازل ہو گیا؟"

اصغر نے آہ بھری اور کہنے لگا:

"باری! کیا کہوں ایک عالم تہہ و بالا ہو گیا۔ مگر تم کو اس کی کیا خبر! یہ تقدیر کی چالیں ہیں اور ہم اس کے قیدی درد و تکلیف سے تڑپتے ہیں۔ مگر اس کی بندش سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ جوں جوں فرار ہونے کے لیے زورِ بازو لگاتے ہیں اس کی گرفت اور سخت ہو جاتی ہے۔ ہم زخمی اور مجبور ہیں اور حقیقتیں المناک..."

اصغر کے الفاظ میں کچھ ایسی رقت تھی کہ باری اس کا دردِ دل تاڑ گیا اور شوخی سے اس کے سینے پر ہاتھ مار کے کہنے لگا:

"تو کہو میری جان! ہو گئے تم بھی کسی زلف کے اسیر۔ صاحب کو بڑا غرّہ تھا دل نہ دینے پر۔ ابھی تو آہیں بھر رہے ہو پھر کپڑے پھاڑو گے۔ میں تو ڈر گیا تھا کہ معلوم نہیں کیا حشر ٹوٹا۔ یار مجھے بھی تو بتاؤ کس کے تیرِ نگاہ نے تمہیں گھائل کر دیا؟"

اصغر نے جواب میں یہ شعر پڑھا:

"شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل   کجا دانند حالِ ما سبکساران ساحل ہا

"مبارک ہو، تو تم عاشقِ نو گرفتہ فرہادِ ثانی ہو گئے۔ لو بھی خوب یاد آیا۔ پرسوں میں ذرا چاوڑی تک چلا گیا تھا۔ وہ مشتری بائی تم کو بہت یاد کر رہی تھی۔ اُس نے سلام کہا ہے تمہیں۔"

"جہنّم میں جائے مشتری، تمہاری رگ پھڑک رہی ہے اور اپنی جان پر بنی ہوئی ہے۔"

"ارے بھئی تو یار خاں تو جان و دل سے حاضر ہیں، سینہ کی جگہ خون گرائیں گے۔ یہ غلام عالی جاہ کے ہر حکم کا منتظر ہے، بتاؤ تو وہ بُتِ طنّاز کون ہے؟"

اصغر کچھ تامل کے بعد بولا:

"اس کے سراپا کا کیا کہوں۔ وہ حسین ہے بے حد حسین، سرو قد، غنچہ دہن، سیمیں بدن، گلاب سے زیادہ نازک، اُس کے معطّر گیسو، شبِ ہجر کی طرح دراز اور سیاہ ہیں۔ رخساروں کی تابش وصل کی گھڑیوں سے زیادہ تابدار ہے۔ دانت گوہرِ آب دار کی لڑی، لبِ لعلیں خونِ دلِ عاشق سے زیادہ سُرخ اور آنکھیں تیر و تفنگ سے آراستہ ہیں۔ ان کی وہ مستانہ گردشیں، اگر پتلیاں سمِ قاتل تھیں تو سفیدی میں تریاق، جو چارہ گر بھی ہیں، اور ستم گر بھی، ابروئے خم دار کی کمان اس پر غضب، پلکوں کے تیرِ نیم کش جلوۂ دید کے مشتاقوں کو بسمل بنا دیتے ہیں۔ کون ہے جو اس کافر کے حُسن کو بتا سکے۔"

"استاد! وہ عورت ہے یا کوئی غزل؟" باری نے بمشکل ہنسی ضبط کر کے کہا۔

اصغر چڑ گیا اور بولا:

"پھر تم ہنسی اڑانے لگے؟" اور یہ مصرع دوہرایا،

"تجھے، اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں۔"

"خیر صاحب! ہم نے مان لیا وہ پری زاد ہیں، حور سہی۔ مگر نام کیا ہے اس بلا کا۔

اس نیلم پری کا حاصل کرنا آخر کون سا جان جوکھوں کا کام ہے، کیا کالے دیو سے پنجے بازی کراؤ گے؟"

"باری! مذاق چھوڑو، وہ نہ حور ہے، نہ پری، کاش ایسا ہوتا تو اُسے حاصل کرنا کتنا آسان تھا۔ قیامت تو یہی ہے کہ اُس تک رسائی مشکل ہے۔ مقدر ہی اپنا دشمن ہو گیا ہے۔"

باری اب زِچ ہو چکا تھا۔ کہنے لگا:

"بتاتے ہو تو بتاؤ، ورنہ بکواس بند کرو۔"

اصغر نے باری کے کان میں چپکے سے کہا:

"بندو کی بہن بلقیس۔"

"واہ یار! میں تو سمجھا تھا کہ ایڈورڈ کی لونڈیا ہے۔ اتنی سی بات تھی اور افسانہ کر دیا۔ اماں یہ تو چٹکی بجاتے یوں ہو جائے گا۔"

"نہیں باری نہیں، یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ سوچو تو سہی مجھ میں کونسی شاخِ زعفران لگی ہوئی ہے جو کوئی اپنی بیٹی مجھے تھما دے گا۔"

"صاحب آپ نے عشق لڑانا تو شروع کر دیا مگر رہے بچّوں کی طرح بیوقوف اور عورتوں کی طرح بے عقل، ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ اپنا تو یہی اصول ہے پیارے اور مجھے معلوم ہے مرزا جی والے تم پر لٹو ہیں۔ اجی بھلا لٹّو کیوں نہ ہوں، تم جیسا خاندانی حسین جوان کہاں ملے گا انھیں؟ میاں آنکھ بند کر کے ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور سر پر بٹھائیں گے۔ ہے کچھ شرط؟ بھلا تمہاری جو خاطر داریاں کی جاتی ہیں، بلاوجہ تو نہیں ہیں۔"

باری کے یہ کہنے سے اصغر کو بھی چھوٹی چھوٹی سی باتیں یاد آنے لگیں۔ یہ حقیقت تھی کہ بندو کے گھر میں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی اور اس کی ماں اصغر پر

خاص طور پر مہربان تھیں، اور خاطر و مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتیں۔ اس کی تعریفیں کرتے ان کا منہ خشک ہوتا تھا۔ انھوں نے یہ کہہ کر اس سے پردہ کرنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ میاں تم سے اب کیا پردہ؟ میرے لیے جیسے بندو ویسے تم۔ اور پھر وہ بلقیس کو انگریزی پڑھانے پر مصر ہونے لگیں مگر اشفاق نے اس بات کی مخالفت کی۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ دن اس کو یاد آگیا جب پہلی بار اس کا بلقیس سے آمنا سامنا ہو گیا تھا۔ اُس دن وہ بندو کے ہاں انگنائی میں بیٹھا ہوا تھا۔ بلقیس کو غالباً اس کے آنے کی بالکل خبر نہ تھی اور وہ بے دھڑک صحن میں آ گئی اور جب اس کے عین سامنے پہنچی تو یکبارگی ان کی نگاہیں مل گئیں۔ اصغر کو دیکھتے ہی وہ بھونچکی ہو کر اُلٹے پاؤں بھاگ کر کمرے میں چھپ گئی۔ اصغر اس کے رُعبِ حُسن سے حیرت زدہ ہو کر بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔

کبھی کبھی ایک چھوٹی سی جھلک مدتوں کی ملاقاتوں سے زیادہ گہری ہو کر قلب و نظر میں سما جاتی ہے اور اصغر کے لیے یہ لمحہ بھر کا جلوہ ایک عالم بن گیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ وقتی جذبہ ہے اور وہ اسے بھول جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا، اور جہاں بھی وہ جاتا بلقیس کا خیال سایہ کی طرح اس کے ساتھ رہتا۔ دن کے اُجالے میں اُس کے حُسن کی رعنائیاں ایک پُر فریب راز کی طرح اس کے دل میں چھپی رہتیں اور رات کی تنہائی میں جب وہ سونے لیٹتا تو ماہ و نجوم عشق و محبت کی داستانیں کہتے اور نشاط و شادمانی کے نغمے سُناتے، اور صبح جب وہ اُٹھتا تو وہی صورت نگاہوں میں بسی رہتی۔

لیکن وقت گزرتا گیا اور بلقیس سے ملنا ایک تمنا بن کے رہ گئی۔ محرومی بڑھتے بڑھتے آزارِ جاں ہو گئی اور اصغر کے دن شوریدہ سری اور راتیں خلش میں کٹتیں۔ آرام و سکون اُڑ گئے۔ نہ دوبارہ دید ہی میسّر آئی نہ ملاقات کا امکان ہوا۔ وصال

کی اُمید صرف شادی ہی پر منحصر تھی لیکن اُسے معلوم تھا کہ یہ بات بھی ناممکنات میں سے ہے۔ دونوں کے خاندانوں میں ایک خلیج حائل تھی۔ چونکہ مرزا شہا زبیگ نہ صرف مغل تھے بلکہ ان کا حسب نسب بھی درست نہ تھا بھلا میر نہال اِس رشتے پر کیوں کر رضامند ہو سکتے تھے۔ آخر وہ اسی خاندان کے فرد تھے جو عربستان سے آیا تھا اور جس کو اپنے اصل نسل سیّد ہونے پر ناز اور عالی نسبی پر ہمیشہ فخر رہا، اور اس تناور درخت میں لچک پیدا کرنا پتھر میں جونک لگانے سے زیادہ مشکل تھا۔

اصغر اس منزل پر کھڑا تھا جہاں ایک طرف محبّت و اشتیاق کا بحرِ بے کنار اور دوسری طرف وہ قدیم قلعہ جس کی فصیلیں خاندانی عزّت و ناموس پر کھڑی تھیں جس طرح ان فصیلوں کو گرانا اُس کی قوت سے باہر تھا اُسی طرح اس کی بیماریٔ عشق لاعلاج تھی۔ باری اس خاندانی اونچ نیچ کو سمجھتا تھا لیکن وہ اصغر کی طرح آسانی سے ہار ماننے والوں میں سے نہ تھا۔ چنانچہ اصغر کو پریشان دیکھ کر اس نے کہا:

"اگر کچھ پیسے خرچ کرو تو میں تمہارے ابّا کو قابو میں کرنے کے لیے سُنہری مسجد کے پیر جی سے تعویذ اور فلیتے لاکر دوں۔"

اصغر نے کہا:

"اس وقت تو میرے پاس نہیں ہیں۔"

"ارے یار! کوئی ہزاروں لاکھوں تھوڑی چاہییں، بس کوئی بیس ایک روپے کافی ہوں گے۔ آخر تعویذ کا صدقہ دینے کو فقیروں کو کھلانا پڑے گا، پھر پیر جی کو بھی نذر دینی لازمی ہے۔"

اصغر تعویذ گنڈوں کا زیادہ قائل نہ تھا لیکن باری کے اصرار پر اُس نے جیب سے روپے نکال کر باری کے حوالے کر دیے۔ باری نے کہا:

"کل ہی جاؤں گا۔ جادو کر دیں گے۔ گھبراؤ مت......"

عشار کا وقت ہو چکا تھا اور اصغر گھر جانے کے لیے اٹھ گیا۔ گلیاں تنگ و تاریک تھیں صرف کہیں کہیں نکڑوں پر تیل کے لیمپ ٹمٹما رہے تھے۔ دور سے شہر کا شور ہوا کے ساتھ سنائی دیتا تھا، ایک پھول والا اصغر کے قریب سے آواز لگاتا ہوا گزرا۔ فضا تھوڑی دیر کو مہکی اور پھر وہی موریوں کی بدبو اور سڑاند کے بھپکے ناک میں گھسنے لگے۔ پاس ہی ایک ٹاٹ کے پردے کو جنبش ہوئی، اور کسی کا دستِ حنائی باہر آیا اور کھڑے ہوئے فقیر کے کاسہ میں روٹی ڈال دی اور فقیر دعائیں دینے لگا:

"خدا تیرے دل کی مرادیں پوری کرے بیٹی، اپنے خزانۂ غیب سے تجھ کو دے۔۔۔"

اصغر کشمکشِ خیال میں گھر پہنچا۔ اس کے دل کی خلش تو مٹی نہ تھی، مگر باری سے باتوں کے بعد اتنا ضرور ہوا تھا کہ اُس نے ایک بات کا فیصلہ کر لیا کہ حالات سے ہرگز مطیع نہ ہوگا۔ لیکن یہ مہم بغیر ہاتھ پیر مارے سر نہ ہوگی۔ اس کے لیے اوروں کی مدد درکار تھی۔

۵

وحیدہ بیگم اصغر کی سب سے بڑی بہن تھیں۔ کم سنی ہی میں ان کی شادی بھوپال میں سید وحید الحق سے ہوگئی تھی جو بالکل غیر تھے۔ ابھی دوسرا بچہ گود ہی میں تھا کہ عین عالمِ شباب میں ہاتھوں کی چوڑیاں ٹھنڈی ہو گئیں۔ حالانکہ اسلام نے نکاح ثانی کی اجازت دی ہے مگر انھوں نے اپنے اوپر رنگ و ریشم حرام کر لیا۔ اس کی وجہ غالباً یہی تھی کہ ہندوؤں کے ہاں بیوہ کی شادی مذہباً منع ہے اور ہندوستان میں رہنے بسنے والے مسلمانوں پر بھی اُن کے رسم و رواج کا اثر ہونا لازمی تھا۔

وہ فطرتاً نیک و پارسا تھیں۔ طبیعت میں سادگی اور قناعت ہمیشہ سے تھی۔ ان کا ایمان مضبوط اور انھیں خدا پر کچھ ایسا کامل یقین تھا کہ اس کے بھروسے ہر مشکل کو جھیل جاتی تھیں۔۔ آخر تو میر نہال کی بیٹی تھیں اور باپ کی طرح خوددار۔ سسرال والوں میں اپنا بھرم بھاری رکھنے کو میکے میں بھی آکر نہ بیٹھیں۔ کچھ تو ساس سسر کی خوشنودی منظور تھی اور کچھ لوگوں کی بہتان تراشی اور چہ میگوئیوں سے بھی ڈرتی تھیں

اور دنیا کو نام دھرنے کا موقع نہ دینا چاہتی تھیں۔ اگرچہ اُن کو اپنے عزیز و اقربا کی کمی اکثر محسوس ہوتی اور گھر کی یاد بھی ستاتی تھی لیکن جب زیادہ جی بھر آتا تو کونے کھدرے میں منہ چھپا کر رو لیا کرتیں اور اس طرح گھر جانے کی خواہش وقتی طور پر دب جاتی۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا اب ان کی زندگی کا سہارا تھے۔ وہ ان کو چھپتر چھاؤں رکھتیں اور ان کی بہبودی اور آرام و آسایش کے سوا انھیں کوئی اور لگن نہ تھی مشرقی مائیں اولاد پر اپنی دنیا تج دیتی ہیں اور اپنے ارمان و تمنائیں بسر اکر بھری جوانی صبر و شکر سے کاٹ دیتی ہیں۔

اصغر چونکہ بچپن میں ان سے بہت ہلا ہوا تھا اس لیے اپنی شادی کے بعد بھی وہ اس کو بھوپال لیتی گئی تھیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جہاں انھوں نے اصغر کو ایک ماں کی طرح پالا پوسا تھا وہاں اصغر کو بھی بیٹیوں کی طرح بہن سے محبت تھی۔ یہ قاعدہ ہے کہ مصیبت میں انسان اسی سے مدد کا طالب ہوتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہجوم نا امیدی میں وحیدہ بیگم ہی اصغر کو ہمدرد نظر آئیں اور اس نے بھوپال خط لکھ دیا کہ جس طرح ہو سکے آپ دلی آ جائیے، میں بہت پریشان ہوں۔ وحیدہ بیگم ایک تو دور بھیر اصغر کی پریشانی کا پڑھ کر سراسیمہ ہو گئیں اور جس قدر جلدی ممکن تھا اپنی روانگی کی تیاری شروع کر دی۔ ان کا بس چلتا تو پر لگا کر اڑ جاتیں اور بھائی کی پریشانیوں کا خاتمہ کر دیتیں......

میر نہال گلی کے سرے پر پہنچ چکے تھے۔ جب بڈھے ڈاک ہرکارے نے انھیں بھوپال کا خط دیا جس میں بیٹی نے اپنے آنے کی اطلاع دی تھی تو اُن کے ہونٹ پدرانہ خوشی سے کپکپانے لگے اور وہ اُلٹے پیروں گھر واپس لوٹ آئے۔ عفورا ڈیوڑھی میں کواڑ سے پیٹھ لگائے بڑے اطمینان سے حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اپنے توتے کو خوب عطر میں چپڑ کر جس سے اُس کی کنٹھی کے سُرخ اور زرد پر بھی چمک گئے

مٹے حقے کی نَے پر ہتھار کھا تھا۔ اس کی عمر کوئی تیس برس کی ہو گی۔ گل مچھے تو صاف تھے مگر سیاہ مخروطی ڈاڑھی بڑے شوق سے رکھ چھوڑی تھی۔ آنکھوں میں گہرا گہرا کاجل گھٹا ہوا تھا جو بہہ کر گلوں تک آگیا تھا۔ گلے میں تعویذ بھی پڑا ہوا تھا۔ گھر کے کام دھندے سے فرصت پا کر اس کا یہی معمول تھا کہ اپنے ساتھ توتے کو بھی بنا سنوار کر حقے پر بٹھا لیتا اور ایک کش کھینچنے کے بعد میاں مٹھو کو نئے لفظ سکھاتا۔ ابھی دو چار ہی گھونٹ لیے تھے کہ میر نہال کو واپس آتا دیکھ کر جلدی سے اپنا حقہ کواڑ کی اوٹ میں کر دیا اور کھڑے ہو کر پوچھنے لگا :

"حضور! کیا چاہیے ؟ کچھ رہ گیا ؟"

"نہیں نہیں۔ وحیدہ بی بھوپال سے آ رہی ہیں۔ ابھی ان کا خط آیا ہے۔"

اور یہ کہتے ہوئے وہ اندر چلے گئے اور خط بیوی کو دے دیا۔

بیگم نہال خوشی سے بیٹی کو پکارنے لگیں :

" ارے مہرو، بہت یاد کر رہی تھیں نا، لو تمہاری آپا آ رہی ہیں۔"

ان کے بیٹے تو سب سرکاری ملازم تھے۔ شہر در شہر تبادلے ہوتے رہتے۔ صرف عید بقر عید کو آ جاتے ورنہ اپنے بیوی بچوں کو والدین کے پاس دلّی بھیج دیا کرتے۔ چونکہ وحیدہ بیگم بچپن سے ہی الگ ہو گئی تھیں اور بھوپال دلّی سے خاصا دُور تھا، کبھی سال چھ مہینے میں مہمانوں کی طرح آتیں اور چلی جاتیں۔ یہی وجہ تھی کہ ماں باپ دونوں کو ان سے خاص محبت تھی۔ بیٹی کے آنے کا معلوم ہو کر بیگم نہال پر جیسے سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا، اور اصغر کی تو دلی مُراد بر آئی اور وہ بہن کے انتظار میں گھڑیاں گن گن کر کاٹنے لگا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

گھر کے بیل و نہار وہی تھے۔ میر نہال حسبِ معمول صبح کبوتر بازی کرتے

اپنی کاروباری مصروفیت کی وجہ سے جانے کی جلدی بھی ہوتی۔ لہٰذا اجوتے اچھال اچھال کر اور ٹین کی چادریں بجا بجا کر کبوتروں کو بھڑکاتے۔ یوں تو ان کی جائداد خاصی تھی۔ دو کانیں اور کٹڑے تھے۔ دلّی کے قریب کاشت کے بیگھے بھی تھے اور ان سب کی آمدنی سفید پوشی کے لیے کافی تھی۔ مگر میر نہال کا خاندان بھرا پُرا تھا۔ پوری نو اولادیں تھیں۔ پھر جیتی جانوں کے ساتھ دنیا کے سینکڑوں بکھیڑے لگے رہتے ہیں۔ لشتم پشتم کہاں تک گزر ہوتی۔ زمانہ پہلے کی طرح ارزاں بھی نہ رہا تھا۔ بندھی بندھی آمدنی میں کیونکر سارے اخراجات پورے ہوتے۔ مجبور ہو کر میر نہال نے ایک بیل والے کے ہاں تجارت میں روپیہ لگا دیا تھا۔ اپنی زندگی کو انھوں نے کاروباری ضرورتوں اور چند دیرینہ شوقوں سے اِس طرح ہم آہنگ کر لیا تھا کہ وہ ایک مقررہ رفتار سے گذر رہی تھی، جس میں آسودگی اور ہمواری بھی تھی۔

وہ اگلے وقتوں کے وضع دار آدمی تھے۔ کہتے ہیں کہ مرنے پر بھی ہاتھی سوا لاکھ کا۔ پہلے سے وہ ٹھاٹھ باٹھ تو نہ رہے تھے اور سابقہ عیش و آسائش بھی معدوم ہو چکے تھے مگر وہ زمانہ جس میں انھوں نے آنکھ کھولی اور وہ تہذیب جس کی گود میں وہ پروان چڑھے تھے کچھ ایسے گہرے اور اَن مِٹ نقوش ان کے دل و دماغ پر مرتسم کر گئے تھے کہ ناسازگاریٔ حالات اور وقت کا تیز دھارا بھی ان کے طرزِ حیات کا رُخ نہ موڑ سکا۔ مزاج میں ریاست تھی اور شوق بھی رئیسانہ۔ جہاں کبوتربازی کے چسکے نے پیچھا نہ چھوڑا وہاں پُرانی چیزیں جمع کرنے کا ذوق بھی نہ گیا۔ وہ اب بھی بڑی دلچسپی سے کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی دوکان سے قرنوں پرانا کوئی چینی کا گلدان، کوئی طشتری کوئی پیالہ تلاش کر کے لے ہی آتے تھے۔ اور باقی فرصت کے اوقات میں حکمت کی مشق جاری رہتی، کیمیاگری ہوتی اور کشتے پھونکے جاتے۔

رات کے کھانے کے بعد البتہ وہ گھر سے ذرا چہل قدمی کا کہہ کر چلے جاتے لیکن درحقیقت وہ اپنے پرانے دوست نواب پتن کے ہاں وقت گذارتے یا بتن جان کے جب میر نہال نے بتن جان کو رکھ لیا تھا وہ گانے بجانے کا پیشہ چھوڑ کر چاوڑی سے دریبہ میں اٹھ آئی تھی، جہاں میر نہال نے اس کے لیے ایک مکان کرایہ پر لے دیا تھا۔ بتن جان ایک تو نوجوان تھی دوسرے اس کی چتون میں بھانت تھی، پھر اونچے طبقہ کی شائستہ طوائف۔ یہ طوائفیں نہ صرف فنِ موسیقی میں مہارت رکھتی تھیں بلکہ اُن کا ذوقِ شعر و سخن اور فہمِ ادب بھی ارفع و اعلیٰ ہوتا تھا جن کے ہاں کبھی شرفا اپنے بچوں کو تہذیب و شائستگی اور آدابِ محفل کی تربیت کے لیے بھیجتے تھے، اور جن کے پاس نواب و رؤسا ان کی نکھری ستھری باتوں سے تفریحِ طبع کے لیے جاتے تھے۔ بتن جان اپنے عشوہ و ناز سے ان کی دل بستگی میں مصروف رہتی اور میر صاحب تمام دن کی کوفت مٹانے کے بعد آدھی رات گئے گھر آ کر سو جاتے۔

اُن کی غیر موجودگی میں عفور بھی گُل چھرّے اُڑاتا۔ اس کی آنکھیں تاتاریوں کی طرح خون آشام تھیں اور مضبوط سینے پر گھر درے بال اتنے تھے کہ ان کی زیادتی سے سینہ کالا ہو گیا تھا، مگر کسرتی جسم میں ایک لبھاؤ تھا اور شاید اسی کشش کے سبب وہ ادنیٰ قسم کی کسبیوں میں ہر دلعزیز تھا۔ جب ان کے گاہک چلے جاتے تو وہ عفور کو بلا لیا کرتیں۔ ایسے موقعوں پر وہ خاص اہتمام سے بن ٹھن کر جاتا۔ اپنی سفید شیروانی پر خوب عطر ملتا۔ سر میں تیل اس قدر انڈیلتا کہ بہ کر کنپٹیوں اور پیشانی تک آ جاتا۔ گھر کا پکا ہوا کھانا تو وہ کھانا جانتا ہی نہ تھا۔ رنگین لیوں کے ساتھ ساتھ مرغن کھانے کی چاٹ پڑ گئی تھی بغیر تندوری پراٹھے کے وہ ٹکڑا نہ توڑتا۔ صبح ڈنڈ پیلتا، بیٹھکیاں لگاتا اور بادام کا حریرہ پیتا۔ بے فکری اور اچھی غذا نے اس کو طاقت ور بنا دیا تھا اور وہ ہمیشہ چاق و چوبند رہتا۔ گھر کا کام

بڑی پھرتی اور انتہائی وفاداری سے کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے کرتوت جانتے ہوئے بھی میر بہال اس کے رات بے رات غائب ہونے پر زیادہ تنبیہہ نہ کرتے تھے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ویسے گھر کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ ہندوستان میں عورت کی زندگی تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سی ہے، جو ہمیشہ پرسکون اور خاموش رہتا ہے اور جس میں کبھی کوئی لہر اٹھ کر ہلچل پیدا نہیں کرتی۔ اسی طرح زنانخانے کی فضا ساکن تھی اور زندگی یکسانیت سے بسر ہو رہی تھی۔ نہ کہیں آنا تھا نہ جانا۔ کبھی کبھار کوئی خالہ ممانی یا دُور پرے کے رشتہ دار ملنے آجاتے یا پھر بہت ہوا تو خود تیج تہوار پر، یا شادی غمی یا چھٹی چھوچک کی تقریب میں کسی کے ہاں چلی گئیں، ورنہ وہ تھیں اور گھر تھا اور گھر کی محدود چار دیواری۔ اس کی قدیم اونچی اونچی کروڑوں اینٹوں سے چنی ہوئی دیواریں ان کی عصمتوں کی نگہبان تھیں، اور ان کی ہر اینٹ اس محصور جہان کی بسنے والیوں کی بڑی وفاداری سے پاسبانی کر رہی تھی۔ ان کی سانولی سلونی صورتیں نامحرموں سے بیگانہ اور جوانی غیر مردوں کی نگاہِ تعاقب سے محفوظ تھی۔ یہ ہستیاں بے خوف و خطر اس طرح جی رہی تھیں جیسے لاجونتی کی نرم و نازک بیل کو تمازتِ آفتاب سے بچانے کے لیے شیشے کے گھر میں رکھ دیا جاتا ہے۔ زمانہ لاکھ کروٹیں بدلے، وقت سیکڑوں پلٹے کھائے، طوفان آئیں، بجلیاں گریں، آندھی ہو یا بھونچال، قحط پڑیں، دُنیا مرے یا جیے، تغیراتِ کون و مکاں ہوں یا انقلاب آسمان، گھروں کے اندر کوئی تلاطم بپا نہ ہوتا۔ گردشِ دو جہاں سے بے خبر نازک اور معصوم زندگیاں گزرتی رہتیں۔ ایک دن آتا دوسرا چلا جاتا۔ صبح ہوتی شام ہوتی۔ ماہ و سال صدیاں بن جاتے، مرد زندگی کی آزمایشوں سے

بر سرِ پیکار رہتے، مردانہ قوتیں تلخیٔ حیات کا مقابلہ کرتیں اور یہ عورتیں دنیا کی آفتوں سے پناہ میں رہتیں۔ ان کا وقت گھر کے روزمرہ کے کام کاج، سینے پرونے، کھانا پکانے اور کھلانے میں صرف ہوتا یا پھر خالی بیٹھے بیٹھے بیکار باتوں میں کٹ جاتا۔ بلا ناغہ صبح کو جمال بیگم اور انجم زمانی نیچے آ جاتیں۔ کبھی دلہے کے لیے کریلے چھیلے جاتے کبھی رائتے کے لیے لکڑیاں کدو کش کی جاتیں، نہیں تو کسنے کھول کے کٹا کٹ چھالیہ کتری جاتی اور سروتوں کے ساتھ ساتھ زبانیں بھی قینچی کی طرح چلتی رہتیں۔ دنیا جہان کی وہ کونسی بات تھی جو بغیر کہے سنے رہ جاتی ——— شادی بیاہ کے ذکر سے لے کر مرنے جینے تک کے بیان ہوتے۔ ایک ہی آواز سے باتوں کا چرخہ چلتا رہتا۔ خاندان بھر کے دکھڑوں کے علاوہ آپس میں گلے شکوے ہوتے اور کبھی کبھی ذرا سی بات بڑھتے بڑھتے اچھی خاصی لڑائی ٹھن جاتی۔ ہنسی خوشی کی باتیں ہوتے ہوتے آوازیں گرم ہو جاتیں، لب و لہجہ میں تلخی آ جاتی، اور بعض اوقات جمال بیگم اپنی دیورانی بیگم نہال سے خواہ مخواہ الجھ پڑتیں یا پھر انجم زمانی اپنی نند جمال بیگم کی لعن طعن سے دق آ کر ترکی بہ ترکی جواب دیتیں۔ دلچین بھی اکثر ان گھریلو قصیوں میں شامل ہو جاتی۔

جمال بیگم کا چہرہ طباق سا تھا۔ پیشانی خوب چوڑی تھی اور ناک توتے کی چونچ کی طرح خمیدہ۔ جب وہ بے بات کی جنگ میں ہارنے لگتیں تو زور زور سے چیختیں اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور گود پھیلا پھیلا کر کوستیں۔ اگر کبھی کوئی صلح صفائی کرانے کی کوشش کرتا تو بس بکھر جاتیں اور نہ صرف کہنے والے کو لتاڑتیں، بلکہ خاندان بھر کو ٹیم کر رکھ دیتیں۔ جب کچھ اور کٹا چھنی کو باقی نہ رہ جاتا تو اوپر چلی جاتیں۔

مہرو اور مسرور کی چشم چوٹ چلا کرتی۔ جب سے مہرو کی بات پکی ہوئی تھی

مسرور کو بھی اُشتک مل گئی تھی اور ان دونوں کا جھگڑا معراج کے نام سے شروع ہوتا۔ حالانکہ اس لڑائی میں جیت ہمیشہ مہرو ہی کی ہوتی مگر مسرور بھی اس کو چڑانے سے باز نہیں آتا اور "معراج معراج" کی تان لگا کر بھاگتا اور مہرو بظاہر اس پر غصّہ اتارنے لگتی۔ لیکن مشرق میں اگر حُسن قیدِ دیوار میں تھا، تو لطیف و نازک احساسات بھی پردۂ حجاب میں۔ کنواری لڑکیوں کی قدرتی خواہشات ابھرتیں، جذبۂ نفسانی بیدار ہوتا پر وہ ان کو غیرت کے اچھوتے دامن میں چھپا لیتیں۔ جب مہرو اپنے منگیتر کا نام بر ملا سنتی تو نہ صرف وہ مسرت جو اس نام سے وابستہ ہو گئی تھی بلکہ وہ اُمنگیں بھی جو اس کے دل کے عمیق گوشوں میں پنہاں تھیں، جاگ جاتیں اور اس کے خوابیدہ جذبات برانگیختہ ہو جاتے۔ وہ خود ان بے نام مسرتوں کے مفہوم کو تو نہ سمجھتی تھی لیکن اُس کے جذبات کا توازن ڈانوا ڈول ہو جاتا، اور اس حیلے سے سارا جوش غریب مسرور پر غصّہ کی صورت میں اُترتا۔ مسرور کا معراج کہہ کر چھیڑنا جہاں اس کی دلی خواہش تھی وہاں سماعت پر مہمیز بھی اور اسے یہ محسوس ہوتا کہ کسی نے گھنی اور تاریک ترائیوں میں آ گئنے والی کھمبیوں کا پتہ لگا لیا ہے یا اُس مکڑی کو عریاں کر دیا ہے جو اپنے جال میں چھپی بیٹھی تھی۔ اِس نام کے ساتھ ہی ایک چھپاکا سا ہوتا جیسے کسی نے ساکت پانی میں کنکر پھینک کر اُس کا سکون برباد کر دیا ہو۔ سطحِ آب پر ایک کے بعد دوسری موج اُٹھتی، گرداب بنتے، تھوڑی دیر کو یورش ہوتی اور پھر وہی پہلا سا جمود اور ٹھہراؤ ہو جاتا۔ مہرو بگڑ بگڑ کر مسرور کے پیچھے بھاگتی اور اگر اتفاق سے کبھی ہاتھ آ جاتا تو نارنی کوٹتی۔ "یہ ہمارا گھر ہے" کہہ کر اس کے کچو کے دیتی اور اپنی برتری جتاتی، مگر پھر سارے احساسات حباب کی طرح بیٹھ جاتے، اور زندگی خاموش پانی کی طرح ساکت ہو جاتی۔

مسرور بیٹھا بیٹھا کر اپنی یتیمی پر آنسو بہاتا اور کبھی اپنی بچی کو یاد کرتا جو اُسے

دِلّی اپنی سمدھن بیگم نہال کے پاس تعلیم و تربیت کی غرض سے چھوڑ گئی تھیں۔ یہ بیچاری خود بیوہ تھیں اور اپنی بیٹی داماد کے در پر پڑی تھیں، بھلا مسرور کا دُم چھلا کہاں باندھتیں۔ مجبوری کا نام صبر ہے اور وہ رو دھو کر خود ہی چپکا ہو جاتا۔

اس کی زندگی گھر سے اسکول تک محدود تھی۔ اکثر وہ مدرسہ سے تھکا ہارا آتا اور بچی کھچی دال روٹی یا ٹھنڈا ابٹا سالن جو کچھ ہوتا ٹھنڈے دل سے کھا لیتا۔ گرمیوں کی دوپہروں میں اکثر اس کا بھی جی چاہتا کہ سو جائے مگر مہرو کا جہیز ابھی سے سلنا شروع ہو گیا تھا جبکہ شادی کوسوں دور تھی، اور مئی کی جلتی دھوپ میں اس کو چیزیں لینے بھیجا جاتا۔ کپڑا لا لا کر دکھانے، پسند کروانے، گوٹہ کناری بدلوانے ہی میں سینکڑوں چک پھیریاں بازار کی ہو جاتیں ......

ایک شمس تھے جو مزے سے دیر میں اُٹھتے، اطمینان سے ناشتہ کر کے دفتر چلے جاتے اور پانچ ساڑھے پانچ بجے واپس آتے۔ آنے کے بعد ان کا معمول تھا کہ منہ ہاتھ دھو کر تیار ہوئے، محلّے کی مسجد میں نماز پڑھی اور شام کو ہوا خوری کرنے کہیں نکل گئے یا اگر کوئی عزیز آ گیا تو اس سے باتوں میں بیٹھ گئے اور باتیں وہی اللہ والوں کی ہوا کرتیں۔ تصوف سے تو خیر شناسائی واجبی سا تھا، البتہ پیروں فقیروں کی "کراماتوں" کے بہت قائل تھے۔ جمعرات کی جمعرات تمام مزاروں پر بڑی عقیدت سے حاضری دینے جاتے۔ خصوصاً نظام الدین اولیاء کے بہت عقیدت مند تھے اور وہاں کی حاضری کسی جمعرات کو ناغہ نہ ہوتی۔ سیر سپاٹوں اور تفریح سے جو وقت بچتا وہ بیوی کے پہلو میں بیٹھ کر گزار دیتے ......

دونوں وقت سقّہ آواز لگاتا: "پانی لے آؤں؟" اور جواب ملے بغیر منہ ہر اندھیری ڈالی اندر آ جاتا۔ اس کی کمر مشک کے بوجھ سے جھکی رہتی۔ اس کے ہاتھوں کی جلد بارہ مہینے پانی میں بھیگنے سے موٹی اور سخت پڑ گئی تھی اور گھائیاں

پھٹ کر سفید سفید کھپرے جم گئے تھے۔ وہ مشک کا تسمہ کھولتا اور غلل غلل پانی مٹکوں میں بھر دیتا......

گھر کی اونچی اونچی دیواریں باہر سے آنے والی ہر بلا اور ہر آفت کے سامنے سینہ سپر کیے اسی عزم واستقلال سے کھڑی تھیں اور زندگی دنیا کے گزند وبرد آزمائی سے بے پرواہ تھی۔ چڑیاں اسی طرح مہندی کی شاخوں پر روز جھولا جھولتیں، لٹکتے ہوئے کونڈوں میں دانا دُنکتیں، پانی پیتیں اور دالان کے بنا بیٹی کے پردوں میں وہ چوں چوں کا شور مچاتیں جو حشر تک ختم نہ ہوتا ہوا معلوم ہوتا۔ کھجور کے سر بہ فلک درخت میں رنگ برنگ کی گڈیاں کٹ کٹ کر اٹک جاتیں، کوّے صبح سے شام تک کائیں کائیں کرتے اور چیلیں چلچلاتیں۔ ہوا پتوں کو چھیڑ کر اِدھر سے اُدھر بے قرار کرتی، جھکڑ چلتے، خاک برستی، اور رات کو بلیاں گرے پڑے ٹکڑوں پر تخت کے نیچے لڑتیں اور جب جنگ سے فراغت پاتیں تو چھتوں پر گربہ پائی سے چہل قدمی کرتیں۔ گلیوں میں نالیوں سے سڑاند پھوٹتی، فقیر اپنی اپنی صدائیں لگاتے خونچے والے طرح طرح کی چیزیں بیچتے اور زندگی ایک عالم بے خبری میں گزرتی رہتی۔

٦

آخر ایک دن وحیدہ بیگم جن کے سب منتظر تھے، آ گئیں۔ اصغر انھیں لینے اسٹیشن گیا تھا اور جیسے ہی کہاروں نے آواز لگائی: "سواری اتروا لو" سب گھر والے ڈیوڑھی کی طرف دوڑے۔ ڈولی کا پردہ اُٹھا کر باہر قدم رکھا ہی تھا کہ ہر ایک نے بھینچ بھینچ کر گلے لگایا۔ بیٹی سے مل کر بیگم نہال کی آنکھیں مسرّت سے پُرنم ہوگئیں۔ نواسی اور نواسے کو بار بار کلیجے سے لگاتیں اور سر پہ ہاتھ پھیرتیں اور پھر بھی اُن کا جی نہیں بھرتا۔ اصغر نے سامان اتروا کر صحن میں سنگوا دیا۔ پھر سب باتوں میں اس قدر منہمک ہوئے کہ کہاروں کو کرایہ دینے کا ہوش بھی نہ رہا۔ انھوں نے چلاّ نا شروع کیا: "امّاں جی کرایہ بھجوا دو۔" بیگم نہال نے پٹاری کی گردی کے نیچے سے پیسے نکال کر دلچین کے ہاتھ بھجوا دیے۔ اس کا دل بھی باتوں میں پڑا ہوا تھا اور درمیان میں اٹھنا اُسے ناگوار گزرا مگر کہار چلاّ رہے تھے اور وہ کرایہ دینے چلی گئی۔

خلافِ معمول میر نہال بھی خوش خوش دوپہر کو گھر آگئے۔ جھلی والے کے سر پر رکھوا کر ایک بڑا سا تربوز بھی لائے۔ کھانے سے پہلے سارے گھر نے اکٹھے ہو کر تربوز مزے لے لے کر کھایا جو بہت سُرخ اور میٹھا نکلا۔ دلہن نے بیج سمیٹ کر دھوئے اور صحن میں سُوکھنے کو پھیلا دیئے۔

مسرور بھی خوش تھا اور شمس دفتر سے آ کے حسبِ عادت بیوی کے ساتھ کلھیا میں بند ہو کر نہ بیٹھے بلکہ وحیدہ بیگم اور گھر والوں سے گھل مل کر باتوں میں شامل ہو گئے۔ اُن کی دُلہن بھی آج اپنا کمرہ چھوڑ کر سب کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ دلہین میں اچانک چُستی آ گئی تھی اور وہ دوڑ دوڑ کر کھانے کی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔ غفور نے وحیدہ بی کے استقبال میں نہ صرف خود ہی کو عطر میں غرق کر لیا تھا بلکہ تو تے میاں کو بھی عطر میں نہلا دیا تھا اور اُس کے پر جُڑی مُڑی ہو کر جگہ جگہ سے لال لال کھال نظر آنے لگی تھی۔

وحیدہ بیگم کے آتے ہی گویا زندگی میں نئی نمود آ گئی تھی۔ ہر شخص خوش تھا، ہر چیز متحرک۔ وہ مضمحل ہمواری آج کہیں چلی گئی تھی۔ چڑیوں کی چُوں چُوں میں خوشی کے راگ سُنائی دیتے تھے۔ کھجور کا درخت ہوا میں جھوم رہا تھا اور اُس کے پتّے خوشی سے تالیاں بجا رہے تھے.......

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

وحیدہ بیگم اصغر کو دیکھتے ہوئے بولیں:

"کیا بات ہے تم بہت دُبلے اور کمزور ہو گئے ہو۔" اور پھر ماں سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں: "اماں، اصغر کو کیا ہو گیا ہے۔ بالکل ہڈیوں کی مالا نظر آتا ہے۔"

اصغر تو کچھ نہ بولا، بیگم نہال نے جواب دیا:

"اے کمبخت گرمی نے سب کا اچار ڈال رکھا ہے نہ کھایا پچے نہ پیا انگ لگے۔

ویسے تو اللہ رکھے کوئی بات نہیں ہے۔"

گرمی کا سنتے ہی جمال بیگم اپنے کو اور تیزی سے پنکھا جھلنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کو خدا کے ظلم یاد آ گئے اور بولیں:

"عضب خدا کا گرمی تھوڑی ہے، آسمان سے آگ برس رہی ہے۔ اس میں تو موئے فرشتوں کے پر بھی جھنڈا ہو جائیں۔" اور پنکھے کی ڈنڈی سے پیٹھ پر سے کرتا اٹھا کر گرمی دانے دکھانے لگیں۔ "رات بھر انگاروں پر لوٹتی ہوں۔ نگوڑے گرمی دانوں نے پیٹھ کو پکا پھوڑا بنا دیا۔ توبہ ہے اللہ میاں کو رحم بھی نہیں آتا۔ مارے ڈالتے ہیں...... اے بی انجم دیکھ کیا رہی ہو۔ ذرا ہوا کر دو۔" اور انجم نند کی پیٹھ کو پنکھا جھلنے لگیں اور پیٹھ کو کھجاتی بھی جاتیں......

رات کا کھانا سب نے ساتھ مل کر کھایا۔ جمال بیگم بھی اپنے ہاں کے پکتے ہوئے پسندے لے آئی تھیں۔ کھانے اور باتوں سے فراغت ہوتے ہوتے دن کا آدھا بھی بج گیا جب کہیں جا کر اصغر کو بہن سے بات کرنے کا موقع ملا اور وہ دونوں چھت پر آ گئے۔

بارہ وفات کا مہینہ تھا۔ شہر بھر میں قوالیاں ہو رہی تھیں۔ جگہ جگہ چوکیاں بیٹھی ہوئی تھیں اور ہر طرف سے ہارمونیم، تالیوں اور قوالوں کے گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک قوال دھیرے دھیرے الاپتا اور دوسرا مصرع اٹھاتا، پھر سارے قوال ہمنوا ہو کر عشقیہ کلام گانے لگتے۔ کیف مجازی رنگ جماتا، کچھ کو حال آنے لگتا، قوال تکرار کرتے اور حال کھیلنے والا سر ہلا ہلا کر "حق اللہ حق اللہ" کے نعرے لگاتا۔ قوال مصرع دہراتے رہتے، اور آخر کار نعرے بند ہو جاتے۔ ایک کے بعد دوسری چوکی آتی اور آوازوں کا سلسلہ قایم رہتا۔

اصغر وحیدہ بیگم سے کہہ رہا تھا:

"آپا ایک وہ ہیں جن کے قدم سدا خوشیاں چومتی ہیں، اور ایک مجھ جیسے نامراد جو ذرا ذراسی بات کو ترستے ہیں۔"

وحیدہ بیگم نے ٹھنڈا سانس بھر کے کہا:

"خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ مگر تو ج جو تم نامراد ہو۔"

"نہیں آپا میں ازل سے بدقسمتی اپنے ساتھ لایا ہوں۔ ہوش سنبھالا ہی تھا کہ آپ کو یاد ہوگا اماں کے دماغ میں فتور آگیا۔ تمام دن کوئلہ سے دیواروں پر شعر لکھا کرتی تھیں —— یاد ہے نا؟"

"ہاں بڑے منحوس دن تھے وہ۔ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے مگر اس وقت تو تم بالکل بچّے تھے۔ اے تمہیں کیا یاد ہوگا۔ اماں کی بیماری تو اس وقت شروع ہوئی تھی جب دلچین کے ہاں بچہ ہوا تھا۔ مگر بدنصیب زیادہ جیا کہاں۔"

"ہاں ہاں مجھے سب معلوم ہے۔ ابا اور دلچین ......" اصغر آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وحیدہ بیگم نے اُسے ٹوک دیا اور کہنے لگیں:

"مجھے بھی یاد ہے۔ ایک دن اماں دالان میں بیٹھی تھیں۔ ابا میاں نے انھیں منانے کے لیے کہا: "ذرا میرا حقّہ جلا دینا" —— جس کا جواب انھوں نے تڑخ کر دیا تھا کہ "مجھے جلنا ہی آتا ہے جلانا نہیں" —— ابا تو اپنا سا منہ لے کر رہ گئے مگر اس کے بعد سے تو اماں دیوانوں سے بدتر ہوگئیں۔ کبھی روتیں، کبھی ہنستیں اور کپڑے پھاڑ کر گلیوں میں بھاگتیں۔ جب کسی وید حکیم کی دوا سے آرام نہ ہوا تو اتفاق سے کمبل شاہ آنکلے۔ انھوں نے کچھ تعویذ گھول کر پلوائے، دھونیاں دیں، اور پھر ہدایت کی کہ اُنھیں روشن چراغ دہلی لے جائیں اور وہاں مزار پر جھاڑ و دلوائیں۔ چچا بشیر کا مکان درگاہ میں تھا اور ابا

نے انھیں بلوا بھیجا ـــــ جس دن وہ اماں کو لے جانے والے تھے وہ تم کو گود میں لے کر بیٹھ گئیں اور مجھے چمٹا لیا اور بار بار کہتیں اپنے لالوں کو نہیں چھوڑوں گی ...... "

"ہاں مجھے بھی یاد آگیا۔ شام کا وقت تھا، ہم سب بہلی میں بیٹھ کر گئے تھے۔ آپ اور میں کیسے سہمے سکڑے کونے میں بیٹھے تھے۔ چچا بشیر کو خدا غریق رحمت کرے، ہماری گاڑی کے ساتھ ساتھ سارے راستے پیدل چلتے رہے۔ تو بہ وہ گھر کیا تھا قبرستان تھا۔ چاروں طرف قبریں ہی قبریں تھیں۔ ہُو حق کا عالم، نہ کوسوں آدمی نہ آدم زاد نہ چڑیا کا بچّہ پر مارے اور کوٹھریاں ڈھنڈار اور ویران بھائیں بھائیں کر کے کھانے کو دوڑتی تھیں جن میں عقاب کی عقاب چمگادڑیں اِدھر اُدھر چکر لگاتی تھیں اور ان کی غلاظت سے سارا گھر سڑ رہا تھا۔ چچا بشیر تو ہمیں وہاں پہنچا کر اپنے گھر چلے گئے اور اماں نیم کے درخت پر چڑھ کر بیٹھ گئیں .... جب وہ گھر یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم دونوں تنِ تنہا وہاں کیسے زندہ رہ گئے۔ اماں دن دن بھر ہم سے نیم کے تنکے چنوایا کرتی تھیں۔ اول تو دِنوں فاقے کرتیں ورنہ سوکھے ٹکڑے پانی میں بھگوئے اور نگل لیے۔ دن بھر تڑاخے کی دھوپ پڑتی، لُو چلتی اور ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی بتوں سے کشتیاں لڑتی اور خاک تھی کہ کمرہ میں ڈھیریاں بنا دیتی۔ خشک پتے قبروں کے پتھروں پر عجب بھیانک شور سے لوٹتے تھے اور سرِ شام ہی گیدڑ بھٹوں میں سے نکل کر روتے اور جنگلی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگتیں ......"

"چلو چھوڑو۔ جو گزر گیا سو گزر گیا"، وحیدہ بیگم نے موضوع بدلنے کو کہا: "وہ دن بھی تو یاد کرو جب اماں اچھی ہو گئیں اور ہم سب کو لینے ابا آئے تھے ہم کتنے خوش ہوئے تھے جیسے جنت مل گئی ہو ......"

ہوا کا ایک ہلکا اور خنک جھونکا آیا۔ قوالوں کی دوسری چوکی بیٹھ چکی تھی

اوردہ:

ازیت مصیبت ملامت بلائیں
ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

گا رہے تھے۔ اُن کی آواز ہوا کے جھونکے کے ساتھ آتی اور اسی جھونکے کے ساتھ واپس ہوکر فضا میں مل جاتی۔

"آپ کی شادی بھی تو اسی کے بعد ہوئی تھی"، اصغر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "کتنے پیارے وہ دن تھے۔"

"اے تم کو تو سب ہی کچھ یاد ہے"، اور وحیدہ بیگم نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ اپنے سہاگ کے دن ان کو یاد آ گئے اور ان کا چہرہ روشن ہو گیا۔

لیکن اصغر نے اُن کی دُکھتی ہوئی رگ کو چھیڑ دیا:

"ایک دن میں بس اسکول سے آیا تو گھر میں دیکھا ایک کہرام مچا ہوا ہے۔ دولہا بھائی کی اچانک اور ناوقت موت نے غیروں تک کو رُلا دیا تھا۔ ابا اور اماں کی حالت تو دیکھی نہ جاتی تھی۔ پھر مجھے بار بار آپ کا خیال آتا اور ننھے ننھے معصوم بچوں کا مگر شاباش ہے آپ نے بڑی بہادری سے مشکلات کا مقابلہ کیا۔ سب ہی آپ کی تعریف کرتے ہیں۔ آپ کے صبر کا اجر ضرور ملے گا۔"

وحیدہ بیگم ابھی تک ضبط کیے بیٹھی تھیں مگر اب اُن کی آنکھوں سے ٹپاٹپ مُوٹے موٹے آنسو گرنے لگے۔ چمن لُٹ چکا تھا، اور بہاریں کھو گئی تھیں اور اصغر ویرانوں کے قصّے دوہرا رہا تھا۔

تھوڑی دیر وہ یوں ہی بیٹھی رہیں اور آنسو آنچل میں جذب کرتے ہوئے بولیں:

"تمہارے خط سے معلوم ہوتا تھا کہ تم پریشان ہو۔ بتاؤ تو کیا بات ہے؟"

"آپ کو تو معلوم ہے ابا مجھ سے کچھ خوش نہیں ہیں۔ خفگی ترشی کے سوا کوئی

بات ہی نہیں کرتے۔ میری کالردار قمیص، پمپ جوتے، ہر چیز ان کو زہر لگتی ہے۔ یہاں تک کہ میرے ملنے جلنے پر بھی پابندی ہے۔ تمہاری بات تو پھر بھی سن لیتے ہیں، لیکن اس پورے گھر میں میرا کوئی نہیں ہے اور نہ کسی کو مجھ سے محبت ہے نہ میری پرواہ" اور اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے .....

سامنے شیخ فضل الٰہی کارخانے دار کے ہاں قوالی ہو رہی تھی۔ لوگ قطاروں میں گاؤ تکیوں سے لگے بیٹھے تھے۔ ہنڈوں کی روشنی میں ان کے چہرے واضح نظر آ رہے تھے اور اُن کی پرچھائیاں میر نہال کے کوٹھے کی دیوار پر پڑ رہی تھیں۔ قوال گلے پھاڑ پھاڑ کر گا رہے تھے اور فضل الٰہی کا بیٹا حمید حال کھیل رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے سینہ پر ہاتھ مارتا اور ہائے ہائے کرتا ......

"آخر کچھ بتا بھی تو چلے وہ بات کیا ہے جس سے تم ہلکان ہو رہے ہو۔ ابا سے میں کہہ دوں گی۔"

اصغر نے کہا:

"میری زندگی کا فیصلہ ہونے والا ہے۔"

وحیدہ بیگم دل کھول کر ہنستے ہوئے بولیں:

"یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔ مبارک ہو۔ خدا وہ دن تو لائے کہ تم کو دولہا بنا دیکھوں۔ اماں نے کہیں طے کر دی ہے؟"

"نہیں بھئی۔ معاملہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ اماں تو چاہتی ہیں اپنی بھتیجی یا مولوی نصیر الدین کی صاحبزادی کو میرے گلے باندھ دیں۔ مجھے تو اُس کے نام سے وحشت ہوتی ہے۔"

وحیدہ بیگم کہنے لگیں:

"لو تم نے تو مجھے ڈرا دیا تھا۔ بس اتنی سی بات تھی۔"

"نہیں آپ سمجھی نہیں۔ میرا مطلب "۔

"تو تم سمجھا دو "۔

"میں تو کسی اور کو آپ کی بھاوج بنانا چاہتا ہوں "۔

"میں تو تم کو بڑا بھولا سمجھتی تھی "۔ وحیدہ بیگم نے جواب دیا۔ "تم تو چھپے رستم نکلے۔ اے ہمیں بھی تو بتاؤ وہ کون سی خوش نصیب لاڈو ہے "۔

"آپ بھی اس کا اتا پتا سن کر خلاف ہو جائیں گی "۔

"بتاؤ تو سہی "۔

"بھائی اشفاق کی سالی "۔

"لیکن تم کو اس سے اچھی لڑکیاں مل سکتی ہیں "۔

"دیکھیے آپا، میں نے جب کسی چیز کی خواہش کی اس کو کچل دیا گیا۔ میں علی گڑھ میں پڑھنا چاہتا تھا کہ والد محترم کو وہ فرنگی خانہ نظر آیا، جہاں مسلمانوں کو لا مذہب یا عیسائی بنایا جاتا ہے۔ خیر اب تو اس کا بھی قصہ ختم ہوا دل کی آرزو دل میں رہ گئی۔ اب شادی کے معاملے میں بھی میرے ساتھ یہی رویّہ ہے۔ لیکن میں اِس بارے میں قطعی فیصلہ کر چکا ہوں ....."

قوال اس وقت نئی غزل گا رہے تھے :

دو چشمت کہ تیر بلا می زند
کجا می نماید کجا می زند

اور حمید زور زور سے نعرے لگا رہا تھا۔

"میں نے ہمیشہ آپ لوگوں کا کہا مان لیا "۔ اصغر نے کہا۔ "لیکن ملقیس سے شادی نہ ہوئی تو میں کچھ کھا کر سو رہوں گا۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری "۔

"خیر تم اس قسم کے بُرے خیالات تو پاس نہ لاؤ ۔ جب تک میرے دم میں دم ہے تمہارے لیے جو بن پڑے گا کروں گی ۔ خدا تم کو رکھے ۔"

جو اصغر چاہتا تھا وہی ہوا اور خود کشی کے ڈراوے کا وار خالی نہ گیا ۔ وحیدہ بیگم اس کی طبیعت کی ضد سے واقف تھیں ڈر گئیں اور پکّا وعدہ کیا کہ اماں ابّا کو رام کرلیں گی اور نیچے چلی گئیں ۔ حالِ دل سنا کر غبارِ خاطر کم ہو گیا تھا اور اصغر پلنگ پر لیٹ گیا ۔

قوال ابھی تک " دو چشمت کہ تیر بلا می زنند " بار بار دہرا رہے تھے اور حمید اسی طرح حال کھیل رہا تھا ۔ ہائے ہائے کے نعرے زیادہ ہو گئے تھے اور اس کی بنتی بگڑتی ٹیڑھی میڑھی پرچھائیاں دیوار پر پڑ رہی تھیں اور رات کے اندھیرے میں شیطانی سایوں کی طرح ڈراؤنی معلوم ہوتی تھیں ۔ اصغر یہ چھائیاں دیکھتے دیکھتے اٹھا اور منڈیر پر کھڑے ہو کر فضل الٰہی کے گھر میں قوالی کا تماشا دیکھنے لگا ۔ قوال جو غزل گا رہے تھے اس کے بھی حسبِ حال تھی اور وہ غمگین ہو گیا ۔ لیکن جب اس کی نظر حمید پر پڑی تو وہ خود کو بھول کر حمید اور اس کی زندگی کے بارے میں سوچنے لگا ۔

* * * * * * * *

حمید تھا تو کارخانہ دار کا بیٹا مگر بڑا سیدھا سادا ، اور اس طبقے میں جو چالاکی اور تیزی ہوتی ہے اس میں بالکل نہ تھی ۔ اصغر اور وہ بچپن میں ایک ساتھ مولوی صاحب کے ہاں قرآن شریف پڑھنے جاتے تھے اور وہ نہ صرف پڑھنے میں اچھا تھا اور رکوع کے رکوع حفظ کر ڈالتا ۔ بلکہ مولوی صاحب کی جھاڑو بہارو اور حد ہے پتیلیاں مانجھنی بھی اپنے ذمہ لگا لی تھیں اور ان کی ہر ضرورت کو اس تعظیم سے بجا لاتا گویا یہ بھی اس کا ایک تعلیمی فرض تھا ۔ اس کے بعد شیخ فضل الٰہی نے اپنی دوکان پر کام سیکھنے بٹھا لیا اور اصغر سے اس کا ملنا جلنا تقریباً چھوٹ گیا ۔

کارخانہ داروں اور نچلے طبقہ میں لڑکا لڑکی کی شادی کچی عمروں ہی میں ہو جاتی ہے اور حمید ابھی اٹھارہ برس کا ہوا تھا کہ اُس کی شادی کے چرچے ہونے لگے۔ مگر پھر یہ سننے میں آیا کہ وہ اچانک پاگل ہو گیا ہے۔

پہلے پلا۔ ئے بیٹے کا یوں بیٹھے بٹھائے مخبوط الحواس ہو جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ جوان بیٹا عمر کی آدھی کمائی ہوتا ہے۔ اس سانحہ کے بعد فضل الٰہی مارے مارے پھرے۔ جو کوئی جو کچھ بتاتا کرتے۔ مولوی مُلاّ سیانے، پنڈت کوئی نہ چھوڑا۔ تعویذ گنڈے عمل عملیات سب ہی کر ڈالے۔ درگاہ درگاہ بھٹکتے، مزار مزار لیے پھرتے۔ منّت نیاز صدقہ جو بن آئی۔ سب ہی کیا مگر اس کا اوپری اثر لا دوا تھا اور سارے ٹونے ٹوٹکے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ نہ معلوم وہ کیا ظالم جن تھا جو کسی منتر سے قابو میں نہ آیا۔ جب لاکھ جتن کر کے ہار گئے تو بڑے بوڑھوں کی رائے یہ ہوئی کہ حمید کو قوالی سنوائی جائے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔

حمید کو روز قوالی سنوائی جانے لگی۔ مگر بجائے اس کے کہ اُس کو کچھ افاقہ ہوتا اُس کی دیوانگی اور بڑھ گئی۔ عشق و محبت میں ڈوبے ہوئے راگ اس کے دل کی عمیق ترین گہرائیوں کو چھیڑتے اور اس کے جذبات کو اور زیادہ مشتعل کرتے، عشقیہ الفاظ تازیانوں کی طرح اس پر پڑتے اور ان کی تکلیف اس کے قلب و جگر تک باقی رہتی۔ خون تیزی سے گردش کرتا ہوا جا جا کر دل کے پردوں سے ٹکراتا اور بھولی بسری چھپی ہوئی یادوں پر سے دھندلے نقاب اٹھ جاتے۔ ایسی ساعتوں میں اس کا دردِ دل بڑھتے بڑھتے روحانی کرب بن جاتا اور جسم و جان سے احساس نذر دست جاتا اور وہ ایسا بے قابو ہوتا کہ کسی چیز پہ قابو نہ رہتا اور وہ بے تحاشہ اور پوری قوت سے اپنے سر کو در و دیوار سے ٹکراتا، ہاتھ پیروں کو پٹختا اور پچھاڑیں کھاتا۔ عشقیہ غزلیں جس قدر پُر شوق اور ولولہ انگیز ہوتیں

اسی شدت سے اُس کی تڑپ زیادہ اور ہائے ہائے کے نعرے بڑھ جاتے۔ ملا سیانے یہی کہتے کہ جنات بس اب کرب کی حالت میں ہے اب گیا اور جب گیا۔ پر ان کو خبر نہ تھی کہ صدائے ساز اور نوائے مطرب سے حمید کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔

قوال اس وقت ایک نعتیہ چیز گا رہے تھے اور اصغر بڑی عقیدت سے گردن جھکائے خاموش بیٹھا سن رہا تھا۔ دھیرے دھیرے موسیقی اس پر اثر کرنے لگی۔ روح کی گہرائیوں میں راگ اترتے چلے جا رہے تھے اور عشق و محبت دل میں سما گئے اور وہ حمید کو ہر یائی درد واندامیں دیکھتا رہا اور نہ معلوم، کہاں سے بدھو، درگی چماری کی لڑکی حمید کے ساتھ ساتھ اصغر کی نگاہوں کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے حمید کو اکثر بدھو چماری کے پاس گلی میں کھڑے ہوئے باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ لڑکی قبول صورت تھی اور بڑی چٹاخ پٹاخ۔ اس کے انداز غیر معمولی طور سے دلربا تھے۔ اپنی میلی کچیلی کوٹھری کے سامنے جس میں دن کی دھوپ اور روشنی بمشکل آتی ہوگی بیٹھی ہوئی بالکل اُبلا ہی نظر آتی تھی اور اس کو دیکھ کر کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ وہ نیچ ذات ہے اس کے سُرخ اور زرد رنگ کے لہنگے اور شوخ نیلی اور دھانی چندریاں اس پر خوب کھلتی تھیں۔ رستہ چلنے والے بغیر نگاہِ غلط انداز ڈالے ہوئے اس کے پاس سے نہ گزر سکتے تھے۔ وہ اپنے قریب سے گزرنے والوں کو بے پروائی سے دیکھتی، اِٹھلاتی، عیارانہ ہنسی ہنستی اور نگاہوں سے دور تک ان کا تعاقب کرتی۔

اسے بکریاں پالنے کا بھی شوق تھا اور اس کی کوٹھری کے قریب سے گزرتے وقت حوریوں کے تعفن کے ساتھ ساتھ بکروں کی بدبو آتی جو ہوا کو کثیف کر دیتی۔ یا تو وہ برتن بھانڈے راکھ سے مانجھ کر چمکایا کرتی یا پھر

موری پر چارپائی بچھائے بیٹھی رہتی اور ایک فربہ بکری پائے سے بندھی ہوتی۔ جب کبھی اصغر ادھر سے گزرتا تو وہ بکری کو گلے لگا لگا کر چٹاچٹ پیار کرنا شروع کر دیتی اور شرارت سے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی جاتی جن میں ترغیب ہوتی تھی۔ اُس کے انداز البیلے ضرور تھے لیکن حُسنِ صورت اور پُرفریبی کے باوجود اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی کیفیت تھی جن سے خواہ مخواہ نفرت ہوتی اور اس کے طور طریق میں نہ کرا ہیت تھی جس سے گھن آتی تھی۔ اس کی ماں ڈرگی بھی دلّی کی اور چماریوں کی طرح خوبصورت تھی مگر بدھو ایک دفعہ دیکھنے کے بعد دوبارہ اچھی نہ معلوم ہوتی تھی۔ اسے دیکھ کر نہ معلوم کیوں رات کی سیاہ کاریوں کا احساس ہوتا تھا، ایسے مکان کا جو بغیر بسے ہی غیر آباد ہو گیا ہو۔ چہرے کی خوبصورتی بھی اس کی روح کے بنجرپن اور ویرانی کی پردہ پوشی نہ کر سکتی تھی۔

ایک دن جب اصغر ادھر سے گزر رہا تھا تو وہ تین لونڈوں کے گھیرے میں کھڑی ہوئی تھی۔ ایک تو بڑا تھا اور دو اس سے ذرا چھوٹے اور تینوں مل کر اس سے شرطیں لگا رہے تھے۔ بڑے لڑکے نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا:

"اچھا دیکھ یہ بلمڈا تیرے جہاں چاہے گھونسا مارے اور اگر تو نے گھونسا کھا لیا تو میں تجھے دو پیسے دوں گا۔"

لڑکے نے اپنی آستینیں اوپر چڑھائیں اور مُکا دکھانے لگا۔ بدّھو "اوئی میاء" کر کے پیچھے ہٹی اور اپنی چھاتیوں پر ہاتھ رکھ کے نخرے سے بولی:

"بس ایک شرط ہے"، اور اُس نے اپنی چھاتیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا: "یہاں نہیں"۔

بڑا لڑکا بولا:

"نہیں اس کی نہیں بدی تھی۔ یہ جہاں چاہے گا مارے گا: تو اپنے قول

سے نہیں پلٹ سکتی .....“

اس کے بعد کیا ہوا، بدھو جیتی یا وہ لڑکے، معلوم نہیں، کیونکہ اسی وقت اصغر کے چچا دوسری گلی سے آتے دکھائی دیے، اور وہ مڑ گیا۔

اِن سب واقعات کو سوچنے کے بعد اصغر کو حمید پر بہت ہی ترس آیا۔ حمید بذاتِ خود شریف اور بُردبار تھا، اور اس طرّار لڑکی سے مقابلہ میں کوئی تعجب نہیں کہ وہ دیوانہ ہو گیا۔ حمید کی بربادیوں نے اس کو اپنے غم یاد دِلا دیے۔ کیا میرا بھی یہی انجام ہونا ہے؟ اس کے دل میں خیال آیا اور وہ کھڑا کھڑا یہی سوچتا رہا۔ حمید ابھی تک پٹخنیاں کھا رہا تھا۔ اس کی پرچھائیاں دیواروں پر بن بن کر بگڑتیں اور بگڑ بگڑ کر بن رہی تھیں۔ ستارے رازداری سے آنکھیں جھپک جھپک کر دیکھ رہے تھے۔ ہوا سرسرانے لگی اور قوّال ایک نئی غزل گا رہے تھے:

رکش گر مہرباں بودے چہ بودے
توانے ناتواں بودے چہ بودے
لب لعلِ تو آبِ زندگانی
بہ کامِ عاشقاں بودے چہ بودے

مگر اس میں دردِ فرقت و انتظار اور ہجر و وصال وہی تھا۔ تانیں ابھرتیں، راگ لہریں لیتے اور قلزمِ شب کی ظلمت میں ڈوب جاتے۔ کہیں دور کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آتی یا کوئی انجن نغموں سے بے خود ہو کر سیٹی دیتا۔ حریص بلیاں چھت پر دھم سے کودتیں اور کوئی نیند میں غافل کبوتر پھڑپھڑاتا ہوا گھونسلے سے ڈر کے اُڑ جاتا اور سہارے کی تلاش میں دیواروں سے ٹکراتا ہوا بے جگہ گر پڑتا..... گھنٹہ گھر نے ٹن ٹن دو بجائے اور اصغر پلنگ پر لیٹ گیا۔

۷

سویرے وحیدہ بیگم بیٹھی ہوئی اپنی اماں سے باتیں کر رہی تھیں۔ زانو پر آبِ رواں کا دوپٹہ پھیلا ہوا تھا جس پر توئی لگا کر شپاشپ ٹھپا ٹانک رہی تھیں۔ بیگم نہال بڑے سے بادیے میں کھجیا کے واسطے تریاں چھیل چھیل کر چھوٹے قتلے کر رہی تھیں۔ دوپٹہ ٹانکتے ٹانکتے وحیدہ بیگم ذرا تھمیں اور اماں کی طرف دیکھ کر بولیں:

"معلوم ہے اماں اصغر اللہ رکھے عید کے چاند تیئیسواں بھرے گا۔"

"ہاں بی" بیگم نہال نے جواب دیا "مجھے تو اب اس کا گھر بسانے کی فکر کھائے جاتی ہے۔ تمہارے ابا کو تو کوئی فکر ہے نہیں کئی بار اس کے رشتے کے بارے میں کہہ چکی ہوں۔"

"تو پھر ابا کیا کہتے ہیں آخر؟"

"ایک دن میں نے ان سے ذکر چھیڑا تھا۔ وہ جواب دینے ہی والے تھے کہ موا سانپ نکل آیا اور بات آئی گئی ہوئی۔"

"کیا تم نے کوئی لڑکی ڈھونڈ لی ہے؟" وحیدہ بیگم نے پوچھا۔

"لو، ڈھونڈنے کا کیا سوال، اصغر کی مونچھوں کے کونڈے بھی نہیں ہوئے تھے جب ہی سے میری نظر میں ایک لڑکی ہے۔"

"تو یہ کہو۔ ہمیں تو اس کی بھنک بھی نہیں دی۔ کتنے کی ہے یا غیروں میں؟"
بیگم نہال فخریہ بولیں: "اے غیروں کی کیوں ہوتی۔ بھائی نصیرالدین کی چھوٹی لڑکی لئے ہیں۔ ایمان کی بات تو یہ ہے ثریا کے آگے مجھے کوئی لڑکی نہیں جچی۔ اس کے سامنے سب پانی بھرتی ہیں۔"
حمیدہ بیگم نے یہ سن کر ذرا تامل کیا اور پھر ماں سے بولیں:
"اماں یوں تو لڑکی نک سک سے درست ہے پر اصغر کے جوڑ کی نہیں ہے۔"
بیٹی کے جملے پہ بیگم نہال چونک پڑیں۔ اپنے انتخاب پر اعتراض کی توقع انھیں بیٹی سے نہ تھی اور وہ بولیں:
"کیوں بھئی آخر جوڑ کیوں نہیں ہے؟ ذرا میں بھی سنوں، ڈھنگ، سلیقہ، سگھڑاپا، اور کیا چاہیے؟ ایسی لڑکی کسے نصیب ہوتی ہے؟ اصغر خوش رہے گا۔"
تیوروں سے قائل ہو چکے تھے۔ انھوں نے دلچین کو پکارا:
"اری دلچین ترکاری بن گئی۔ لے جا۔" پھر بیٹی سے مخاطب ہوئیں۔ "میں تو چاہتی ہوں اس نیک کام میں اب دیر نہیں ہونی چاہیے۔ کوئی شبھ گھڑی دیکھ کر پیام بھیج دیتی ہوں۔ آج تمہارے ابا سے بھی پوچھ لوں گی۔"
وحیدہ بیگم چپ چاپ ماں کی باتیں سنتی رہیں۔ طرح طرح کے خیالات ان کے ذہن میں آرہے تھے۔ کبھی اصغر کی پسند کا کبھی اماں کی خفگی کا۔ آخر کار وہ کہنے لگیں۔
"بھئی اماں لڑکی کہیں بھاگی تو جاتی نہیں۔ ابھی اصغر کی عمر ہی کیا ہے۔ اس معاملہ میں جلد بازی اچھی نہیں۔ اور پھر مجھے تو شبہ ہے کہ اصغر کو وہ خوش نہیں رکھ سکے گی۔"
بیگم نہال کو اتنا سننا تھا کہ تلووں لگی سر کو جا کے بجھی۔ جھنجھلا کر بولیں:
"لو، اور سنو تم بھی جب بولوگی اپنے باوا کی طرح الٹی ہی کہو گی۔ آخر

خوش کیوں نہ ہوگا اس سے ؟ تم لوگوں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ ہر ایک میں مین میخ نکالا کرتے ہو۔ آپا کو معراج نہیں پسند، بہن کو ثریا۔ کوئی بھاوِیں ہی نہیں آتا۔ بھلا مجھے بھی تو بتاؤ ثریا میں آخر کونسا عیب ہے ؟ لنگڑی ہے، لولی ہے، کانی ہے ؟ اب سُرخاب کے پر تو لگنے سے رہے۔ ہاں سو عیبوں کا عیب یہ ہے کہ میری بھتیجی ہے۔ اور تم لوگوں کو میرے میکے والوں سے اللّٰہی بیر ہے۔"

وحیدہ بیگم مناتے ہوئے بولیں:

"اماں تم تو ناحق خفا ہوگئیں۔ اللہ جانتا ہے میرا مطلب یہ نہیں ہے وہ لاکھ اچھی سہی مگر کوئی خاص بات بھی تو نہیں ہے۔ بس آدمی کا بچہ ہے۔"

بیگم نہال نے ٹکرا توڑ جواب دیا:

"تو تمہارے بھائی کے کونسے لال جڑے ہوئے ہیں۔ جیسے کوہ قاف کی پری ہی تو لائے گا ؟"

"اصغر میں لال جڑے ہوں یا نہ ہوں مگر ہزاروں میں ایک ہے۔ اور پھر اس کی خوشی اور ناخوشی کا بھی سوال ہے۔ اب زمانے کی ہوا پلٹ گئی ہے۔"

بیگم نہال نے ناگواری سے جواب دیا:

"آخر تمہارے بڑے بھائیوں کی جو بیویاں اپنی پسند سے لائی ہوں تو کیا ان کی خوشی ناخوشی نہ تھی، مگر دیکھ لو آج تک مجھ سے تو کسی نے کبھی کوئی شکایت نہ کی، بلکہ میں تو یہ دیکھتی ہوں کہ جوروؤں پہ دموں دیوانے ہیں۔ تینوں دلہن کی نازبرداریاں اور بیسوں گھڑی کے چاؤ چونچلے۔ بالکل بن داموں کے غلام ہو کر رہ گئے ہیں۔"

وحیدہ بیگم نے دوپٹہ سمیٹ کر الگ رکھ دیا اور ماں کو دیکھنے لگیں۔ بیگم نہال کی پیشانی کے تینوں بل غصّے سے زیادہ اُبھر آئے تھے۔ پھر لجاجت سے ماں سے کہا:

"اے بی اماں برا نہ مانو مجھے تو یہ رشتہ بے جوڑ سا لگتا ہے۔ کہاں ہمارا اصغر نکلتا ہوا قد، کھڑا کھڑا ناک نقشہ، پڑھا لکھا اور کہاں ثریا پھیکا شلجم، بالشت بھر کا ٹھنا قد بھدی بے ڈول، آواز سنو تو بے سُری اور اس پر اُن کا چڑچڑاپن۔ کریلا اور او پر سے نیم چڑھا۔ اصغر کے تو پاسنگ بھی نہیں۔ میں منع نہیں کرتی تم بہو بنالاؤ۔

مگر یہ جوڑ ایسا ہی ہوگا جیسے کمخواب میں ٹاٹ کا پیوند۔"

بیگم نہال نے پٹاری کا ڈھکنا زور سے بند کیا اور بولیں:

"لے بیٹی تم کو آج ہو کیا گیا ہے جو اوندھی اوندھی باتیں کر رہی ہو۔" اور کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "توبہ ہے میری اس گھر میں جس سے بات کرو اُلٹی ہی سنو۔ دُور کیوں جاؤ اپنے آکا بھائی کی دلہن ہی کو دیکھ لو۔ کون سی باون گز کی ہیں۔ بٹوا سی ہیں۔ ماشاء اللہ جیتے جاگتے آٹھ بچے تو جن چکیں پھر بھی کاٹھی جیسے کوارپنے میں تھی، ویسی کی ویسی ہے۔ کوئی اور ہوتی تو جھلنگا ہو جاتی۔"

"مگر شکل تو شہزادیوں جیسی ہے۔" وحیدہ بیگم نے کہا۔

"اے خدا سے ڈرو۔" بیگم نہال نے جواب دیا۔ "یہ تو چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ صورت سب کی خدا نے بنائی ہے، کیا گورا کیا کالا۔ وہ کیا کسی شاعر نے کہا ہے۔ اتنا بھی اپنی حد سے نہ باہر نکل چلے۔"

اور وہ خاموش ہو گئیں۔ لیکن آج وحیدہ بیگم اُدھار کھائے بیٹھی تھیں، دوبارہ کہنے لگیں:

"بات یہ نہیں ہے۔ اصغر کو میں خوب جانتی ہوں۔ بچپن سے میرے پاس رہا ہے۔ اُس کے کل پُرزے مجھے معلوم ہیں۔ جب ہی کہہ رہی ہوں کہ ثریا جیسی لڑکی سے کبھی نہ نبھے گی۔ اس قسم کی لڑکیاں اُسے نہیں بھاتیں۔ یوں تو آپ کی خاطر بلا چون و چرا اپنے سینے پر پتھر کی سِل رکھ کر جس سے کر دو گی کر لے گا۔"

بیگم نہال جھنجھلاتے ہوئے بولیں:

"بیٹی تم نئی روشنی کی ہو جو چاہو سو کہو۔ ہمارے بڑے بڑوں سے تو یہی ہوتی آئی ہے جو لڑکی اماں باوا نے پسند کی، لڑکوں نے آنکھ بند کر کے حامی بھر لی۔ پسند پسند کا جو تم وظیفہ پڑھ رہی ہو جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش، گئے آمدی کے پیر شدی۔ برا بھلا پرکھنے والے ہم، اور تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے میں میّا نہیں بیرن ہوں۔ اس کی مرضی کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔"

وحیدہ بیگم نے جواب میں کہا:

"بہر حال تم کو اس کی مرضی کا ہر حالت میں خیال رکھنا چاہیے۔ فرض کرو تمہاری لائی ہوئی بیوی اس کو پسند نہ آئی تو پھر کیا ہو گا۔ ادھر اصغر کی زندگی وبال ادھر وہ سر پہ ہاتھ دھر کر کرموں کو روئے گی ......"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ڈیوڑھی میں کسی نے پکارا "میں آ جاؤں"، اور یہاں بیٹیوں کی بحث وہیں ختم ہو گئی۔

"کون ہے؟" بیگم نہال نے پوچھا۔

"میں ہوں سعید حسن!!"

"میاں آؤ۔"

سعید حسن اندر آئے۔ پکی عمر، درمیانہ قد، داڑھی بھی کھچڑی ہو چلی تھی، چوگوشیہ ٹوپی اوڑھے ہوئے تھے۔ یہ میر نہال کے داماد تھے مگر دو سال ہوئے ان کی بیوی پہلے جاپے میں مر چکی تھیں اور جب سے ابھی تک رنڈوے ہی تھے۔ سعید حسن بڑے بذلہ سنج اور ہنسنے ہنسانے والوں میں سے تھے۔ طبیعت شگفتہ پائی تھی۔ ہزاروں لطیفے ازبر تھے۔ بڑی سعادت مندی سے ساس کو آداب کیا اور آ کر کمرے میں چاندنی پر بیٹھ گئے۔

وحیدہ بیگم نے بہنوئی سے سوال کیا:

"اے دولہا بھائی ذرا آپ ہی بتائیے آج کل مرد عام طور پر کس قسم کی بیویاں پسند کرتے ہیں۔"

سعید حسن نے مسکرا کر ساس کو دیکھا اور بولے:

"سن رہی ہیں آپ؟ سالی صاحبہ کیا پوچھ رہی ہیں؟ کیا مجھے دولہا بنائیں گی؟ کسی لڑکی نے مٹھائی کھلادی ہے جو مردوں کی پسند اور ناپسند پوچھی جارہی ہے۔"

بیگم نہال خاصی جلی بیٹھی تھیں، کہنے لگیں:

"نہیں میاں، اپنے لاڈلے بھیا کی فکر ہے۔ عرش سے حور لائیں گی۔"

"پھر بتائیے نا دولہا بھائی؟" وحیدہ بیگم نے اصرار سے پوچھا "کیسی بیوی ہونی چاہیے"

سعید حسن ڈاڑھی میں خلال کرتے ہوئے ذرا لطف لے کر بولے:

"بھئی مرد خود ہی سیدھا کہاں ہے۔ اس کی پسند کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ ٹیڑھا ہے۔ اگر مرد کا دل گدھی پر آجائے تو پری کیا چیز ہے۔ اور عورت وہی اچھی جس کو پیا چاہے اور سہاگن کہلائے۔"

پھر ہنس کر بولے:

"لیکن بزرگوں نے کہا ہے اور کتابوں میں پڑھا ہے اور رشی منی کا قول ہے، ایسی عورت کو بیوی بناؤ جو بدمنی ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ تو پستہ قد ہو نہ سراپنچے کا بانس نہ موٹی بھینس نہ انجور کی پھانک، نہ بدشکل ہو نہ پری زاد ......
اب ذرا نکتہ سنو۔ اگر پستہ قد ہوئی تو بچوں کی وہ ریل پیل کردے گی کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ لمبے قد کی ایک دو جھول کے بعد ہی کمان ہو جائے گی۔ اگر موٹی ہوگی تو سرے سے گود ہی ہری نہ ہوگی۔ بدشکل سے ظاہر ہے میاں رات کو ڈر کر چیخے گا کہ چڑیل آگئی اور اگر پری رو زوجہ ہوئی تو تین سو پینسٹھ دن کا خطرہ اور

چاند سلامت رہ جائے تو معجزہ ......"

ان کے جواب میں دونوں ماں بیٹیاں ہنسنے لگیں اور بیگم نہال نے کہا:

"تم اپنی باتوں سے اب بھی باز نہ آؤ گے۔"

"تو ممانی جان میں نے جو کچھ کہا کیا اس میں کوئی جھوٹ ہے؟ حقیقت تو یہ ہے حد سے بڑھی ہوئی تو ہر چیز جان کا روگ ہوتی ہے۔ بس تھوڑی تھوڑی سی خوبیاں ہوں، محبت کرنے والی اور اطاعت شعار لڑکی ہو تو میاں بھی لٹو اور سسرال والے بھی واری صدقے۔"

یہ ان کی عادت تھی کہ جب بولنے پر آتے یکساں بولے چلے جاتے اور متعلق اور غیر متعلق چٹکلے سناتے رہتے۔ شادی بیاہ اور لڑکیوں کے ذکر اذکار میں ان کو خاص لطف آتا تھا۔ شادی ان کے دل کی پوشیدہ تمنا بھی تھی۔ اپنی پہلی بیوی کو بیحد چاہتے تھے پر وہ نیک بخت کوئی بچہ بھی بطور یادگار نہ چھوڑ گئی۔ اب دوسری شادی ہو جانے کی امید لیے بیٹھے تھے کہ کوئی ان کا نام چلانے والا ہو۔ اسی آس میں اپنے سسرال میں بھی پابندی سے آتے تھے، مہرو سے شادی کے خواہش مند تھے اور اپنا پیغام بھی بھجوا چکے تھے، مگر بیگم نہال نے ابھی کوئی جواب نہ دیا تھا۔ دراصل وہ مہرو کو ان سے بیاہنا نہ چاہتی تھیں۔ یہ تو نہیں کہ سعید حسن ان کو پسند نہ تھے بلکہ وہ معراج کی دولت اور اس کے باپ کے بڑے عہدے پر ریجھی ہوئی تھیں۔ ویسے معراج کے مقابلے میں سعید حسن زیادہ معقول تھے اور بذاتِ خود بہت حلیم اور شریف مگر معراج کے والد میر وہاج الدین سے سمدھیانہ بھی تھا۔ وہ وحیدہ بیگم کے چچیرے جیٹھ ہوتے تھے اور یہ پیام وحیدہ بیگم ہی کی معرفت آیا تھا۔ لہٰذا سعید حسن کے پیغام قبول ہونے کے امکانات نہ تھے۔ ماں بیٹیوں کی متفق رائے سے معراج سے پہلے ہی نسبت طے ہو چکی تھی۔ محض رسمی طور سے کہنے والوں کو خبر نہیں کی تھی۔

معراج والوں کو جلدی تھی اور وہ لوگ برابر شادی کے تقاضے کر رہے تھے۔
بیگم نہال پھر پھر کر مہرو کا ذکر اپنے میاں سے اٹھاتیں اور وہ غور سے سنتے یا گول مول جواب دے کر خاموش ہو جاتے۔ اُن کو اپنی اولاد سے بے انتہا اُنس و محبت تھی۔
ایک بیٹی بھوپال میں بیاہ کر ان سے جدا ہو گئی تھی اور اب وہ مہرو کو کسی عنوان دُور پردیس میں دینے کے روادار نہ تھے۔ دنیا کے سرد و گرم دیکھے ہوئے تھے۔ خوب سمجھتے تھے کہ بیٹی پرایا دھن ہوتی ہے اور مہرو سیانی بھی ہو گئی تھی اور اس کو اب اپنے گھر بار کا ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر اصغر کا بھی سوال تھا۔ چونکہ مہرو سے بڑا تھا ان کا خیال تھا پہلے اس کی شادی ہو جائے تو اچھا ہے۔
سعید حسن کے جانے کے بعد ماں بیٹیوں میں اصغر کے متعلق باتوں کا سلسلہ پھر چل پڑا۔ وحیدہ بیگم نے بڑی سیاست سے پہلے تو کنبہ کی کئی اور لڑکیوں کے نام گنوائے جو اصغر کے لیے ثریا سے زیادہ موزوں ہو سکتی تھیں اور پھر دبی زبان سے کہا:
"کیوں اماں بلقیس اصغر کے لیے کیسی رہے گی؟ میرا مطلب بھائی اشفاق کی سالی سے ہے۔ میرے خیال میں تو اصغر کا عین مین جوڑ ہے۔"
بیگم نہال نے تیوری پر بل ڈال کر ناک چڑھائی اور بیٹی کے کہے کو قطعی اہمیت نہ دی اور دیدے پھیر کر بے رُخی سے بولیں:
"ان کا ہمارا کیا میل۔ ہم سید وہ مغل بچے۔"
"لیکن اماں تم خدا لگتی کہو۔ لڑکی ہے بہت پیاری بھولی بھالی اور پھر گھرانا بھی امیر۔"
بیگم نہال نے زِچ ہو کر جواب دیا:
"اے پرے ہٹاؤ۔ موئی دولت کو لے کر کیا چاٹیں گے؟ آخر ہڈی بوٹی

بھی تو دیکھی جاتی ہے۔ وہ مثل مشہور ہے کہ اصل سے خطا نہیں کم اصل سے وفا نہیں
اس پر وحیدہ بیگم نے کہا:

"آخر بھائی اشفاق کی شادی بھی تو وہیں ہوئی ہے۔ اب یہ ذات پات کے ڈھکوسلے چھوڑ دینے چاہئیں۔ دیکھ لو بھابی اشفاق کیسی ہنس مکھ ہیں اور میاں بھی سکھ چین سے ہیں۔"

بیگم جہاں اس وقت سچ مچ خفا ہو گئیں اور تڑاخ کر جواب دیا:

"اشفاق کنوئیں میں گریں تو کیا ہم بھی گر جائیں؟ ان لوگوں کی نہ نسل درست نہ خون۔ بی وحیدہ جب تک میرے سانس باقی ہیں میری دہلیز پر سیدانی کے علاوہ کسی کا ڈولا نہیں آسکے گا۔ تم میری بیٹی ہو کر یہ باتیں کر رہی ہو۔ میرا بیٹا اور مغل بچی! [illegible] استغفار۔ تم پہلے مجھے زہر دے دو پھر اپنے بھائی کے لیے کرستان، فرنگن، چوڑی چمارن جو چاہو لاؤ۔ اور وہ نہیں سنا: مغل کا پوت گھڑی میں اولیا گھڑی میں بھوت۔ میرے جیتے جی یہ ہرگز نہ ہوگا۔"

وحیدہ بیگم نے دوپٹہ پھیلا کر دوبارہ ٹانکنا شروع کر دیا۔ انھیں کوئی معقول دلیل تو نہ سوجھ رہی تھی مگر کہنے لگیں:

"اور بھائی کریم کون سی سیدانی لائے ہیں۔ ان کی بیوی بھی تو مغل ہیں۔"

"اے بیٹی آخر آج صبح تم نے کس کا منہ دیکھا ہے کہ بے سر و پیر کی ہانک رہی ہو۔ معلوم نہ ہو تو آدمی نہ بولے۔ کریم کی دلہن اصل نسل تیموری ہیں شجرے والی۔ نہ نسب میں فرق، نہ خون میں نقص۔ خاص شہزادوں کی اولاد قلعہ والوں میں سے ہے۔ نواب زادی ہے کمبختی! گری پڑی آئی لگائی اولاد نہیں، تو بس لو آج مرزا شہباز بیگ کی بیوی لونڈی کے پیٹ سے ہیں۔ خدا تمہارے سر پر آج بلقیس کیوں سوار ہو گئی۔ اور میرا آپی کا اس وقت کیا ذکر تھا۔ بات اصغر کی شادی کی

ہو رہی ہے اور بیوی پھر بھر سو لہشت کی بنیاد ہو تی ہے۔ ابھی تک تمہارے
ددھیال ننھیال میں سب ہی سید زادیاں آئی ہیں۔ میں بھلا کیسے وہ بھولے آؤں
جس کا خاندان ہی ہمارے میل کا نہ ہو۔ لوگ سب میرے ہی منہ پر تھوکیں گے اور
تھڑی تھڑی کریں گے۔ بس ثریا بالکل ٹھیک ہے۔ اپنا خون۔ دیکھی بھالی۔ کہتے
ہیں گھٹنے پیٹ ہی کی طرف مڑتے ہیں۔"

زمین ہموار ہو چکی تھی۔ وحیدہ بیگم نے موقع محل مناسب سمجھا اور
اپنے ترکش کا آخری تیر چھوڑ دیا:

"اگر اصغر خود ہی بلقیس سے شادی کرنا چاہے تو؟"

اتنا سنتے ہی ماں کا پارہ چڑھ گیا اور جھلا کے بولیں:

"کیسے کر سکتا ہے وہ۔ میں بھی تو دیکھوں۔ مجال ہے اس کی۔ میں جہاں
چاہوں گی وہیں کرنی پڑے گی۔ کیا اسی دن کے واسطے تن چھپا کر بڑا کیا تھا
کہ جب ہمارے ارمان پورے ہونے کے دن آئیں تو ساری کی کرائی پر پانی
پھیر دیں۔ یہ نئی تانتی ہے۔ ٹانگ برابر کے چھوکرے بڑوں کے منہ آئیں۔ بچہ کر لیں
جہاں چاہیں۔ مجھے بھی سیدانی نہ کہنا، نالو چماری کہنا! جو دودھ بخش دیا ہو۔"

بیٹی نے ماں کی خفگی کو نظر انداز کرتے ہوئے پھر زور دیا:

"تم دودھ بخشو یا نہ بخشو وہ تو ٹھانے بیٹھا ہے۔ کہتا ہے کروں تو بلقیس
سے کروں ورنہ۔"

اماں نے بیٹی کی بات کاٹ دی:

"اے بی یہ چھیڑ خانی تو تم اپنی کسی ہمجولی سے کرنا۔"

"نہیں اماں۔ کیا میری یہ مجال کہ تم سے مذاق کروں؟ اپنے ننھے کی
قسم کھا کر کہتی ہوں اس نے تو بلقیس سے شادی کرنے کی ٹھان لی ہے۔ کل ہی مجھ

سے کہہ رہا تھا۔ شیطان کے کان بہرے، کہتا ہے بلقیس سے نہ ہوئی تو جان دے دوں گا۔"

بیگم نہال یہ جملہ سُن کر دنگ رہ گئیں اور چھاتی پیٹ کر بولیں:

"ہے ہے۔ سچ کہو وحیدہ۔ اللہ میری خطائیں بخشیو۔ آج یہ کیا ہونی شدنی سُن رہی ہوں۔ اے لڑکے کی مت ماری گئی ہے۔ باوا کے کان میں پڑ گئی تو کچے ہی کو چبا جائیں گے۔ اوئی کیا بلقیس کو جورو بنا کر باپ دادا کی ناک کٹوائے گا؟ نوج لوا، ایسی بدفالیاں تو جمعرات کے جمعرات نہ نکالو۔ میرا تو سُن کر کلیجہ شق ہوا جاتا ہے۔ چھوڑو اس ذکر کو کوئی اور بات کرو۔"

"مگر اس کی خلافِ مرضی شادی ہوئی تو پھر؟"

بیگم نہال کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ ان کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو ڈبڈبا آئے اور ایک ایک کر کے رخساروں پر بہنے لگے۔ وحیدہ بیگم سر جھکا کر دوپٹے میں زیادہ لمبے لمبے ٹانکے بھرنے لگیں۔ ماں کے رونے سے اُن کا بھی دل بھر آیا تھا اور اُن سے بوڑھی آنکھوں کے وہ آنسو نہ دیکھے جاتے تھے جن میں ماتا، ارمان اور ڈر و خوف سب ہی کچھ تھا۔ بیگم نہال نے طبیعت پر قابو پا کر دوپٹے کے کونے سے آنسو خشک کیے اور کہنے لگیں:

"بیٹی میں تو جب ہی بھانپ گئی تھی جب اس نامراد مُنّو سے میل ملت بڑھ کر مرزا شہباز بیگ کے ہاں آنا جانا شروع ہوا تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ بہتیرا بہلایا پھسلایا، ڈانٹ پھٹکار کی لیکن جانو اُس پر تو جیسے کسی نے اُلّو کی لکڑی پھیر دی تھی۔ وہاں جائے بغیر اسے کل ہی نہ پڑتی۔ تم سے آج یہ سُن کر تو مجھے اب پکا یقین ہو گیا ہے کہ مرزا جی کی جُوروا نے میرے معصوم بچے کو کچھ کھلا پلا دیا ہے یا کوئی جادو ٹونا کروا دیا ہے۔ ہماری جٹھانی صاحبہ بھی تو انھیں کی طرف داروں

میں سے ہیں ۔ انھوں نے تو کہیں کچھ ......"

جمال بیگم اسی وقت کوٹھے پر سے اُتر رہی تھیں۔ جوں ہی اپنا نام سنا دیں پوچھا :

"میرا کیا ذکر تھا دُلہن ؟"

بیگم نہال بھری تو پہلے ہی بیٹھی تھیں، جھلّا کر بولیں :

" اے بی تمہارا نام تو میرے فرشتوں نے بھی نہیں لیا۔ تم تو بھابی جان چلتی ہَوا کے سر ہو جاتی ہو۔"

جمال بیگم صحن میں پہنچ چکی تھیں کہنے لگیں :

" تو کیا میرے کان بج رہے تھے ؟ میں نے خود سُنا ہے۔ دُلہن تمہاری تو وہی کہاوت ہے : یہ بھی کہہ لوں، وہ بھی کہہ لوں، دل کو رکھوں شاد۔ مجھے یہ طرح بھی یاد مجھے وہ طرح بھی یاد۔"

جمال بیگم جیٹھانی تھیں اور بیگم نہال اُن کا لحاظ کرتی تھیں، کہنے لگیں :

" بوا مجھے تڑاخ پڑاخ کرنے کی عادت نہیں۔ نہ میں تمہاری طرح کَن سوئیاں لیتی پھِروں۔ تم کو تو اللہ مارا یہ وہم ہو گیا ہے کہ ہر شخص تم ہی کو برا بھلا کہتا ہے، جیسے دُنیا جہان میں کوئی اور کام ہی نہیں۔"

جمال بیگم تو ترکی بہ ترکی جواب دینے کی ماہر تھیں، بولیں :

"کسی کو کام ہو یا نہ ہو مگر اس وقت میرا نام ضرور لیا جا رہا تھا۔ کچھ نہ کچھ بات تو تھی آخر۔ اب کہتی کیوں نہیں ہو ؟ میں تو خود منہ چھپائے الگ تھلگ اٹریا پر بیٹھی رہتی ہوں۔ نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ پھر بھی جس کو دیکھو مجھ کم بخت سے اللہ واسطے کا بیر، میرے سر میرا اچھی بُری تھوپے جاتا ہے۔ بس صاف بات ہے۔ تم لوگوں کو میرا یہاں رہنا دُوبھر ہو گیا ہے۔ آج ہی ڈولی منگا کر کہیں نکل کھڑی ہوں گی۔ تم کو

مبارک ہو بیوی اپنا گھر۔ جس نے پیدا کیا سر چھپانے کا بھی کر دے گا۔"

بیگم نہال بیزار ہو رہی تھیں۔ کہنے لگیں:

"مہیں ہو کیا گیا ہے آخر۔ کیا رات کو کھرّی چار پائی پر سوئی تھیں؟ زبان پکڑے لیتی ہو۔ بھلا اس وقت کوئی بات بھی ایسی ہوئی جو تم کوٹھے سے اترتے ہی مجھ سے اُلجھنے لگیں۔ میں گھروالی کون۔ خدا تمہارے دیور کے دم کو رکھے تم جانو تمہارے دیور۔ میں نے تم سے آج تلک زبان نہ کی اور تم ہمیشہ گھر کے طعنے تشنے دے کر میرے ہی جی کے لگاتی ہو۔"

"لو سنو تم تو بگڑ گئیں۔ اے وہ کھونٹا ہی نہیں رہا جس پر کود کود کر میں کسی سے مان کر دں۔ کہتے ہیں خصم راج، آپ راج اور پوت راج محتاج راج۔ اپنا تو کوئی سر دھرا نہ نام لیوا اور نہ پانی دیوا۔"

بیگم نہال سمجھ گئیں کہ بھابی جان بات کا بتنگڑ بنانے پر آمادہ ہیں۔ اپنا پنڈ چھڑانے کو یہ کہہ کر اُٹھ گئیں:

"بی مجھے تو للہ بخشو۔ میں تو خود ان دنوں اپنے تئیں سے بیزار ہوں۔" اور باورچی خانہ میں چلی گئیں۔ کھانے کا وقت آ رہا تھا۔ دھوپ سارے صحن میں بھر گئی تھی۔ ڈیوڑھی میں سے میر نہال کے کھنکھار کے اندر آنے کی چاپ سُنائی دی —— وحیدو بیگم سنبھل کر بیٹھ گئیں اور سر پہ دوپٹہ اوڑھ لیا۔ جمال بیگم صحنچی میں جا کر بڑبڑاتی رہیں......

دیوار پہ دو کوّے موری کے پاس پڑی ہوئی ہڈی پہ تاک لگائے گردنیں ہلا ہلا کر کائیں کائیں کر رہے تھے۔

۸

بلا کی گرمی تھی اور غضب کا حبس۔ کئی دن سے اندھیاؤ چڑھا ہوا تھا اور
آسمان تپ کر تانبا ہو گیا تھا۔ لُو کے جھکّڑ چلتے، درودیوار سے لپٹیں نکلتیں اور ذرّے
چنگاریوں کی طرح گرم ہو جاتے۔ ساری فضا چٹیل میدانوں کی طرح ویران اور بے
رونق تھی۔ تیسرے پہر یکایک اِکّا دُکّا چیلیں مغرب سے آتی ہوئی دکھائی دیں پھر
تو اُن کے غول کے غول آنے شروع ہو گئے جو کاوے کاٹتے کاٹتے آسمان پر اونچے
ہوتے چلے گئے۔ تھوڑی دیر تک تو چیلیں حلقہ بنا کر آہستہ آہستہ کاوے کاٹتی
رہیں پھر عین سر پر آگئیں۔ ان کے ایک جگہ جمع ہوتے ہی ہوا کی تیزی ایک دم
بڑھ گئی۔ آسمان زرد پڑ گیا اور مغربی اُفق تانبے کی طرح سُرخ نظر آنے لگا۔ ہوا کا زور
اور بڑھا اور زمین سے گرد کے تنق اُٹھنے لگے۔ پھر تو ریت اِس شدّت سے اُڑنی شروع
ہوئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پوشیدہ اور زبردست طاقت منوں مٹّی بھر بھر کے اُچھال
رہی ہے۔ سورج خاک کی اوٹ میں چھُپ گیا اور ریت کے ذرّے اس کی روشنی میں
انگاروں کی طرح دہک اُٹھے۔ پورا آسمان گہرا نارنجی اور لال ہو گیا۔ چیلیں چلچلاتی

ہوئی مخالف سمت میں بڑھ گئیں

اُن کے جانے کے بعد ہوا ذرا رُکی اور فضا ساکن ہوگئی۔ یہ ٹھہراؤ ایسا ہی تھا جیسے کسی کی پیدائش سے پہلے ہوتا ہے لیکن اس کے بعد تو وہ زوردار آندھی چلنی شروع ہوگئی کہ اللہ کی پناہ۔ ہوا زنّاٹے بھرتی ہوئی مکانوں، چھتوں اور درختوں سے ٹکرانے لگی۔ آندھی کے بھرپور جھکڑوں سے کھڑکیاں اور کواڑ دھڑ دھڑ کرنے لگے۔ در و دیوار اس طرح ہل گئے جیسے کوئی ان کو جھنجھوڑ رہا ہو۔ جوں جوں طوفان کی تیزی و تندی بڑھتی گئی۔ ٹین کی چھتیں اور سائبان بجنے لگے اور چیزوں کے گرنے اور برتنوں کے لڑھکنے کی آواز نے آندھی کے غرّاٹے میں اور بھی وحشت پیدا کر دی۔

چڑیاں مہندی کی شاخوں میں سمٹ کر دُبک گئیں۔ آفت کا مارا ایک کوّا کھجور کے پتّوں کو پنجوں سے دبوچے ہوئے سکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ آسمان پر چڑھا ہوا گرد و غبار زمین پر ایسے برس رہا تھا جیسے ایک ٹڈّی دَل سبزہ دیکھ کر اُتر آتا ہے۔ مہندی کا درخت جھکولے کھاتا اور اُس کی پتیاں جھڑ جھڑ کر ہوا میں اُڑ جاتیں۔ کھجور اس طرح چرچر کرتی جیسے اب وہ گر جائے گی، اور دُوہری ہو ہو کر چھت تک جُھک جاتی۔ ریت کمروں میں بھر گیا اور آنکھوں میں گھُسنے لگا۔ ہر طرف ریت ہی ریت تھا اور سفید چاندنی پر اُنگل اُنگل بھر تہہ بچھ گئی۔ سورج چھُپ گیا اور روشنی غائب ہوگئی، حتیٰ کہ چاروں طرف اندھیرا ہوگیا۔ مٹی اور خاک سے فضا اتنی مکدّر ہوئی کہ سانس لینا بھی دشوار ہوگیا اور دم گھٹنے لگا۔

بیگم نہال نے مہرو، مسرور اور بچّوں کو کمرے میں بلا لیا۔ دلہین جلدی جلدی انگنائی میں بکھرے ہوئے کپڑوں کو سمیٹنے لگی۔ جمال بیگم اور اُن کی بھاوج کوٹھے پر سے نیچے اُتر آئیں اور سب نے مل کر دالان والے شہ نشین میں پناہ لی۔ کمرے میں گھُپ اندھیرا تھا اور ہوا کا غنّاٹا اور بھی زور سے سنائی دیتا تھا۔

"خدا کے لیے کوئی پائے کے نیچے جھاڑو تو دبا دو۔" بیگم جمال نے چیخ کر کہا: "کالا منہ اِس آندھی کا۔ معلوم ہوتا ہے قیامت ابھی سے آگئی۔" اور وہ زور زور سے جل تو جلال تو پڑھنے لگیں۔

"ارے کسی نے مجید کو بھی دیکھا ہے؟" بیگم نہال نے پوچھا۔

اتنے میں دلچین لالٹین لے آئی اور سب کی جان میں جان آئی۔

"میں یہ رہا نانی جان!" وحیدہ بیگم کے بیٹے نے کہا اور جُھک کر چھپر کھٹ کے پائے کے نیچے جھاڑو دبانے کی کوشش کرنے لگا۔ بھلا آٹھ برس کے بچّے کی کیا بساط تھی جو چھپر کھٹ کو اُٹھا سکتا۔ دلچین نے جاکر سہارا دیا۔

بیگم نہال نے آیۃ الکرسی کا حصار کھینچ کر زور زور سے تین تالیاں بجائیں۔

وحیدہ بیگم کی بیٹی رُقیہ سر کھلی بیٹھی تھی، انجم زمانی بولیں:

"اے بنّو سر تو ڈھک لے۔ کوراپنڈا اُدھر پڑے کہیں کسی کا ایسا ویسا سایہ نہ پڑ جائے۔"

وحیدہ بیگم نے مجید کو اپنے پاس بٹھا کر دوپٹہ میں لپیٹ لیا تھا اور نظر گزر کے ڈر سے پھونک پھونک کر دم کر رہی تھیں۔ بچّہ ان باتوں سے اکتا گیا اور مہرو سے پوچھنے لگا:

"خالہ جان یہ جھاڑو کیوں دباتے ہیں؟"

"بڑے بوڑھے کہتے چلے آئے ہیں کہ جھاڑو دبانے سے آندھی اُتر جاتی ہے۔"

رُقیہ بولی:

"معلوم ہوتا ہے جنّاتوں کے بادشاہ کی برات جا رہی ہے۔"

اور مجید ماں کے پہلو سے نکل کر جنوں کی برات کا تماشا دیکھنے باہر جانے لگا جمال بیگم کانوں میں اُنگلیاں ٹھونسے بیٹھی تھیں فوراً لتاڑا:

"لڑکے تیرا دماغ تو نہیں چل گیا؟ باہر جاکر تو دیکھ۔ تیری ٹانگیں توڑ ڈالونگی"
بچہ تو وہیں کا وہیں ڈر کر بیٹھ گیا، اور جمال بیگم ہے پر دو ہتڑ مار کے نئے زمانے کا رونا رونے لگیں؛

"آجکل کی پود کے دیدے پھٹ گئے ہیں۔ توبہ ہے میرے گناہوں کی۔ دیدہ دلیری تو دیکھو۔ نہ آندھی سے ڈریں، نہ مینہہ سے......"

جسم خاک سے اَٹ گئے۔ پسینہ میں مٹی اور کاٹنے لگی۔ دانتوں میں رہ رہ کر کرکرہ ہوتی اور بال ریت سے اُلجھ کر مکڑی کا جالا بن گئے۔

خدا خدا کرکے آندھی کا زور ٹوٹا اور کچھ دیر میں چلنی بند ہوگئی، گو ابھی تک اندھیرا اور گرد و غبار باقی تھا۔ سب اندر بیٹھے ہوئے روشنی کا انتظار کر رہے تھے۔ طوفان تھمتے ہی بیگم نہال کو اصغر کا خیال آگیا اور بیٹی کے قریب کھسک کر کان میں کہا:

"مجھے تو اصغر کی طرف سے فکر ہوگئی ہے۔ بُرے بُرے وسوسے دل میں آتے ہیں۔ بیٹی مجھے تو کچھ بن نہیں آتی۔ تم ہی کچھ سوچو"

وحیدہ بیگم بولیں:

"اماں تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں تو خود دھکیہ میں ہوں اور ہر دم یہی دھڑکا رہتا ہے کہ اس کے دشمن کہیں کچھ کر نہ بیٹھیں۔ بچپن کا ہٹیلا ہے۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر کیسا کیسا مچلتا تھا، اور جب تک من مانی کروا نہ لیتا ضد کرتا رہتا تھا اور اماں سچ تو یہ ہے کہ اس کا نصیبا بھی خراب ہے۔ سوچو تو اس کے کون سے ارمان نکلے ہیں...."

* * * * * *

دوسرے کونے میں جمال بیگم حسب معمول شکایت کر رہی تھیں:

"اللہ میاں کو بھی تو دیکھو کوئی کام ہی نہیں رہا۔ آئے دن نت نئی آفتیں

توڑتے رہتے ہیں۔ کچھ نہیں تو آندھی چلادی۔

"ہے ہے آپا تم کو کیا ہو گیا ہے۔ تمہاری زبان ہے کہ کسی طرح نہیں رُکتی۔ اب اللہ میاں کے سَر ہو گئیں۔" انجم زبانی نے ٹوکا.....

"جب آندھی آتی ہے تو کیا ہوتا ہے۔" مجید کی آواز آئی۔

"بزرگوں کا کہنا ہے جب جن بیاہ رچاتے ہیں تو اُن کی برات آندھی پانی کے ساتھ جاتی ہے۔" کسی نے جواب دیا۔

"لیکن ہمیں تو کوئی برات دکھائی نہیں دیتی، جن کون ہوتے ہیں؟" مجید نے پوچھا۔ بیگم جمال نے بیٹھے بیٹھے پھر للکارا:

"بس کر چھو کرے۔ للّو کا تانتا ہی ٹوٹ گیا۔ ہر بات پوچھ پوچھ کر ناطقہ بند کر دیا، یہاں مارے ہولوں کے دم ہوا ہُوا جاتا ہے۔" اور وہ جل تو جلال تو اور زور زور سے پڑھنے لگیں۔

انجم زبانی نے مجید کے سوال کا جواب دیا:

"چندا وہ بھی ہماری تمہاری طرح اللہ کی مخلوق ہیں۔ ہمیں مٹی سے بنایا ہے اُنھیں آگ سے۔"

"پھر تو وہ جلتے ہوئے ہوں گے۔"

"نہیں بیٹا وہ جلتے ہوئے نہیں ہوتے۔ ہم اُن کو چھو تھوڑی سکتے ہیں۔"

"کیا وہ بُرے ہوتے ہیں؟"

"ان میں سے جو کافر ہیں وہ غصّے ور اور بُرے ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر تو ہماری تمہاری طرح مسلمان ہیں اور کسی کو نہیں ستاتے......"

بیگم نہال چپکے چپکے کہہ رہی تھیں:

"مجھے تو باپ بیٹوں کی ضد دیوانہ کر دے گی۔ میرا مولا جانتا ہے کہ راتوں

کی نیند حرام ہے۔ تم ہی تدبیر بتاؤ میں کیا کروں۔ نہ اصغر سنتا ہے نہ تمہارے ابا مانتے ہیں۔ جب بھی میں نے کہا اُلٹے مجھ پر لال پیلے ہو کر دیدے نکالنے لگتے ہیں۔ بھلا وہ کیسے راضی ہو جائیں گے۔ جب ہوئے بُندو سے اصغر کی دوستی ہی انھیں ایک پَل گوارا نہیں......"

"بس تو پھر لڑکے سے ہاتھ دھو بیٹھو۔" وحیدہ بیگم مایوسی سے بولیں:
"آخر ہوگا کیا اِس ضدم ضدّا کا نتیجہ؟" اور دونوں چپ ہو گئیں...... تھوڑی دیر بعد بیٹی نے کہا:

"اماں تم کسی نہ کسی طرح ابّا کو راضی کر لو نا؟"

"بیٹی کہنا آسان ہے کرنا مشکل۔ اپنے ابا کا مزاج تم کو معلوم ہی ہے۔ بھڑوں کے چھتے کو چھیڑتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ذرا میں زمین و آسمان ایک کر دیں گے۔"

باہر گرد کے بادل چھٹنے شروع ہو گئے تھے۔ تھوڑا تھوڑا اُجالا ہونے لگا اور لالٹین کی روشنی پھیکی پڑ گئی۔ بیٹی نے اصرار کیا:

"اماں اصغر کی جان کی خاطر کوئی نہ کوئی جتن تو کرنا پڑے گا اس کے دشمن زہر وہر نہ کھالیں۔"

ماں نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور کہنے لگیں:

"ہاں بی۔ اوکھلی میں سَر دیا ہے تو موسل کا کیا ڈر۔ دیکھو۔ بچّے کی خاطر اپنی سی تو کروں گی......"

دھوپ نکل آئی تھی اور ہر چیز صاف دکھائی دینے لگی۔ دلچین دم سادھے ماں بیٹی کی کانا پھوسی سُن رہی تھی۔ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی بولی:

"کالا مُنہ آندھی نگوڑی کو اسی وقت آنا تھا۔ میرا تو پکا نا رینڈھنا پڑا ہے۔"

اور اُس نے اُٹھ کر دَروازے کھول دیے۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ لالٹین گُل کر دی گئی۔ گو خاک اتر چکی تھی لیکن مطلع پوری طرح صاف نہ ہوا تھا۔ سقّے نے پکارا "مشک آئی ہے" اور لال اندھیری مُنہ پر ڈال اندر آ کے گھڑونچی پر رکھے ہوئے مٹکوں میں جن کے پیندے کائی سے سبز ہو رہے تھے، پانی بھر دیا۔ سب اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ جمال بیگم اور انجم زمانی کوٹھے پر چلی گئیں۔ مجید باہر آ کر آسمان کو غور غور سے دیکھ رہا تھا۔ جنوں کی اسے ابھی تک جستجو تھی۔

۹

جیٹھ کا مہینہ تھا العطش گرمی پڑ رہی تھی۔ صبح سے لو چلنی شروع ہو جاتی اور دوپہریں اس قدر سنسان ہوتیں کہ زندگی کی سنگینی اور بڑھ جاتی۔

بیگم نہال نے جب سے اصغر کے زہر کھا لینے کا بیٹی سے سنا تھا مارے ہَولوں کے سہمی جا رہی تھیں۔ ایک پھانس تھی کہ رہ رہ کر سینے میں کھٹکے جاتی اور ایک غم تھا جو اُن کو کھائے جاتا تھا۔ وہ تمام وقت کھوئی کھوئی بے زار سی بیٹھی رہتیں۔ دِلچین آکر پوچھتی:

"کیا پکے گا بیوی؟" ـــــ تو بے دلی سے کہہ دیتیں کہ "جاکر وہ حمیدہ بیگم سے پوچھ لے" ـــــ اور پھر اپنی اُدھیڑبُن میں لگ جاتیں۔ لیکن گتھی وہ اُلجھی تھی کہ اُن کے سلجھائے نہ سلجھتی۔ منصوبے بناتیں، توڑ دیتیں، حل ڈھونڈتیں اور مایوس ہو جاتیں۔ کسی طرح یہ بیل منڈھے چڑھتے نہ نظر آتی۔ وہ اصغر کو ویسے بھی بہت چاہتی تھیں اور میر نہال جو اس پر سخت گیری کرتے تھے اس کی وجہ سے وہ ان کا اور لاڈلا ہو گیا تھا۔ اور ان کو یہی خیال تھا کہ اُس کے ساتھ ہمیشہ زیادتی

ہوئی ہے۔ اس کی ہر خواہش ناتمام ہی رہی۔ اب وہ اس کی حسب منشا شادی کرکے بد قسمتی کا ازالہ اور گزشتہ بے پروائیوں کا تدارک کرنا چاہتی تھیں۔ اولاد کی مصیبتیں، ان کے رنج وملال، ایک ماں کا دل خوب سمجھتا ہے اور وہ بھی اپنی ممتا سے مجبور تھیں۔ ان کے بس کی بات ہوتی تو اسی وقت کھڑے کھڑے ہاتھ پکڑ کر اصغری کی من بھائی دُلہن لے آتیں۔ مگر بغیر باپ کی رضا کے یہ کس طرح ممکن تھا؟ پھر ان کو نظر انداز بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ چاہتی تھیں کوئی تدبیر غیب سے نکل آئے چوبیسوں گھڑی وظیفہ وظائف کا وِرد ہوتا۔ راتوں کو جب سارا عالم سوتا تھا یہ سجادے میں گڑ گڑا کر بیٹے کی سلامتی اور اس کی مراد بر آنے کی دعائیں مانگتیں علی مشکل کشا کا دونا اور علی اکبر کا سہرا، سب ہی منتیں مان رکھی تھیں میاں سے ڈرتی تھیں اور رُو بہ رُو بات کرتے ہوئے ہمیشہ کتراتی تھیں اور اب تو اس فکر میں گھلی جا رہی تھیں کہ اگر انھوں نے انکار کر دیا تو پھر کیا ہوگا؟ اُٹھتے بیٹھتے وحیدہ نے کہہ کہہ کر بہتیری ہمت دلائی اور کچھ ممتا کے جوش نے ابھارا تو انھوں نے بھی سوچ لیا، جو ہونا ہے فیصلہ ایک دفعہ ہی ہو جائے۔ بات کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔ آخر کار آندھی کے اگلے ہی روز انھوں نے میر نہال کو اندر بلوا بھیجا۔

میر نہال اندر آئے اور بیوی کے پاس بیٹھتے ہوئے بولے:

"کیوں خیر تو ہے؟ سویرے سویرے میری طلبی کیسے ہوئی؟"

"تم کو تو قسم ہے خود کبھی گھر کی خبر ہی نہیں لیتے۔"

"آخر میں کیا کروں۔ کیا ہنڈیا ڈوئی لے کر بیٹھ جاؤں؟"

"تمہاری باتیں تو سدا عجیب ہوتی ہیں یا اِس پار یا اُس پار۔"

میر نہال زیرِ لب مسکرائے اور شگفتگی سے بولے:

"تو پھر فرمائیے جناب کا مطلب، مدعا، مقصد۔ کیوں غلام کو حاضری کا

حکم ہوا تھا؟"

بیگم نہال نے میاں کو خوش دیکھ کر فائدہ اُٹھایا اور کہنے لگیں:

"اب تو بڈھے طوطے ہو گئے۔ جوانی میں کب میرا مدعا مطلب پوچھا تھا، بس میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ یہ موئی کبوتر بازی چھوڑ دو۔"

میر نہال بے ساختہ ہنس پڑے۔

"لو اتنی سی بات تھی۔ تم بھی کمال کرتی ہو۔ کسی بچّے کے ہاتھ کہلوا دیا ہوتا مجھے خواہ مخواہ بلوایا۔ مگر میرے کبوتر تمہارا کیا لیتے ہیں؟"

"موئی بلّیوں نے اِس گھر کا رَستا دیکھ لیا ہے۔ رکھاڑ معکا چٹ کر جاتی ہیں۔"

"تو تم بھی ایک کُتّا کیوں نہیں پال لیتیں؟"

"اے لو نج! پالے میری بَلا۔ جہاں کُتّا ہو وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔"

بیوی کی باتوں پر وہ ہنستے ہوئے جانے کو اُٹھے، لیکن خلاف معمول بیوی کا سنجیدہ چہرہ دیکھ کر پھر بیٹھ گئے، اور نرمی سے کہا:

"تم کچھ فکرمند نظر آ رہی ہو؟ آخر کیا بات ہے؟ مجھ سے کہو نا۔"

بیگم نہال بولیں:

"بات تو کچھ بھی نہیں بس اصغر کے بیاہ کے متعلق پوچھنا چاہتی ہوں کبھی تم نے سوچا بھی۔ اللہ رکھے جوان ہو گیا ہے۔ اس کا بھی گھر آباد کرنا چاہیے۔"

"کہتی تو ٹھیک ہو۔"

"ہاں مگر تم تو آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھو نہ پوچھو۔ نگوڑے کبوتروں سے تم کو فرصت ہی نہیں ملتی جو بچّوں کا خیال آئے۔" ——— میر نہال نے

جواب دیا:۔

"جب تم مجھ سے زیادہ فکر کرنے والی موجود ہو تو پھر مجھے فکر کی کیا پڑی ہے۔ دوسرے بیٹوں کی بھی تم نے شادیاں کی ہیں۔ آخر اب کیا نئی بات ہو گئی۔ اصغر کے لیے بھی ڈھونڈ لاؤ۔ لڑکی دیکھنا دکھانا عورتوں کا کام ہے۔ میں نے کبھی دخل دیا ہے؟"

"میں نے تو ڈھونڈ لی ہے، مگر تم باپ ہو اور تمہاری مرضی بھی ضروری ہے۔ اب تمہارا عندیہ معلوم ہو جائے تو کنبہ کا منہ میٹھا کر دوں۔"

"کونسی صاجزادی کا انتخاب ہوا؟"

اس سوال پر بیگم نہال دل کڑا کر کے بولیں:

"مرزا شہباز بیگ کی منجھلی لڑکی کیسی رہے گی؟"

"یہ مذاق تو رہنے دو۔ میرے خیال میں نصیر الدین کی لڑکی موزوں ہے۔ رُقعہ بھیج دو۔"

بیگم نہال کی آنکھوں میں پریشانی جھلکنے لگی اور وہ فکر مندی سے بولیں:

"بھلا مجھے مذاق کی کیا پڑی ہے؟ سچ سچ کہہ رہی ہوں تم سے۔"

"کیا کہا؟" میر نہال نے تعجب سے پوچھا۔

آج وہ بھی تُلی بیٹھی تھیں کہ معاملہ اِدھر ہو یا اُدھر۔ کہنے لگیں:

"یہی کہا ہے کہ مرزا شہباز بیگ کی بیٹی کیسی ہے۔ بھائی نصیر الدین کی لڑکی تو اصغر کو سرے سے پسند ہی نہیں۔ وہ تو بلقیس سے کرنی چاہتا ہے، کسی اور سے بھی کرنے کو تیار نہیں۔"

میر نہال برہم ہو گئے مگر غصہ کو ضبط کرتے ہوئے فیصلہ کُن لہجہ میں جواب دیا:۔

"کیسے کر سکتا ہے وہ! کیا دیوانہ ہوگیا ہے۔ یہ تو قطعی ناممکن ہے!"
یہ سنتے ہی بیگم نہال کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ لیکن بیٹے کی محبت نے اُن کو نڈر بنا دیا تھا اور وہ جنگ کے لیے پوری طرح آمادہ تھیں۔ وثوق سے کہنے لگیں:

"آخر اس میں حرج کیا ہے، ڈھنگ، گُن، صورت، سب طرح اچھی ہے۔"
میر نہال کو تو اب تاب نہ رہی غصے سے خون کھولنے لگا۔ کان سُرخ پڑ گئے، معلوم ہوتا تھا بھری محفل میں کسی نے ان کی ٹوپی اتار لی ہے۔ جھلّا کر بولے:
"بیشک اس میں کوئی حرج نہیں! اپنے صاحبزادے کے ساتھ تمہاری عقل بھی چَرنے چلی گئی۔ میرا بیٹا، میر کمال کا پوتا اور شہباز مرزا کی بیٹی کو جورو بنائے اور اماں جان بڑی سُرخرو بن کر خود اس کی سفارش میں پیش پیش۔ بھٹکار ہے۔ غیرت ہو تو چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنے کی جا ہے۔ آخر میری عزّت کا تو کچھ پاس کرو۔ زمانے نے اور کچھ نہیں چھوڑا، ایک عزّتِ سادات لیے بیٹھے ہیں وہ تو رہنے دو۔ اصغر سے زیادہ مجھے تم پر حیرت ہے کہ اس بڑھاپے میں اوندھی اوندھی باتیں کرتی ہو۔ نہیں، یہ رشتہ ہرگز نہیں ہو سکتا......"

گلی میں اُپلے والا آواز لگا رہا تھا: "کنڈے لو جی کنڈے ایندھن کو!" ایک گدھا اچانک بے سُری آواز سے رینکنے لگا اور دوسرے گدھے نے بھی اس کی آواز سُن کر اس کی ڈھینچوں ڈھینچوں میں سُر ملا دیا......
بیگم نہال کو اپنی شکست کا پورا اندازہ تھا لیکن وہ بھی جھکنے کے لیے تیار نہ تھیں۔ کہنے لگیں:
"آخر چراغ پا ہونے کی کیا بات ہے۔ کوئی رنڈی منڈی بیسوا سے تو نہیں کر رہا جو تمہاری ناک کٹے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ جس کی شادی ہو رہی ہے

اس کی مرضی بھی تو دیکھنی لازمی ہے۔"

میر نہال کے پندار، حمیت اور شرافت کو ایسا دھچکا لگا تھا کہ اُن کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ وہ آگ بگولہ ہو رہے تھے۔ بھنّا کر بولے:

"بس کرو۔ اب میں اس سے زیادہ نہیں سن سکتا۔ کان کھول کر سُن لو یہ رشتہ مجھے سراسر نامنظور ہے۔ پہلے ہی تم کو منع کیا تھا کہ اصغر کا اس کم ظرف بندو سے ملا ملا نہ ہونے دو۔ مگر تم نے میرا کہا نہ مانا بلکہ چھپ کر اس کی حمایت میں بولیں۔ مجھے تو انجام معلوم تھا کہ اس سے دوستی رنگ لائیگی اور تمہارے صاحبزادے یہ ہی گُل کھلائیں گے۔"

"اے اس نے تو کوئی گل وُل نہیں کھلائے۔ اپنی جوانی کے دن ذرا یاد کرو۔"

"اجی سب یاد ہے۔ اس طرح دل کو ہتھیلی پہ لئے کر نہیں پھرے تھے کہ باپ دادا کے نام پر بٹّہ لگ جائے۔"

"اے بس کرو۔ تم نے کون سی کسر چھوڑی تھی۔ آج تک میرا کلیجہ چھلنی ہے اور ایمان کی تو یہ ہے کہ تم نے اس کے ساتھ سراسر ظلم کیے۔ اس کی ہر خواہش کو ٹھکرا دیا۔ علی گڑھ پڑھنے جانا چاہتا تھا تم نے ہی جانے نہ دیا اور وہ غریب دل مسوس کر رہ گیا۔ تمہارے حکم کے سامنے اُف تک نہ کی۔"

"اجی علی گڑھ جانے دیتا تو صاحبزادے وہ کینچلی بدل کر لاٹ بہادر اور دہریے بنتے کہ تمہیں کو سانپ کا سا پھن دکھا کر کہتے لے دیکھ میری ذات صورت دیکھنے کو ترستیں۔"

"بھلا تھا صورت کو ترستی۔ یہ رات دن کا جلا پا تو نہ ہوتا۔ تم تو دن بھر کبوتر بازی کرو، رات گئے گھر میں گھسو، تم کو کیا خبر۔ اندر ہی اندر وہ گھل کر کانٹا ہو گیا اور ماں بندی ٹکر ٹکر دیکھتی ہے۔"

"ایسی باتوں کے یہی نتیجے ہوں گے"

"کونسی باتیں! سیدھے سبھاؤ شادی کرنی چاہتا ہے۔ اپنی پسند کی اللہ رسول نے بھی اجازت دی ہے۔ اس سے ایسی کونسی تقصیر ہوگئی جو تم جھینک بیٹھ رہے ہو۔ مرد وئے ماما اصیلوں سے آشنائی کرلیں وہ اچھا۔ رنڈی کے کوٹھوں پر جائیں، وہ سب روا۔ جب خاندان اور غیرت کہاں اُڑجاتی ہے؟"

جیسے کسی نے دُکھتی رگ کو چھیڑ دیا ہو، میر نہال پیچ و تاب کھاتے ہوئے بولے:

"آخر تم چاہتی کیا ہو۔ دنیا کے سامنے بے آبرو ہو جاؤں، رہی سہی عزت گنوادوں، کسی سے آنکھ ملا کر بات نہ کرسکوں؟ تف ہے ایسی زندگی پر۔ بھٹ پڑے وہ سونا جس سے چھیدیں کان..."

"ثریا ہٹ، بالک ہٹ سنی تھی یہ باوا ہٹ آج ہی دیکھی۔ اور وہ بھی تمہارا اصل نسل بیٹا ہے۔ کہتا ہے کچھ کھا کر جان دے دوں گا"

میر نہال کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ کڑک کر بولے:

"خس کم جہاں پاک"

بیگم نہال بگڑ گئیں:

"گھڑی دیکھو نہ ساعت، کون وقت کیسا۔ تم نے تو پھٹ سے منہ بھر کے کہہ دیا۔ نصیب دشمناں کوئی ناگہانی کر بیٹھا تو تم ہی ہائے کر کے بتاشے کی طرح بیٹھ جاؤ گے۔ فضل الٰہی کو دیکھو لو۔ کلیجہ تھامے تھامے پھر رہے ہیں۔ تمہاری تو ریت ہی نرالی ہے۔ باپ ہونے کا تقاضا تھا کہ غلطی بھی کر رہا ہے تو لیپ پوت دو مگر تم تو بگڑی اور اچھال کر تماشا دکھاتے ہو۔ خدا کی قسم تمہارا برتاؤ سوتیلوں کا سا ہے اس کے ساتھ"

"میرا برتاؤ جیسا ہو تم اچھن اچھن کر لو۔ مگر میں کہے دیتا ہوں میرے جیتے جی اس گھر میں کسی کی نہ چلے گی۔ بد لحاظ کو نہ شرم رہی نہ حیا، نہ پاس خاندان۔ اُس نا ہنجار سے کہہ دینا میرزا جی کی بیٹی سے شادی کرتا ہے تو کر لے میری جوتی کی نوک سے۔ مگر میں بھی عاق کر دوں گا۔ پھر میرا اُس کا کوئی واسطہ نہ ہوگا۔ میرے جنازے میں بھی شریک نہ ہو۔ میں اُس کی صورت تو کیا ہاتھ سے پانی پینے کا روادار نہ ہونگا۔ وہ جانے اس کا کام۔"

"تمہاری طرح ساری دُنیا کوئی باوا آدم سے تو شجرہ ملاتی نہیں۔ اچھے خاصے عزّت دار لوگ ہیں۔ جیسے تم ہی تو ایک ساکھ والے خاندانی رہ گئے ہو۔"

"کیا کالا منہ اور نیلے ہاتھ پاؤں کر کے گدھے پر سوار کرواؤ گی جب ہی سمجھو گی رُسوائی ہوئی۔ لے آؤ مرزا جی کی بیٹی۔ تمہیں کو پاؤں کی جوتی نہ بنایا ہو تو جو چور کا حال سو میرا۔ کہتے ہیں جیسی ماں ویسی جائی، نانی کی خصلت نواسی میں آئی۔"

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے؟" بیگم نہال تن کر بولیں۔

"خواہ مخواہ اپنے ہی بچے سے برائی جتانی کرنے سے فائدہ؟ کہے دیتی ہوں اس کو کچھ ہو گیا تو حشر میں دامن گیر ہوں گی......"

میر نہال جلال میں دندناتے ہوئے باہر چلے گئے۔ گلی میں اُپلے والے کے گدھوں نے راستہ روک رکھا تھا۔ تاؤ میں اس پر برس پڑے: "تیرے باوا کی جاگیر ہے؟" اُپلے والا سیدھا سادا دیہاتی تھا۔ موٹے کھدّر کی نیم آستین اٹنگی بنڈی پہنے تھا اور سر پر ایک میلی پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ میاں جی کو غصّہ میں دیکھ کر جلدی سے ایک ہاتھ سے ناف کھجاتے ہوئے دوسرے سے قمچی مار مار کر گدھوں کو بیچ راستے میں سے ہنکانے لگا۔ جلدی میں ایک گدھا اپنا وزن قایم نہ رکھ سکا اور

گلی کے پتھروں پر پھسل کر دیوار سے ٹکرا گیا۔ سارے اُپلے مونجھ کی کھانس میں سے زمین پر آ رہے تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا اور دھانس میر نہال کی ناک میں گھس گئی۔ وہ چھینکتے ہوئے گدھے والے پر بنکارنے لگے۔ وہ گڑگڑا کر معافیاں مانگنے لگا،

" ایکے تو گھتا ہوئی ماپچی دوسرکار جی غلتی ہوگئی گدھے سے " اور دونوں ہاتھوں سے اُپلے جھول میں بھرنے لگا۔

میر نہال کا غصہ ابھی تک ٹھنڈا نہ ہوا تھا اور وہ بپھرتے ہوئے ایک شیر کی طرح کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگے۔ کبوتر بازوں کی سیٹیاں برابر فضا میں گونج رہی تھیں۔ چیلیں پھر جمع ہونی شروع ہو گئیں تھیں اور آسمان پر گردو غبار چڑھ رہا تھا۔ آندھی کے پورے آثار تھے۔

غفور کا توتا لوہے کے گول پنجرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میر نہال کو دیکھتے ہی اپنے دانے کی کلھیا لُڑھکا کر زور زور سے چیخا: " بولو میاں مٹھو، بولو " اور پھر ٹائیں ٹائیں کا شور مچانے لگا۔ ہر جگہ سکون محال تھا۔ میر نہال توتے پر بگڑ کے بولے:

" کمبخت تو بھی چین نہ لینے دے " اور انگرکھا پہننے لگے توتے نے گردن موڑی اور گول گول دیدے پھرا کر اُن کو تیار ہوتا ہوا دیکھتا رہا۔ جب انھوں نے پاؤں پٹختے ہوئے باہر جانے کو پہلا قدم دہلیز پر رکھا تو توتے نے آدمیوں کی ہو بہو نقل اُتار کر قہقہہ لگایا اور بولا:

" الٰہی تیرا شکر " اتنے میں غفور آگیا اور ایک ہری مرچ اور چنے کی دال اس کی کُلھیا میں ڈال دی جسے وہ ٹیں ٹیں کر کے کترتا رہا مگر آنکھیں پھیر پھیر کر دروازے کو دیکھتا جاتا تھا...

غفور نے اپنا حقہ تازہ کیا اور توتے کو نیا سبق پڑھانے لگا۔

۱۰

اصغر سے بلقیس کی شادی اِس گھر میں اَنہونی اور عجوبہ بات تھی۔ یہ خبر دلچین کے پیٹ میں نہ ٹھہری۔ سویرے سویرے مُسٹک سے کوٹھے پر پہنچ وہ ساری باتیں جو آندھی کے دوران بیگم نہال اور اُن کی بیٹی میں ہوئی تھیں، سب حرفاً بہ حرف جمال بیگم کو سُنادیں۔

جمال بیگم کے دل میں کھدر بدر ہنڈیا سی پکنے لگی۔ کسی نوع وہ ساری حقیقت اپنی دیورانی سے قبلوانا چاہتی تھیں بھتیجے کی شادی سے تو انھیں کوئی سروکار نہ تھا اور نہ گھریلو معاملہ سمجھ کر ہی دلچسپی تھی۔ جو کچھ ان کو چِلبِلک تھی وہ محض اس لیے کہ اشفاق کی شادی بھی جو اُن کا سگا بھتیجا تھا میر نہال کی مرضی کے بالکل خلاف شہباز مرزا کی بیٹی سے ہوئی تھی اور میر نہال اِس موقع پر بہت گرجے برسے تھے اور بھاوج کو کڑوی کسیلی سُنا کر بہت کچھ زہر اُگلا تھا جو اتنی مدت گزرنے کے بعد بھی وہ نہ بھولی تھیں۔ اور اب تو بلّی کے بھاگوں چھینکا خود ہی ٹوٹ گیا تھا اور ان کو جلے پھپھولے پھوڑنے کا بہانہ ہاتھ آ گیا تھا۔ پھر کیوں نہ اُن کے دل

میں لڈو پھوٹتے۔

شام کو وہ کوٹھے پر سے اتریں۔ خلافِ عادت بشاش نظر آ رہی تھیں اور بیگم نہال کو پکارنے لگیں۔

"دلہن! اے بی دلہن! کہاں ہو؟"

"یہ رہی آپا جان!" بیگم نہال صحنچی میں بیٹھی ہوئی کنگھی چوٹی کر رہی تھیں۔

جمال بیگم نے چھوٹتے ہی کہا:

"مبارک ہو دلہن۔ اکیلے ہی اکیلے بات پکی کر لی!"

بیگم نہال ہکا بکا ہو کر جمالی کو دیکھنے لگیں۔

"اے آپا کیسی بات۔ کس کی بات؟" انھوں نے پوچھا۔

"اللہ رکھے اصغر کی اور کس کی۔"

"نہیں بی ابھی کہاں۔ خدا تمہاری زبان کا کہا کرے۔ بس اب تو ایک ہی ارمان ہے کہ اپنی آنکھوں سے اس کی دلہن کی صورت دیکھ لوں اور وہ بھی میرے جیتے جی ٹھور ٹھکانے کا ہو جائے۔ میں مر گئی تو کہاں چپنی میں چون لیے پھرے گا۔ مگر تم سے کس نے کہا؟"

"بھلا مجھ سے کون کہتا۔ نکلی ہونٹوں چڑھی کوٹھوں، دیکھو تو ہم کو بھی خبر ہو ہی گئی۔ اے بوا مجھ سے چھپانے کی کیا بات تھی۔ کیا تمہاری بہو کو اڑا لوں گی؟" جمال بیگم نے طنزیہ کہا۔

"اے بی اڑاؤ گی تو جب جب بہو ہو گی۔ تمہاری تو وہی مثل ہے سوت نہ کپاس کوہو سے لٹھم لٹھا۔"

"بس بی ننھی نہ بنو۔ ہم ہی سے پردہ ہے۔ دنیا زمانے میں ڈنکے پٹ جائیں، دلہن تمہاری یہی باتیں تو زہر لگتی ہیں۔ نوج ہم کوئی تمہارے دشمن ہیں۔ اے جگ جگ جیو

جم جم بہاریں دیکھو۔ آنکھوں سُکھ کلیجہ ٹھنڈک۔"

"اے نام تو لو جس نے تم سے جھوٹ موٹ کی جڑ دی۔ اللہ جانتا ہے ابھی تو اصغر کا رقعہ بھی کہیں نہیں گیا۔ کہیں سُنا ہے بھتیجے کی بات ٹھہرے اور سگی تائی اماں کو خبر نہ ہو۔"

"خیر بی خیر چھوڑو۔ ہم کس گنتی شمار میں ہیں۔"

"آپا جان تو بہ ہے تم تو ایسے کچے کانوں کی ہو گئیں۔ میرا یقین ہی نہیں آتا۔ کالا منہ جس نے کہا دل بُرے کروانے کو کہا۔ اور تم ہو کہ بیر یا ندھے جا رہی ہو...... اچھا لو پان تو کھا لو۔" بیگم نہال نے پاندان جٹھانی کی طرف بڑھا دیا۔

"اے کتھے کی کلھیا تو سوکھی پڑی ہے۔"

صحن میں مہر و مسرور کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ بیگم جمال وہیں سے بولیں:

"اوئی لڑکی دیدے کا پانی ڈھل گیا ہے۔ ہوائی گھوڑیوں کے سے کڈ کڑے لگا رہی ہے۔ چل رے مسرور ذرا کٹورے میں پانی تو لا۔"

انھوں نے پانی پی کر کتھے میں ڈال دیا اور مسرور سے بولیں:

"تیری شامت آئی ہے؟ بڑی بہن سے مُنہ زوری کرتا ہے۔ جا، جا کر سبق یاد کر۔"

بیگم نہال چوٹی گوندھ چکی تھیں اور سفید بالوں کی لڑوں کو بل دے کر سُرخ موباف ڈال لیا تھا۔ بال تھتھکار کے اُگالدان میں ڈال دیئے اور کنگھی پر قل پڑھ کے تلے دانی میں لپیٹ کر رکھ دیا۔ جمال بیگم پھر کہنے لگیں:

"بوا تم لاکھ چھپاؤ میری تو دیکھی بھالی ہے۔ اللہ قسم دسوں انگلیاں دسوں چراغ ہے۔ ایسی کامنی سی بھولی بھالی گڑیا۔ صورت دیکھو تو جی چاہتا ہے دیکھے جاؤ۔ بلقیس اگر آ گئی تو گھر کو چار چاند لگ جائیں گے۔"

بیگم نہال سوچ رہی تھیں جب یہ راز خود ہی طشت از بام ہو گیا ہے تو جٹھانی سے بھی رائے لے لیں۔

"مگر دلہن!" جمال بیگم نے کہا "مجھے تو اچنبھا ہے بھائی نے مان کیسے لیا وہ اُن کی ہاتھ بھر کی اونچی ناک کہاں گئی۔ اشفاق نے مرزا شہباز بیگ کا داماد بن کر ناک کٹوا دی تھی، بیٹے کی جواب اُن ہی مُغلوں میں کر رہے ہیں۔ وہ خاندان، خون اور شرافت اب کدھر گئی؟ سچ کہا ہے کسی نے آسمان کا تھوکا منہ پر آتا ہے"

بیگم نہال خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئیں، کوئی اور وقت ہوتا تو شاید پلٹ کر سنا دیتیں مگر اس وقت تو اُنھیں کی گنی دب رہی تھی۔ ویسے بھی جمال بیگم کی کڑوی کسیلی باتوں کے لوگ عادی ہو گئے تھے۔ اور ان کا کہنا بھی جھوٹ نہ تھا۔ اس لیے بیگم نہال نے کہا:

"اے گڑے مُردے اُکھیڑنے سے کیا فائدہ، جو ہونی تھی سو ہو چکی۔ اُن کا بڑا بول اُنہی کے سامنے آیا اور بُوا اشفاق کی شادی کے جب خلاف تھے تو اب کون سے اصغر کے لیے راضی ہو گئے۔ بلقیس سے خیال تھا مگر تمہارے دیور نے صاف انکار کر دیا۔ ایک دو دفعہ میں نے یوں ہی ذکر چھیڑا۔ اے بیوی وہ تو پنجے جھاڑ کر میرے ہی پیچھے پڑ گئے۔ وہ تو جھوٹوں بھی اس بات کو سننے کے روادار نہیں۔ ان کی زبان پر تو ایک نہیں کے سوا دوسری بات ہی نہیں۔ کہتے ہیں یہ رشتہ ہو گیا تو اصغر کو عاق کر دوں گا۔ مرتے دم تک شکل بھی نہ دیکھوں گا۔" بیگم نہال نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ اس وقت ملال اور مایوسی اُن کے چہرے سے ٹپکی پڑتی تھی۔

جمال بیگم دیورانی کی بات کو کان دھر کے سُن رہی تھیں اور اپنے شکوے اور طعنے بھول گئیں اور خاندانی الجھاؤ کے اس پیچیدہ معاملہ میں ان کو دلچسپی ہو گئی۔

زبان کی بُری سہی پَر وہ دل اور طبیعت کی اتنی بُری نہ تھیں، اور دیورانی کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا:

"تو تم دل میلا نہ کرو۔ کیا مجھے میاں نہال کا مزاج معلوم نہیں۔ ان کا ہمیشہ سے یہی وطیرہ ہے۔ اپنے آگے وہ کسی کی سُنتے ہی نہیں۔ تم اُن کے اقرار انکار کے بھروسے رہیں تو وہ قیامت تک راضی نہ ہوں گے، بس تم بہو کا ارمان لیے بیٹھی رہنا۔ تم کہو گی اشفاق کی سالی ہے اس لیے تعریفوں کے پُل باندھ رہی ہوں۔ مگر لڑکی خدا کی قسم لاکھوں میں ایک ہے۔ دبی دبائی۔ موئی آجکل کی لڑکیوں کی طرح نہیں کہ لونگ چڑیا بنی پھرتی ہیں، چلیں تو ستر گھر ہلیں۔ اس کی ننھیال میں سے کئی پیغام آچکے ہیں۔ مگر شہباز دلہن نے کوئی جواب نہیں دیا ہے۔"

بیگم نہال نے جواب دیا:

"لے بی پرائی چیز اچھی ہے تو ہم کیا۔ ہاں اپنی ہو جائے تو کوئی بات ہے۔"

"اب لڑکی ہوا میں اُڑ کر تمہاری گود میں تو آنے سے رہی۔ بی بہو لانے میں جوتیاں توڑنی پڑتی ہیں۔ تمہارے واسطے اللہ بخشے اماں بی نے دہلیز کی مٹی لے ڈالی تھی۔"

"بی میں تو سر کے بل لڑکی کے گھر جاؤں۔ مگر اصغر کے ابا کا میں کیا کروں؟ اپنی تو وہی کہانی ہے چپ رہوں باوا کتا کھائے بولوں تو ماں ماری جائے۔ باپ کا غصہ ناک پر دھرا ہے اور بیٹے کی جان ہتھیلی پر۔ میری تو عقل دنگ ہے دونوں کی ضد نے باولا کر دیا۔ توبہ ہے زندگی بتنگ ہو گئی۔"

"بی، تم اللہ رکھے پوتا پوتی والی ہو گئیں مگر ہو اللہ میاں کی گائے۔ یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے کہیں کام بنے ہیں؟"

"تو کیا کروں؟ مجھے تو اُن کے خفا ہونے کا ڈر ہے۔ میاں کو ناراض

کرکے نامۂ اعمال میں گناہ لکھواؤں اور دوزخ سمیٹوں؟ ہاتھا پائی کرنے سے تو رہی یا کہو تو روٹھ کر میکے جا بیٹھوں۔ مگر ان باتوں سے وہ کوئی مانیں گے؟"

"اے بی کون کہتا ہے۔ خدا کو دیکھا نہیں عقل سے پہچانا۔ ایک کیا لاکھوں حیلے ہیں کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ شاباش ہے تمہاری ہمت کو کہ بچی کی تو جان کے لالے پڑ رہے ہیں اور تم میاں کے تیور دیکھ رہی ہو۔ غضب خدا کا۔ غصہ نہ ہوا ہوّا ہو گیا جو تم کو کھا جائے گا۔ مرد کے غصے کا کیا ہے کڑھی کا سا اُبال ہوتا ہے۔ چاہے کوکو جلے پر خصم راضی رہے۔ اے بی دلہن ہوش کی دوا کرو۔"

"اچھی پھر تم ہی تدبیر بتاؤ نا۔"

"لو کر دو گی کیا۔ اللہ کا نام لے کر بات پکی کرکے رکھ لو۔ مرزا جی کوئی اپنی بٹیا کو تمہارے نام پر بٹھائے تو نہ رکھیں گے۔ جوان بیٹی سب پر بھاری ہوتی ہے اس وقت میاں کی اجازت کی ضرورت تھوڑی ہے۔ ابھی کون سی پینیس لے کر وداع کروا لاؤ گی۔ جب میاں کا مزاج درست دیکھو اجازت لے لینا۔"

بات واقعی معقول تھی۔ بیگم نہال کے دل کو بھی لگی۔ اور انھوں نے سوچا کہ ایک نہ ایک دن میاں کو ہموار کر ہی لیں گی، فی الحال یہی مناسب ہے کہ چپ چپاتے نسبت طے ہو جائے ورنہ کہیں لیت و لعل میں کبھی دوسرے ملقبیس کو اُڑا لئیں اور وہ ہاتھ ملتی رہ جائیں۔ یہ سوچ کر انھوں نے ایک اطمینان کا سانس لیا اور بولیں:

"آپا جان اس وقت تو تم نے سو باتوں کی ایک بات کہی ہے۔ پریشانی میں میری عقل پر تو پردے پڑ گئے تھے۔"

میر نہال کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی اور اس قدر پیچیدہ معاملہ بالا ہی بالا، باتوں ہی باتوں اس آسانی سے سُلجھ گیا۔

وحیدہ بیگم کہنے لگیں:

"امّاں یہ مُرادن ڈومنی کس دن کام آئے گی؟ اس کے ہاتھ رُقعہ بھجوا دو۔"

"نہیں بی۔ موئی مشاطہ ڈومنیوں کی بات ایسی ہی ہوتی ہے۔ کہیں رنگ میں بھنگ نہ کر دیں۔ میں تو خود ہی جاؤں گی۔ آج بدھ ہے انشاء اللہ جمعہ کو ٹھیک رہے گا۔ کیوں آپا جان، ہے نا؟"

بیگم جمال بولیں:

"ہاں۔ خدا تمہیں چاند سی بہو لانا نصیب کرے۔ خوش رہو۔ پھلو پھولو۔۔۔"

آج بہت دنوں کے بعد ماں بیٹیوں کی آنکھیں خوشی سے مُسکرا رہی تھیں۔

۱۱

اصغر کو ضبطِ شوق کا یارا تھا نہ غمِ فراق کی تاب۔ وہ تھا اور اُس کا دلِ ناصبور۔ صبر و شکیب کا دامن ہاتھ سے چھوٹ کر مایوسیاں بڑھ گئی تھیں۔ کبھی اس کو قسمت کا گلہ ہوتا کبھی خود پر تاسف۔ مگر وہ آگ جو اس کے سینے میں پیہم سلگ رہی تھی کسی صورت دھیمی نہ پڑتی۔ کھانا برائے نام رہ گیا، نیند کی کمی سے آنکھوں میں سُرخ ڈورے پڑ گئے، چہرہ سُت کر سیب سا نکل آیا۔ اس کا جی کہیں نہ بہلتا بندو کے پاس جا کر وہ اور گھبراتا اور وہاں سے اُٹھ کر وہ باری کے ہاں چلا جاتا پر کسک اور بیقراریاں وہی رہتیں۔

ایک دن اُس کو چُپ دیکھ کر باری نے کہا:

"کہو کیا حال ہے پیارے؟ بڑی رونی صورت بنا رکھی ہے۔"

اصغر نے بڑی خشکی سے جواب دیا:

"ارے ہم قسمت کے ماروں کا نہ پوچھو۔ ہم تو روزِ ازل سے تقدیر ہی اُلٹی لے کر آئے ہیں۔"

باری نے ایک قہقہہ لگایا اور اصغر کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا :
"اناں ڈرڈز کی عاشقی نے میاں جی کی چوکڑی بھلا دی۔ ابھی سے دل چھوڑ بیٹھے۔ وہ کیا خوب کسی نے کہا ہے :

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

عاشقوں کو لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں۔ جاؤ بھی یار تم نے تو عاشقوں کی ناک جڑ سے کٹوا دی"

مگر اصغر بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس وقت درحقیقت وہ بہت آزردہ ہو رہا تھا۔ باری بھی بڑی ہمدردی سے اس کی دل دہی کرنے لگا۔
"دیکھو یار! میرا دل کہتا ہے کہ انجام بخیر ہوگا۔ کبھی یاروں کا کہا بھی مان لیا کرو۔ اٹھوائی کھٹوائی چھوڑو شہزادے، کالی کوٹھری میں کب تک پڑے رہو گے یار خاں تو جیو ہتیا کے قائل نہیں۔ چلو اٹھو ذرا باہر چل کر دنیا اور دنیا کے رنگ دیکھو۔ دل بہلاؤ۔ جوانی گئی زندگانی گئی ......"

اصغر بہتیرا انہیں نہیں کرتا رہا مگر باری اس کو زبردستی مشتری بائی کے ہاں لے ہی گیا۔ گرمی زیادہ ہو رہی تھی۔ لو کا جھونکا کبھی کبھار آجاتا تھا تو اور جھلسا کر چلا جاتا۔ آسمان پر گرد و غبار چڑھا ہوا تھا ماہتاب کا چہرہ سورج مکھی کے پھول کی طرح زرد اور مضمحل تھا۔ زعفرانی چاندنی خاک کے باریک ذرّوں میں سے چھن چھن کر درماندہ دنیا پر پڑ رہی تھی۔ تاریک گلیوں اور راہ گزاروں پر محوِ خواب عمارتوں کے سائے پھیکی پھیکی روشنی میں اور پُراسرار معلوم ہو رہے تھے۔

فقیر ابھی تک دروازوں پر کھڑے اور سڑکوں کے کنارے بیٹھے ہوئے صدائیں

دے رہے تھے۔ کہیں کہیں پھول والوں کی لہکار سنائی دیتی تھی اور کبھی کبھار کسی سنسان گلی کے اندھیرے گوشے سے ساقی نکل آتے تھے اور کوئی تشنہ لب ایک دو دم لگا کر رخصت ہو جاتا۔ ایک آدھ بے فکری سے بیٹھ کر کش پہ کش لگاتا اور دھوئیں کے بادل فضا میں چھوڑ دیتا۔ تمباکو کی بو ہوا میں پھیلتی اور دہکتی ہوئی چنگاریاں چلم سے اڑ کر زمین پر گرتیں اور بجھ جاتیں کوئی بہت ہی دل والا ہوا تو ایک آدھ پیسہ ازراہِ ہمدردی ساقی کو عنایت کر دیتا ورنہ اکثر نشے باز طلب بجھاتے اور بغیر کچھ دیئے ہی روانہ ہو تے مگر ساقی کے لبوں پر حرفِ شکایت کبھی نہ آتا۔

وہ چاوڑی میں سے گزر رہے تھے۔ دونوں طرف کسیروں کی دکانیں تھیں جو اس وقت بند ہو چکی تھیں۔ بازارِ حسن و عشق بھی یہیں تھا۔ گو سڑک تنگ تھی لیکن رونق اور چہل پہل دن سے کہیں زیادہ۔ دونوں طرف طوائفوں کے کوٹھے تھے۔ محرابی برآمدوں، چھجوں اور کوٹھوں میں مہ لقائیں غارتِ گرِ ایمان و ہوش بنی بیٹھی تھیں۔ لالٹینوں کی ہلکی ہلکی روشنی میں مکھڑے چاند کی طرح چھب دکھا رہے تھے۔ گالوں پہ غازہ، ہونٹوں پہ لاکھا اور ماتھے کی بندیا راہ گیروں کو اکساتی اور عشوہ و ادا مشتاقوں کے دل لوٹ لیتے۔

بالاخانوں پر عیش و نشاط کی محفلیں جمی تھیں۔ رقص و سرود کی گرم بازاری تھی۔ چھنا چھن پائل بجتی، گھنگھروؤں کی جھنکار گونجتی اور طبلے کی گمک پر سارنگی کی مدھر اور مست تانیں اڑتیں۔ موسیقی کی لطیف موجیں ہوا میں ہلکورے لے لے کر فضا میں دلفریبی پیدا کر رہی تھیں۔ لیکن اصغر کا دل پھر بھی نہ بہل سکا۔ فروغِ نغمۂ و ساز نے دل کے کھنچے ہوئے تاروں پہ مضراب لگا دی۔ یادِ صنم میں عشق و محبت کے دبے ہوئے شعلے بھڑک اٹھے۔ وہ اس جگہ سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر باری اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا اور وہ جبراً و قہراً اس کے ساتھ چلتا رہا۔

چونکہ مشتری بائی ڈیرے دارنی تھی۔ لہٰذا عام اور پیشہ ور رنڈیوں کی طرح کوٹھوں پر نہ بیٹھتی تھی بلکہ چاوڑی کے عقب میں اس کا مکان تھا۔ اصغر اور باری اس کی گلی میں مڑ گئے۔ اس وقت گلی بالکل سنسان تھی جہاں صرف پھیکی پھیکی چاندنی آرہی تھی۔ ایک مکان کی چھت پر دو بلیاں غرّاتے غرّاتے وحشتناک آواز سے میاؤں میاؤں کر کے لڑنے لگیں۔ ایک شخص دل گداز آواز میں گاتا ہوا ان کے قریب سے گزرتا چلا گیا:

کیا مجھ کو داغوں نے سرو چراغاں
کبھی تو نے آکر تماشا نہ دیکھا...

مشتری بائی کا گھر آگیا تھا۔ زینے کے طاقچے میں مٹی کا دیا ٹمٹم جل رہا تھا۔ ننھی سی لو لرز لرز کر اپنے چاروں طرف اُجالا پھینک رہی تھی مگر اس کی مٹی مٹی روشنی میں اندھیری سیڑھیاں اچھی طرح نظر نہیں آتی تھیں۔

اصغر اور باری سنبھل سنبھل کر اوپر چڑھنے لگے۔ چڑھتے ہوئے اصغر کو خیال آیا کہ وہ زمانہ کس قدر طرب انگیز تھا جب اس میں اور مشتری میں باہم رسم و راہ تھی۔ اُن پُرکیف ملاقاتوں میں نہ یہ رنج تھے نہ یہ آلام۔ اب تو دنیا غاروں کی طرح تاریک اور بے پایاں تھی اور زندگی دشوار۔ جب وہ انگنائی میں پہنچے تو مشتری بائی بے خیال پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ انھیں دیکھتے ہی اُٹھ کر بیٹھ گئی اور آداب بجا لائی۔ اصغر نے سلام کا جواب دے تو دیا مگر نہ معلوم کیوں مشتری بائی کو دیکھ کر اسے اپنی تنہائی کا شدید احساس ہونے لگا۔

مشتری بائی انھیں کمرے میں لے آئی۔ اس کے چہرے پر متانت اور نرمی تھی۔ بہ ظاہر وہ نہایت شریف اور باعزت معلوم ہوتی تھی۔ حُسن کسی بناوٹ کا رہینِ منت نہ تھا۔ اس کی وہ کٹورا سی آنکھیں سیاہ اور چمکیلی تھیں اور ان کے متوالے پن

میں ناگن کا سا بس بھرا تھا جو قلب و جگر میں سرایت کر جائے۔ لباس کی سادگی اس کی طبیعت کی نفاست اور ذوق سلیم کی غمازی کر رہی تھی۔ آڑے پیجامے پر چکن کا کرتہ تھا اور کلف دار چنا ہوا ململ کا گلابی دوپٹہ جس میں کہیں کہیں ابرق کے ذرّے لالٹین کی روشنی میں جھمک جاتے۔ ہاتھوں میں سونے کے نقشین کنگن پڑے تھے اور بالیاں موتیا کے تازے تازے پھولوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ناک سبک اور ستواں تھی جس میں ہیرے کی لونگ ستارے کی طرح جگر جگر کر رہی تھی ہاتھ پاؤں میں مہندی رچی ہوئی تھی اور خس کے عطر کی ہلکی ہلکی لپٹیں آ رہی تھیں۔

بیٹھتے ہی وہ اصغر سے مخاطب ہوئی:

"صاحب آپ تو عید کا چاند ہو گئے۔ عبث نگاہیں دید کو ترستی ہیں۔"

اصغر نے بے رُخی سے کہا:

"آپ میری تیرہ بختی سے لاعلم ہیں۔ خطاوار ہوں۔ جو مزاجِ یار میں آئے۔"

مشتری بائی اصغر کی سرد مہری سے کچھ بجھ سی گئی مگر اُس نے بڑے خلوص سے کہا:

"مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں۔ دنیا اسی کا نام ہے۔ بے غرض کون کسی سے ملتا ہے پھر مجھ غریب بندی کو بھلا کوئی کیوں نوازے گا؟"

"خوب۔ ہے ہے یہ تو چاہنے والوں کے جگر سے پوچھو۔" باری نے کہا، "اللہ اللہ یہ موہنی صورت، یہ دولت، یہ جوانی اللہ نے سب ہی کچھ تو دے رکھا ہے۔ ناشکری نہ کرو۔ ایک عورت کو اس کے علاوہ اور کیا چاہیے۔ بی جان! تم بھی نری نادان ہو۔"

"سرکار تسلیم کرتی ہوں۔ اس وقت میرے پاس سب دولتیں ہیں لیکن حسن و شباب بے اعتبار ہیں۔ رُت بدلتی رہتی ہے۔ ایک دن خزاں آئے گی، عہد جوانی

رخصت ہو جائے گا اور بہارِ حُسن پامال ۔ پاکیزگی نکہت ہی حُسن لازوال ہے اور متاعِ بے بہا اور بندی اس سے محروم ہے۔" اس نے بڑی حسرت سے باری کو جواب دیا اور خاموشی سے دوسری طرف دیکھنے لگی۔

اصغر نے مشتری بائی کو خلافِ معمول بہت سنجیدہ اور ملول دیکھ کر منطقیوں کی طرح کہا:

"حُسنِ جسمانی ہی دراصل حسن و شباب ہے، ایک ایسا گلاب جو رنگ و روپ کی موہ مایا کا جال پھیلا کر دلِ بلبل کو مسحور کر لیتا ہے اور جب بلبل وارفتہ ہو جاتے ہیں تو اپنی جور و جفا سے ان کے دل مجروح اور جگر چاک کر دیتا ہے جس طرح ایک شمع اُنہی پروانوں کو جلا دیتی ہے جو اس پر نثار ہونے آتے ہیں۔"

مشتری بائی نے اصغر کو عجب انداز سے دیکھا۔ اس دیکھنے میں ناکام تمنّا بھی تھی اور تلخیٔ محبت بھی۔

"نہیں صاحب۔ بھلا گل کی رعنائیوں میں وہ حُسن کہاں جو اس کی خوشبو میں میں پنہاں ہے؟ میں تو ایک بکسی ہوئی کلی ہوں جس میں نہ بو ہے نہ باس۔ جو ویرانوں میں کھلی اور کملا گئی، جس پر کسی کی نگاہِ غلط انداز بھی نہ پڑی۔ یا وہ شمع سوزاں ہوں جو تنہا اپنی آتش میں خود ہی جل جاتی ہے۔ بجھتی ہے تو دھواں اٹھتا ہے جو طاق و محراب کو بھی سیاہ کر کے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیلا دیتا ہے۔ میرا نہ کوئی ہمدم نہ چارہ ساز ہے بندہ پرور، یقین کیجیے کبھی کبھی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں صحرا کی اس سرائے کی طرح ہوں جہاں مسافر آتے ہیں، اپنی تھکن مٹاتے ہیں اور تازہ دم ہو کر پھر اپنی اپنی منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔"

اصغر نے پھر فلسفہ آرائی کرتے ہوئے کہا:

"تم کو اپنے متعلق یہ غلط خیال کیوں ہوا؟ تم تو وہ نخلستان ہو جس کی

جستجو کرتی ہے، اور سرِ منزل کا وہ روشن چراغ جو بھولے بھٹکوں کو گم شدہ راہ کا پتہ بتاتا ہے۔"

مشتری بائی نے ٹھنڈا سانس بھرا:

"نہیں، مجھے فریب نہ دیجیے۔ میری زندگی کی اصلیت یہ ہے جہاں نہ سبزہ ہے نہ شادابی۔ دور دور لق و دق و یران ریگ زار پھیلا ہوا ہے، حقیقت کچھ بھی نہیں سراب ہی سراب ہے، نہ جادہ ہے نہ منزل نہ چراغ۔ جو خود تاریک ہو وہ کیا کسی کی رہنمائی کرے گا۔ یہ آپ کا حسنِ ظن ہے۔ یہ عاجزہ مشکور و ممنون ہے، مگر مجھے اپنے متعلق کسی قسم کا مغالطہ نہیں ہے۔ اور اگر یہ خوبیاں مجھ میں موجود ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ میں تو آپ کو بھی اپنا نہ بنا سکی۔" اس کا لہجہ مایوسانہ تھا.....

باری کو اصغر اور مشتری بائی کی جملے بازیوں سے کوفت ہو رہی تھی۔ آخر اس نے اکتا کر کہا:

"خدا کے لیے یہ منطق اور میاں کی توڈی کسی نیک گھڑی کے لیے اٹھا رکھو۔ یہ کیا بے وقت کی راگنی چھیڑی ہے۔ مابدولت تو ذرا کچھ سننا چاہتے ہیں۔ ہاں بائی جی، کوئی غزل، کوئی ٹھمری، کوئی دادرا ہو جائے۔"

اصغر کو معلوم تھا کہ مشتری بائی اس سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ مگر باری کے ٹوکنے سے وہ کچھ خفیف ہو گیا اور فوراً باری کی ہاں میں ہاں ملا کر گانے کی فرمائش کی۔

مشتری بائی نے تان پورہ اٹھایا اور مضراب پہن کر ہلکے ہلکے تاروں کو چھیڑا در ایک غم انگیز غزل شروع کی:

کبھی بن سنور کے جو آ گئے تو بہارِ حسن دکھا گئے
یہ نیا شگوفہ کھلا گئے مرے دل میں داغ لگا گئے

وہ جو ملتے تھے کبھی منہ سے منہ کبھی لب سے لب کبھی دل سے دل
مجھے ان پہ جتنا غرور تھا میرے سب غروروں کو ڈھا گئے

میرے ساتھ رہتے تھے دم بدم وہ جدا نہ ہوتے تھے ایکدم
یہ دکھایا چرخ نے کیا ستم وہ مجھ ہی سے آنکھ چرا گئے

ہے اب یہ اپنی دعائے دل کسی بے وفا پہ نہ آئے دل
کہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دوکان اپنی بڑھا گئے

اصغر نے آکر مشتری بائی کے جذبات کو چھیڑ دیا تھا۔ دردِ نہاں بڑھ کر کسک دینے لگا۔ اس کی آواز جذبات سے ہم آہنگ ہو گئی اور وہ سوز و کیفِ غم سے مغلوب ہو کر گاتی رہی۔ ہر اُتار چڑھاؤ کے ساتھ اصغر کا دل بھی ڈوبتا اور اُبھرتا تھا۔ ایک نا معلوم خلش تھی جو اُس کے دل کو دُکھا رہی تھی اور وہ تصویرِ یاس بنا ہوا گانا سنتا رہا۔ مشتری بائی نے جب غزل ختم کی تو باری کہنے لگا:

"واہ! واہ!! واللہ جی خوش ہو گیا۔"

اصغر نے بھی داد دی اور وہ مجرا بجا لائی۔ پھر اصغر باہر دیکھنے لگا۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا اور سنہری سنہری کرنوں نے اس کے گرد ہالہ بنا رکھا تھا۔ قرمزی حلقے کے بعد نیلا پھر اودا اور سبز حلقہ تھا اور پورا ہالہ زرنگار ہو کر قوس و قزح کی طرح رنگین اور بے حد حسین نظر آرہا تھا۔ چاند کو دیکھتے دیکھتے اصغر کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی محبت بھی چاند کے ہالے کی طرح ہے جس نے اس کی معشوقہ کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے اور شوق و ولولے نے محبت کے ہالے کو رنگین بنا دیا ہے۔ پان بناتے بناتے مشتری بائی کی نگاہ بھی آسمان پر پڑی اور زرد چاند کو دیکھ کر وہ دل ہی دل میں کہنے لگی "میری ناکامیٔ محبت کا سایہ کیا تجھ پر بھی پڑ گیا جو تو بھی میری طرح سوگوار ہے؟"
گلوریاں بنا کر مشتری بائی نے خاصدان اصغر کو پیش کیا۔ باری کلا بتو کی

ٹوپی اوڑھے بالکل مہاتما بدھ کی طرح آسن جمائے بیٹھا ہوا تھا، اور ایک ہاتھ سے پاؤں کا تلوار برابر سہلا رہا تھا۔ مشتری بائی نے اس کی طرف گلوری بڑھائی۔ جب اس نے لینے کو ہاتھ بڑھایا تو اُس کی ہتھیلی میں گول چاند اور چھنگلیا کی پور مہندی سے سُرخ نظر آئی۔ اس کے چہرہ پر سختی تھی اور آنکھوں کی زائد سفیدی اس کے عیاش ہونے کی چغلی کھا رہی تھی۔ وہ مشتری بائی کی طرف جھکتے ہوئے معنی خیز طریقہ سے بولا:

"خدا کی قسم آج تم پر بلا کا جوبن ہے۔ کہیں پیاروں کی نظر نہ لگ جائے۔"

مشتری بائی لاکھ رنڈی سہی، تھی عورت۔ یاری سے بے باک تعریف سُن کر اس کے عارض فطری حیا کی سُرخی سے دہک اُٹھے اور اُس نے یہ شعر پڑھا:

ہم مسافر ہیں بس ہماری حیات کیسی ممات کیسی
بُجھا دیا تھا تو بُجھ گئے تھے جلا دیا ہے تو جل رہے ہیں

اس میں شک نہیں کہ وہ بھی زمانہ تھا جب اصغر کی مشتری بائی سے رسم وراہ تھی اور کبھی وہ اُس کا عاشقِ زار تھا۔ لیکن یہ محبت وہی تھی جو ایک مرد کو کوٹھے پر جانے کے بعد ایک طوائف سے ہو جاتی ہے۔ اور اب تو وہ رنگین جوش وخروش بھی ختم ہو چکا تھا اور وہ عشق وعاشقی کے طوفان اُتر چکے تھے اور اس وقت مشتری بائی کا قرب، اس کی مانوس آواز، ادائیں اور اس کا سراپا اسی موہوم ماضی کو بار بار یاد دلا رہا تھا، اور مشتری بائی کا یوں آہیں بھر بھر کر شعر پڑھنا اور برملا شکوے کرنے اصغر کو پھانس کی طرح کھٹک رہے تھے۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ مشتری بائی کے موجودہ رنج والم اور غمگینی کا باعث دراصل اس کی ذات ہے اور شعور کی پنہائیوں میں چھپی ہوئی اس حقیقت سے خجل ہو ہو کر جھنجھلا رہا تھا۔ چنانچہ اب جب کہ اس کو کوئی تھوڑا سا لگاؤ بھی باقی نہیں رہا تھا تو مشتری بائی کو اپنی چاہت جتانے کا کیا

حق تھا؟ اصغر بیزار ہو کر جانے کو اُٹھا تو مشتری بائی نے پوچھا :

" سرکار ہم سے خفا کیوں ہیں ؟"

" خفا کون ہے ؟"

باری نے طنزاً کہا :

" جناب والا دردِ دل کے مریض ہو گئے ہیں ۔"

اصغر کو اس جملہ پر طیش آگیا اور ترش روئی سے کہنے لگا :

" دل لگی مت کرو ۔ بیکار باتوں سے کیا حاصل ۔"

اصغر کی خفگی سے مشتری بائی کے پندارِ عشق کو ٹھیس لگی اور اس کا منہ ذرا سا نکل آیا مگر اُس نے کمالِ مشاقی سے اپنے جذبات پر قابو پا لیا جس کی تعلیم ایک طوائف کو بچپن سے ملتی ہے اور بات کو ہنسی میں اُڑاتے ہوئے بولی :

" مار کٹاری مر جانا ، دل نہ کسی سے لگانا ...." اور یہ کہتے ہوئے انھیں رخصت کرنے کے لیے دروازہ تک آئی ۔

رات ایک پہر گزر چکی تھی اور شہر میں سناٹا ہو گیا تھا ۔ درختوں کے سائے چاند کی نقرئی روشنی میں لمبے لمبے ہو کر سنسان سڑکوں پر پڑ رہے تھے ۔ چاوڑی کے کسی کوٹھے سے ابھی تک گانے بجانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور ایک آدھ تماشبین چوروں کی طرح دبے پاؤں نیم تاریک زینوں سے اُترتا دکھائی دیتا تھا ۔ کتے جا بجا گندگی کو سونگھتے پھر رہے تھے ۔ گلیوں میں آبخوروں کے ٹھیکرے مٹھائی کے جھوٹے دونے اور مکانوں کے اندر سے پھینکا ہوا سڑا بُسا کھانا اور ترکاری کے چھلکوں کی ڈھیریاں جگہ جگہ پڑی تھیں جن پر بلیاں قبضہ کیے بیٹھی ایک دوسرے پر دھونس جما رہی تھیں اور غصہ میں عجیب عجیب بے ہنگم آوازیں نکال رہی تھیں جن سے دل اُڑا جاتا تھا ۔

جب اصغر حوض قاضی پر پہنچا تو ایک سن رسیدہ شخص اجمیری دروازہ کی طرف سے نکلا اور اصغر کے آگے آگے چلنے لگا۔

اصغر اپنے خیالوں میں مست چھڑی کو گھماتا ہوا اطمینان سے جا رہا تھا۔ بڑے میاں اچانک اصغر کا راستہ کاٹتے ہوئے ایک گلی میں مڑے۔ اتفاق سے اصغر کی چھڑی ان کے بے جگہ لگ گئی۔ بڑے میاں فوراً پلٹے اور بولے:

"میں نے کہا، چاند دولہا ہمیں سے؟"

ایک ہیجڑا جو ابھی تک ایک کوکھ میں کسی بھولے بھٹکے پنچھی کی آس لگائے بیٹھا تھا یہ تماشہ دیکھ کر زور زور سے تالیاں بجانے اور بے اختیار قہقہے لگانے لگا۔ اس وقت اصغر خود شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ بڑے میاں کا فقرہ کچھ ایسا چست ہوا تھا کہ جواب نہ بن پڑا اور وہ گردن جھکائے تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ جب وہ کوچہ پنڈت میں پہنچا تو کبابی دوکان بڑھا چکا تھا۔ البتہ میرزا دودھ والے کی دوکان ابھی تک کھلی ہوئی تھی اور چند لوگ دوکان کے سامنے بیٹھے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ خلیفہ کی تنگ و تاریک دوکان میں کوئی مزے لے لے کر گا رہا تھا:

او ہوری لچھی تیری گول پنڈریاں ....

اصغر جنگلی کنوئیں کی طرف ہو لیا اور گیت کے بول رات کی تیرگی میں گھل مِل گئے۔

۱۲

گھر کے سب لوگ سو چکے تھے، صرف وحیدہ بیگم، اصغر کے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔ اصغر پنجوں کے بل گھر میں آیا اور جب صحن میں پہنچا تو اس کی نگاہیں کھجور کے درخت پر پڑیں اور اس کے بدصورت اور کالے سیاہ تنے کے ساتھ ساتھ اُٹھتی ہوئی آسمان تک چلی گئیں۔ آسمان پر چاند روشن تھا اور ہلکی ہلکی سبز چاندنی میں ہر چیز محو خواب تھی۔ کھجور کے پتوں کی اوٹ سے بنات النعش کا سب سے بڑا ستارہ جگمر جگمر کرتا جھانک رہا تھا۔ اصغر کو نہ معلوم کیوں وہ حکایت یاد آ گئی کہ باپ کی لاش پلنگ پر پڑی ہوئی ہے اور تینوں بیٹیاں باری باری پلنگ کی کان نکالنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ایک پایہ سیدھا کرنا چاہتی ہیں تو دوسرا پایا ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ اصغر نے دل میں کہا اپنی زندگی کا بھی یہی ڈھب ہے۔ ایک کام بنتا ہے تو دوسرا بگڑ جاتا ہے۔ وہ یہی سوچتا ہوا اوپر چلا گیا۔ ہوا بالکل بند تھی، سارے پتے ساکت تھے اور کھجور کا پرانا درخت بھی خاموشی سے ہوا کی آس لگائے آسمان کی طرف مُنہ اٹھائے کھڑا تھا۔

وحیدہ بیگم بھی اصغر کے پیچھے کوٹھے پر آگئیں۔ اصغر نے ایک عالمِ محویت سے چونک کر کہا:

"آپ ابھی تک نہیں سوئیں؟ کیوں کیا بات ہوئی؟"

"ہاں میں تمہاری راہ دیکھ رہی تھی۔"

"کوئی خاص بات تھی؟" اصغر نے سوال کیا۔

"نہیں بھئی خاص بات کیا ہوتی۔ میں تو یہ کہنے آئی تھی کہ اماں نے ابا سے بات کی تھی۔"

امید و بیم سے اصغر کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے ہمہ تن شوق ہو کر پوچھا:

"پھر ابا کیا بولے؟"

"بھیا وہ تو یہ تجویز سنتے ہی کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے۔"

اصغر نے سرد آہ بھری اور آسمان کو مایوسی سے دیکھا، چاند کا چہرہ خاک کے پردے میں چھپ کر زرد پڑ چکا تھا۔ وہ قوس و قزح جیسا رنگین ہالہ معدوم ہو گیا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ چاند بھی تھوڑی دیر کا مہمان ہے جو خاک کے پردوں میں روپوش ہو جائے گا۔

اصغر نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کی آنکھیں موٹے موٹے آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔ "کاش اس زندگی کو موت آ جائے۔" اُس نے درد بھرے لہجہ میں کہا۔

وحیدہ بیگم اس کی بات کاٹتے ہوئے بولیں:

"اے نوج، تمہارے دشمنوں کو آئے۔ اماں تو تمہاری پیشی لے رہی ہیں، سب کچھ بھگتنے کو تیار رہیں، پھر تم کیوں بے بات ہراساں ہوئے جاتے ہو۔

ابا کو ضد چڑھ گئی ہے۔ وہ بھی انشاء اللہ دیر سویر مان ہی لیں گے۔ ہمت ہارنے کی نوبت نہیں آئی ہے ابھی۔" اور پھر وہ بشاشت سے کہنے لگیں: "مٹھائی کا وعدہ کرو تو ایک بات کہوں تم سے۔"

"پہلے کہیے مٹھائی بھی آ جائے گی۔"

"اماں جمعہ کو شہباز بیگ کے ہاں تمہارا پیام لے کر جانے والی ہیں۔ خدا کرے وہ قبول کر لیں۔ ابا کو ابھی اس کی خبر نہیں ہے۔ ان کا کیا ہے دیکھا جائے گا۔ وہ خوشی کی گھڑی تو آئے ہم ان کو بھی منا لیں گے۔"

باڑہ میں ایک مرغے نے پر پھڑپھڑا کر زور سے بانگ دی۔ اصغر نے سر اٹھا کر وحیدہ بیگم کو دیکھا۔ اس کا چہرہ امید و آرزو سے دمک اٹھا اور وہ غیر متوقع خوشی میں بہن سے لپٹ گیا۔

"آپا تم نہ آتیں تو سچ مچ کچھ نہ ہوتا۔"

"میں کیا اور میری بساط کیا۔ کرنے والا اللہ ہے۔ خدا تم کو سلامت رکھے اور تمہارے سہرے کے پھول کھلیں۔"

اس کے بعد تھوڑی دیر دونوں بہن بھائی خاموش بیٹھے رہے، پھر وحیدہ بیگم کہنے لگیں:

"اب تو بس تم میرے ساتھ بھوپال چلے چلو۔ یہاں تم کو دیکھ دیکھ کر ابا کو بلاوجہ غصہ آئے گا اور تم کو سخت سست کہیں گے اور تم کڑھتے رہو گے۔ تمہاری غیر موجودگی میں اماں چاہیں خود ہی ٹھیک بٹھا لیں گی اور شادی ہوتے ہوتے سال بھر تو ویسے لگ ہی جائے گا۔"

اصغر ان کی رائے سے متفق ہو گیا اور وحیدہ بیگم نیچے چلی گئیں۔ آج دنیا کس قدر پرامن ہو گئی تھی، اور وہ مگن ہو کر لیٹ گیا۔ اس وقت اس کو افسوس

ہو رہا تھا کہ کیوں مشتری بائی کا دل اُس نے اپنی باتوں سے دُکھایا۔ کیا تھا اگر کچھ دیر اور اُس کے اصرار پر وہاں ٹھہر جاتا۔ پھر وہ خوابوں کے حسین شیش محل بنانے لگا۔ ہجوم در ہجوم مُسرّتیں چلی آ رہی تھیں اور ان مسرّتوں میں بلقیس کا پُر فریب خیال جلوہ گر تھا۔

ؤ ؤ ؤ ؤ ؤ ؤ

جمعے والے روز بیگم نہال اپنی جٹھانی کو ساتھ لے کر مرزا شہباز بیگ کے گھر اصغر کا پیغام لے کر پہنچیں۔ مرزا جی کی بیوی نے بڑے تپاک سے اُن کا خیر مقدم کیا اور بہت خاطر تواضع سے پیش آئیں۔ بیگم نہال کے سوال پر کہنے لگیں بہن ایک دو روز میں لڑکی کے ابا سے پوچھ کر کہلوا دوں گی۔

مرزا شہباز بیگ کو ایسا لایق فایق اور ہونہار داماد چراغ لے کر بھی ڈھونڈتے تو کہاں نصیب ہوتا۔ ان کی جھولی تو بن مانگے اللہ نے موتیوں سے گھر بیٹھے بھر دی تھی۔ اور سنہری چڑیا جب خود ہی دانے پر گری تھی تو بھلا وہ کیوں پھُر ہونے دیتے اور بلا ردّ و کد کے پیغام فوراً قبول کر لیا۔

بلقیس والوں کی طرف سے ہاں ہوتے ہی بیگم نہال کو جیسے کھوئی ہوئی جنّت مِل گئی ہو، اور اس خوشی میں دوسرے ہی دن مولود شریف کروایا۔ سارا گھر جھڑا جھا۔ سفید برّاق چاندنیاں بچھیں۔ بڑے دالان کے بیچ میں چوکی رکھی گئی اس پر سُوزنی بچھا کر گاؤ تکیے لگا دیے گئے۔ مغرب کی نماز کے بعد گھر میں فنتیل سوز اور شمع دان روشن ہوئے۔ چاندی کی اگر دانیوں میں اگر بتیاں جلائی گئیں، لوبان دانی میں لوبان سُلگا۔ گلاب پاش میں گلاب بھرا گیا اور چنگیری میں موتیا کے تازے تازے پھول رکھے گئے۔ لوبان اور اگر کا معطر دھواں بل کھاتا ہوا آہستہ آہستہ موتیا کی خوشبو میں مِل کر اُوپر اُٹھ رہا تھا اور پھر لہرا کر سارے میں پھیل جاتا۔

ایک رُوح افزا خوشبو ہوا میں بس گئی۔ در و دیوار مہکنے لگے اور دل فرطِ عقیدت سے معمور ہو گئے۔ گھر کے سب لوگ میلاد شروع ہونے کے منتظر بیٹھے تھے۔

اصغر نے بڑی خوش الحانی سے قرآن شریف کی تلاوت کی۔ اور اس کے بعد سرور دوعالم احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ بیان کی ان کی ذات اقدس تمام بنی نوع انسان کے لیے رحمت ال للعالمین تھی۔ آپ کے معجزے بیان کیے جب سلام پڑھنے کا وقت آیا تو سب کھڑے ہو گئے۔ شمس اور مسرور بھی اصغر کے ساتھ شریک ہو کر سلام پڑھنے لگے۔ عالمِ کیف میں اصغر جھوم جھوم کر یا حبیب سلام علیک کہتا اور اس کی آواز رات کے سناٹے میں دُور دراز تک پہنچ جاتی۔ اس کا دماغ لوبان اور اگر کی خوشبو سے معطر تھا اور اس کا دل خدا کی عظمت اور اسلام کے جوش سے لبریز سننے والوں پر رقّت طاری تھی اور وہ سر جھکائے مؤدّب کھڑے تھے۔ کچھ بڑی بوڑھیاں عشقِ محمدی میں رو رہی تھیں اور ان کی ٹھوڑیوں پر آنسوؤں کے قطرے لرزیدہ تھے۔ جب محمدؐ کا نام آتا تو سب تعظیماً انگوٹھے چوم چوم کر اپنی آنکھوں سے لگاتے۔ مسرور نے سب سامعین پر گلاب چھڑکا اور مجید نے سب کی پیشانیوں پر حنا کا عطر ملا۔ زمین سے آسمان تک تقدّس کا عالم تھا۔ فضا معطر تھی اور غبار چھٹ کر روح مصفّا ہو گئی تھی۔ سب کے دلوں میں اس وقت صرف اللہ اور اس کے حبیب کا عشق موجزن تھا اور وہ فردوس کے ان وعدوں کے خواب دیکھ رہے تھے جو اُس نے اپنے بندوں سے کیے ہیں۔

میلاد ختم ہونے کے بعد اصغر نے مناجاتیں اور نعتیں شروع کیں۔ پہلے غوث الاعظم کی شان میں قصیدے پڑھے:

غوث الاعظم بہ منے بے سر و ساماں مددے
قبلۂ دیں مددے کعبۂ ایماں مددے

ہوا سرسرائی اور کھجور کے پتّے بھی حمد و ثنا کرنے لگے۔ اور جب وقت اصغر نے مناجات کا یہ شعر پڑھا:

تمنّا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھوں
قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا

عین اس وقت نثار احمد کی دل آویز آواز گونج اٹھی۔ اذان سُن کر سب پر سکوت طاری ہو گیا۔ پھر سب نے اپنے ہاتھ دُعا کے لیے اٹھائے اور فاتحہ پڑھ پڑھ کر اپنے گریبانوں میں دم کیا۔ مرتبوں کا تبرّک تقسیم ہوا اور اس کے بعد گھر والے رات کے کھانے پینے کے اہتمام میں لگ گئے۔

۱۳

اصغر کی نسبت پکی ہو جانے کے ہفتہ بھر بعد وحیدہ بیگم نے اپنے مجو پال جانے کی تیاری شروع کر دی۔ بیگم نہال کو جس قدر بیٹی کے آنے کی خوشی ہوئی تھی اسی قدر اُس کے جانے کا ملال بھی تھا۔ بار بار نواسے نواسی کو بلا کر پیار کرتیں بھینچ بھینچ کر اس طرح گلے لگاتیں گویا خدا جانے اب کے بچھڑے دیکھو پھر کب ملیں گے۔

اصغر خوشی خوشی اپنی چیزیں یکجا کر کے رختِ سفر باندھ رہا تھا۔ اس نے اپنے دل کو یہ دلاسا دے لیا تھا کہ جب ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے قربِ محبوب میسر نہیں تو دیارِ غیر ہی اچھا ہے، یکسوئی تو ہوگی اور وہ در و بام، وہ باتیں تو نہ ہوں گی جو بلقیس کی یاد ہر دم دلا کر اس کو تڑپایا کرتی ہیں۔ وہ مزے سے فرصت کی گھڑیوں میں بلقیس کے تصور سے ہم کنار رہے گا اور یہ تشنہ کامی کے گھٹاٹوپ سیاہ بادل جو اس کے چاروں طرف چھائے ہوئے تھے، فاصلے سے حسین اور نقرئی نظر آئیں گے۔

کئی دن سے گرمی پڑ رہی تھی۔ دن بھر لو چلتی۔ آسمان سے گرد برستی رہتی۔ جلتے جلتے آسمان کا رنگ راکھ کا سا ہو گیا تھا، اور ڈوبتا ہوا سورج دن

ڈھلے گول طباق کی طرح دکھائی دیتا۔ شام کو لُو بند ہو جاتی تو اس قدر حبس ہوتا
کہ در و دیوار تندور بن جاتے۔ لیٹ کر بھی آرام نہ ملتا، بچھونے کی چادریں گرم سلاخوں
کی طرح برماتیں اور تکیے کاٹتے۔

وحیدہ بیگم کی روانگی سے قبل ہوا یکایک پلٹی اور پُروا چلنے لگی۔ سفید
سفید روئی کے گالوں جیسے بادل دوڑے آئے اور پورے آسمان پر
چھاگئے، جب کہیں گرمی کی ماری دنیا کو کچھ امن ہوا۔ رات بھر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
چلتی رہی اور صبح ہوتے ہوتے چھینٹا پڑ گیا ـــ لوگ بچھونے لپیٹ لپیٹ
کر اندر بھاگے۔ مینڈھے اور ڈبّے بھیں بھیں کر کے مسلسل چلانے لگے۔ مدّت
کی پیاسی زمین میں سے سوندھی سوندھی خوشبو پھوٹنے لگی اور صبح تک موسلا
دھار بارش ہوگئی۔ کالی کالی گھنگھور گھٹائیں جھوم جھوم کر پیغام حسن لے کر آتیں
زور شور سے بادل گرجتے اور ٹھہر ٹھہر کر بجلی چمکتی۔ اڑاڑا دھم کا کڑاکا ہوتا اور
نیلی اور سُرخ روشنی سیاہ بدلیوں میں لہریئے بناتی ہوئی دور جا کر چمکتی ہوئی نظر آتی۔
ہر شے دھل دُھلا کر نکھر گئی۔ درختوں کے پتے گہرے سبز ہو کر زمرّد کے بنے ہوئے
معلوم ہونے لگے۔ ہوا کا مست اور خنک جھونکا ان کو چھیڑتا ہوا گزر جاتا اور رِم
جِھم بوندوں کے لرزتے ہوئے موتی زمین پر گر جاتے۔ چڑیوں کی چوں چوں، میناؤں
کا بولنا اور کوّوں کی کائیں کائیں جو کبھی باعثِ اذیت تھی رُت بدلتے ہی اب کس قدر
سُہانی معلوم ہونے لگی۔ کبوتر باز زیادہ ذوق و شوق اور ہماہمی سے کبوتر اُڑا
رہے تھے اور سودا بیچنے والوں کی تھکی تھکائی آوازوں میں ایک خاص کرارا پن
آگیا تھا۔ محلّے میں عورتیں برسات کے گیت گانے لگیں:

جھولا کن نے ڈالو رِی امریاں ....

اس کے ساتھ ہی کڑاہیاں چڑھ گئیں۔ اندر سے اور گھال نکلے جانے کی

خوشبو آنے لگی۔

تن میں تازگی تھی اور من میں اُمنگ۔ مینہ برستے ہی معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے کائنات میں نئی روح پھونک دی ہے انگڑائی لے کر ہر چیز پوری لطافتوں کے ساتھ جاگ اٹھی تھی۔ اور جوان بوڑھے، مرد عورت گھروں سے بیر بہٹیوں کی طرح نکل پڑے کسی نے راہ جنگل کی لی، کسی نے بَن کی۔ کوئی قطب کو چلا کوئی ہمایوں کے مقبرے۔ ان کے ہاتھوں میں پوٹلیاں اور کٹوردان تھے، آموں سے بھری ٹوکریاں تھیں۔ کوئی میٹھے پکوان لے کر نکلا تھا، کوئی سموسے اور کچوریاں لایا تھا۔ کسی کے کٹوردانوں میں ان کا من بھاتا کھاجا برئی برا تھے اور آم کا اچار تھا۔ عورتیں سپڑ سپڑ جوتیاں اور کھڑاویں کھٹ کھٹ کرتی چلی جا رہی تھیں۔ پیٹھ پر پڑے ان کے میلے چیکٹ برقعے جو بھٹیاروں کے رفیدے بنے ہوئے تھے ہوا میں اُڑ اُڑ کر ان کے پیچھے گھسٹتے ہوئے چلے جا رہے تھے ان کی ہیئت بالکل ایسی تھی جیسے کوئی مرغی پانی میں جوڑا ہو کر اپنے بازو پھڑپھڑا کر پَر سکھاتی ہو۔ بچے رو بھی رہے تھے اور ہنس بھی رہے تھے۔ جگہ جگہ نشیب میں پانی بھر کر ننھے ننھے تالاب بن گئے تھے جن میں پتوں سے ڈھلکی ہوئی بوندیں سینکڑوں گرداب بیک وقت بنا دیتی تھیں۔ ان میں لڑکے بالے نہا رہے تھے۔ کاغذ کی کشتیاں بنا بنا کر چھوڑی جا رہی تھیں۔ ہر طرف سے مردوں کی حاکمانہ چیخ پکار اور عورتوں کی طول طویل اور بے مقصد باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس وقت نہ انھیں اپنی ہیئت کذائی کی فکر تھی نہ سراپا کی خبر، نہ غمِ فردا تھا نہ اندیشۂ امروز۔ یہ حُسن کو ترسی ہوئی آنکھیں، یہ ہزار ہا محبت کے بھوکے دل جن کو ستم ہلائے روزگار کی چکی برس بھر پیستی رہی تھی زندگی کی کلفتوں کو بھلا کر اپنے چھوٹے چھوٹے گھروندوں اور کثیف گھروں کی قید و بند سے آزاد ہو کر اس فضا کی تازگی کا لطف اُٹھا رہے تھے جس پر پہلی بارش

نے حسن اور نکھار بخشا ور کر دیا تھا زندہ رہنے کی جدوجہد سے نجات پا کر ان کے دلوں میں وہی احساسِ لطیف ٹھاٹھیں مار رہا تھا جو انسان کو قدرت نے عطا کیا ہے۔

اِدھر شہر میں برسات کی بہاریں تھیں ادھر بیویاں وحیدہ بیگم اور اصغر کو گلے لگا لگا کر رخصت کر رہی تھیں۔ بیگم نہال کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی سارے رشتہ داروں نے امام ضامن باندھے کسی نے ناشتے کے لیے روپیے دیے اور کسی نے مٹھائی ساتھ کی۔ میر نہال نے بیٹی کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا۔ وہ بھی آب دیدہ تھے۔ قرآن کی چھاؤں میں سے وحیدہ بیگم اور اصغر نکل کر ڈیوڑھی میں آگئے سب نے اللہ بیلی کہکر خدا اور اس کے حبیب کو سونپا۔

اصغر نے وحیدہ بیگم کو زنانے ڈبے میں سوار کروا دیا۔ وہ اپنے ڈبے میں آکر بیٹھا تھا کہ گارڈ نے ہری جھنڈی دکھائی، پلیٹ فارم پر گھنٹہ بجا۔ انجن نے زور زور سے سیٹی دی، بھک بھک دھوئیں کے بادل چھوڑے اور ریل کُو چھکا چھک کرتی دلی کی سرحدوں کو عبور کرنے لگی۔

وہ جہانِ محبت دور ہوتا جا رہا تھا جس میں اصغر کی محبوبہ رہتی تھی۔ اس وقت اصغر کے دل میں ایک عجیب سی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ چیلیں آسمان پر بے تکلفی سے تیر رہی تھیں۔ چڑیاں فکر سے آزاد ہل مل کر اُڑ رہی تھیں۔ شجر اپنا سر ہلا ہلا کر کیف و انبساط سے وجد کر رہے تھے اور یہ ہی معلوم ہوتا تھا کہ کائنات کا دل عشق و محبت سے لبریز ہو کر چھلک پڑا ہے جس سمت نگاہ جاتی تھی، ایک عظمت، ایک حسن اور رعنائی کی بادشاہت نظر آتی تھی۔ دور، بہت دور، اُفق کے اس کنارے بادلوں کی گرج اور چمک صلح و آشتی کے نقارے بجا رہی تھی۔ دیوتاؤں کا غیظ و غضب مٹ چکا تھا۔ کام دیوتا کے آتے ہی قدرت کی دیوی اپنے ہاتھ پھیلا کر نئے وجود کی دعا دے رہی تھی اور دنیا کو حیاتِ نو بخش دی تھی۔

حصّہ دوم

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

——— میر درد

۱

۱۹۱۱ء کی گرمیاں اس غضب کی تھیں کہ ہر ذی روح گرمی گرمی پکار اُٹھا۔ جمال بیگم کی پیٹھ گرمی دانوں سے لدی پڑی تھی۔ ان میں چرمراہٹ جُوں جُوں زیادہ ہوتی وِوں وِوں وہ گرمی کی دُہائی دیتیں "اوئی بُوا اتنی عمر ہونے کو آئی ایسی نگوڑی گرمی نہ دیکھی نہ سُنی۔ مُوئے دوزخ کے داروغہ نے جہنّم کا مُنہ ادھر ہی کو کھول دیا۔ خدا کی مار اِن فرشتوں پر" اور وہ انجم زمانی کی خوشامد کرتیں:

"اے انجم تم جیتی رہو، ذرا گلاب سفیدہ تو میری پیٹھ پر مل دو۔"

بیگم نہال کبھی کبھی جٹھانی کی باتوں پر صاد کرتے ہوئے کہتیں: "ہاں بی سچ کہتی ہو۔ اب کے تو دِلّی جہنّم بن گئی۔ مجھے تو یاد نہیں غدر کے بعد پھر کبھی ایسی بلا کی گرمی پڑی ہو۔" اور جمال بیگم ماضی کو یاد کرتیں: "خدا بخشے دادی اماں سے چھُٹپنے میں سنا کرتے تھے کہ دلّی میں ایک دفعہ ایسی زوروں کی گرمی پڑی تھی کہ جمنا کا پانی کھولنے لگا تھا۔ من من بھر کے مہاشیر پانی سے اچھل اچھل کر ریت پر تڑپتے تھے۔" دلچین باورچی خانہ میں پسینے میں شرابور روٹی توے پر ڈالتی اور بڑبڑاتی

جاتی: "کالا مُنہ گرمی نے تو بھون دیا، کرموں کا پھل ہے۔"

دن چڑھتے ہی لو چلنی شروع ہو جاتی اور سونی گلیوں میں صبح سے شام تک ماتم کرتی پھرتی اور سارے شہر میں دھول اڑا کرتی۔ کھجور کے تنے پر مٹی کی تہہ چڑھ گئی اور پتے بد رنگ ہو گئے۔ مہندی کا درخت خشک نظر آتا۔ اس کی پتیاں مرجھا مرجھا کر پیلی پڑ گئی تھیں۔

دالانوں پر روئی کے پردے چھوڑ دیے جاتے۔ دروازوں پر خس کی ٹٹیاں لگ جاتیں۔ عورتیں فرشی پنکھوں کے نیچے بچوں کو لے کر پڑ جاتیں۔ چماری اونگھ اونگھ کر پنکھے کی ڈوری کھینچتی اور قلابوں کی یکساں چرچوں گرمی کا شکوہ کرتی ہوئی سُنائی دیتی۔ مرد کام اور ضرورت سے باہر نکلتے وقت سر اور کانوں کو رومالوں سے اچھی طرح لپیٹ لیتے۔ چرند اور پرند بدحواس ہو رہے تھے۔ تانگوں کے گھوڑے بھاگتے بھاگتے تڑ سے گر کر ٹھنڈے ہو جاتے۔ کبوتر ذرا کی ذرا اڑتے اور پیاس کی شدّت سے چونچیں کھول کر ہانپنے لگتے۔ کوّوں کی کائیں کائیں کانوں میں چبھتی۔ ایسی چلچلاتی دھوپ ہوتی کہ چیلیں بھی انڈا چھوڑ دیتیں اور چلچلاتی پھرا کرتیں۔ ان کی دل خراش چلچلاہٹ گرمی میں اور بھی وحشت ساماں ہوتی۔

آسمان آب و تاب مٹا کر بے رنگ ہو گیا تھا۔ رات کو ستارے گرد و غبار کے پیچھے سے ٹم ٹم کرتے۔ بچھونوں پر مستقل ریت برستی رہتی اور منہ میں آ کر دانتوں میں کرکر ہوتی۔ دن کو آتشِ آفتاب کباب کرتی اور رات کو در و دیوار سے گرم بھپکے نکلتے اور نیم سوختہ جانداروں کے پاس نیند کبھی نہ پھٹکتی تھی۔

چاروں طرف سے برابر چیخنے چلّانے کی آوازیں آتیں۔ گرمی کے ساتھ انسانوں کے مزاجوں میں بھی گرمی آ گئی تھی۔ حواس باختہ ہو کر وہ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے۔ مائیں بچوں کو ذرا ذرا سی بات پر دُھن کر رکھ دیتیں اور مرد کو لا کو لا کر

بیویوں سے جھری کٹا ری ہوتے ـــــ یہی تکا فضیحتی اور شور و شر چوبیس گھنٹے جاری رہتا۔ آدمی کو کہیں امن تھا نہ سکون و قرار۔ آئے دن جدھر سے سنو آگ لگ جانے کی خبریں آتیں۔ تیز لو کے جھکڑ آگ کو اور ہوا دیتے اور شعلوں سے آسمان لال انگارا ہو جاتا۔ کوئی نہ کوئی آدمی روز لو لگ کر دم توڑ دیتا۔ کبوتروں کا بیٹھے بیٹھے منکا ڈھلک جاتا۔ مگر آدمی و حیوان کو گرمی سے کہیں پناہ نہ ملتی۔

ادھر تو گرمی نے یہ قیامت توڑ کر مخلوق کا بھرتا بنا دیا تھا، اُدھر شہر کے باہر موری دروازے سے لے کر بُرانے قلعہ سے پرے تک فرنگی بادشاہ کے جشن تاج پوشی کے اہتمام ہو رہے تھے اور کڑی دھوپ میں مزدور اپنا خون پسینہ ایک کر کے میدانوں کو سنوار رہے تھے۔ صبح سے شام تک کہیں مٹی کھود کر گڑھے بھرے جاتے اور کہیں سے اونچے ٹیلے کاٹ کر زمین کو ہموار کیا جاتا اور مئی کا جان سوز آفتاب ان کے ننگے بدن اور کھلے سروں پر سے ڈھلتا ہوا لبِ بام آ جاتا، حالانکہ ابھی بادشاہ سلامت کی آمد میں عرصہ تھا اور لوگ اس طرف متوجہ بھی نہ ہوئے تھے۔ چاندنی چوک سے فوّارے اور فوّارے سے لے کر فتحپوری تک بگولے چکّر کھاتے ہوئے آسمان کی طرف جاتے اور لو کے تیز و تند گرم جھونکے سڑک کے دو رویہ پیپل کے درختوں سے بے روک ٹوک ٹکراتے اور سنّوں سے الجھتے پھرتے۔ لوگ دوکانوں اور مکانوں کو بند کر کے پڑ جاتے۔ گلیاں خالی ہو جاتیں، اور کوچہ و بازار مردہ نظر آتے۔ دن بھر فقط ٹریم کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دیتی، جس میں چند لوگ ہی بیٹھے نظر آتے۔

جب سورج بالکل مغرب میں چلا جاتا تو لوگ اپنے گھروں اور ٹھنڈے تہہ خانوں سے باہر نکل آتے، سڑکوں پر چھڑکاؤ کیے جاتے اور شہر میں زندگی کا وہی شور و غوغا بلند ہو جاتا۔"

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

بھری دوپہر میں میر نہال نور الٰہی بیل والے کی دوکان سے نکلے۔ لُو کا ایک جھونکا آیا اور منہ کو جھلستا ہوا نکل گیا اور انھوں نے جلدی سے اپنی گُدّی اور کانوں کو ایک چار باغ کے رومال سے ڈھک لیا مگر چکن کے دودھ کھلے انگرکھے میں سے ان کا چوڑا چکلا سینہ دکھائی دے رہا تھا۔ جوں ہی انھوں نے گلی میں قدم رکھا "آؤ بیٹا آؤ بیٹا" کی آواز کسی کوٹھے پر سے آئی۔ بے ارادہ ان کی نظر آسمان پر گئی۔ گرمی سخت تھی مگر آسمان کبوتروں سے پٹا پڑا تھا۔ کبوتروں کو دیکھتے ہی انھیں ایک دم خیال آیا کہ آج صبح جلدی میں اپنے کبوتروں کے جال میں پانی رکھنا قطعی بھول گئے تھے، اور وہ جلدی جلدی قدم اٹھانے لگے حالانکہ وہ نور الٰہی کے ہاں سے اس خیال سے اٹھے تھے کہ ذرا جا کر بنّن جان کی مزاج پرسی کر آئیں۔ وہ کئی دن سے بیمار تھی۔ لیکن کبوتروں کے خیال سے وہ بے چین ہو رہے تھے اور گھنٹہ گھر سے ہوتے ہوئے راستہ مختصر کرنے کو اس وقت سیدھے بلّی ماران کو مڑ گئے۔ یہی ان کے گھر کا قریب ترراستہ تھا۔

کمپنی باغ سے بہت سی اونٹ گاڑیوں کی لین ڈوری جوں کی چال چلتی ہوئی چرّخ چوں کرتی کھاری باولی کی طرف جا رہی تھی اور پوری سڑک ان سے رُک گئی تھی۔ میر نہال کو بہت پیاس لگ رہی تھی اور انھوں نے بلّی ماروں کے نکّڑ پر کھڑے کھڑے سبیل سے پانی پیا۔ بازار میں آمد و رفت شروع ہو چکی تھی اور دوکاندار اپنی اپنی دوکانوں کے سامنے پانی چھڑک رہے تھے۔ جب وہ عطّاروں والی گلی میں پہنچے تو جڑی بوٹیوں اور دواؤں کی تیز بو سے دماغ پھٹنے لگا۔ ہوا کافور میں بسی ہوئی تھی اور جیسے ہی کافور کا بھپکا میر نہال کی ناک میں چڑھا ان کے جسم میں ٹھنڈی تھرتھری آ گئی اور ریڑھ کی ہڈی تک تھر تھری محسوس ہوئی۔ ان کو اچانک موت کا خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی بنّن جان کی میٹھی اور غم انگیز یاد بالکل اس طرح آئی جیسے

کسی مرے ہوئے عزیز یا کسی بھولے بسرے پیارے کی یاد کہیں سے آکر لاشعور
کے پردے چاک کر کے دل میں چٹکیاں بھرے، اور آدمی لطفِ غم سے شاد بھی
ہو اور ناشاد بھی۔ اور معلوم نہیں کیوں موت اور رہتی جان کے خیال نے ان کو یہ
احساس دلایا کہ آفتابِ زیست لبِ بام آتا جا رہا ہے، اور وہ دل ہی دل میں اپنی
عمر کا حساب لگانے لگے، اور ان کے حساب کے مطابق وہ پورے باسٹھ برس کے ہو چکے
تھے۔ بڑھاپے کا خیال آدمی کو ہمیشہ سوہانِ روح ہوتا ہے۔ اس کمزوری سے میر نہال
کو اپنی حالت پر ترس آنے لگا۔ انھوں نے بہتیرا اس خیال کو ٹالنا چاہا لیکن اس وقت
ان کی کیفیت عجیب تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ منوں بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں۔ ان کا
دم گھٹ رہا تھا اور خون تیزی سے گردش کرتا ہوا دماغ کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اُن کی
آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ کر اندھیرا آگیا۔ خون کے دباؤ سے شریانیں اور
سر بالکل پھٹتا معلوم ہوا۔ گھبرا کر تھوڑی دیر کو وہ ٹھہر گئے، اور جب اس کیفیت میں
کمی ہوئی تو انھوں نے سوچا کہ اس سے پہلے تو ایسا کبھی نہ ہوا تھا، آخر طبیعت خراب
ہونے کی کیا وجہ ہے؟ لُو تو نہیں لگ گئی؟ پھر انھیں خود ہی خیال آیا کہ ان کو
کچھ دنوں سے قبض کی شکایت تھی اور یہ سبب زیادہ صحیح تھا۔ لہٰذا وہ مطمئن ہو گئے۔

جب وہ کوچہ پنڈت میں پہنچے تو کاچھن ہری ہری کیریاں اور پھل چھبیے
میں لیے بیٹھی تھی۔ اس نے میر نہال کو دیکھتے ہی سلام کیا اور حسبِ معمول باتیں
ملانے لگی:

"سرکار بہت گرمی پڑ رہی ہے۔ یہ خربوزے لیتے جایئے، بہت میٹھے ہیں،
میرا آدمی آج ہی لکھنؤ سے لے کر آیا ہے۔ یہ کالے کالے شہتوت ہی لے لیجیے۔"

اس کی زبان ہمیشہ تیز قینچی کی طرح لتر لتر چلے جاتی تھی اور آواز بالکل پھٹا
ڈھول اور چیچک کے داغوں نے چہرے کو بگاڑ دیا تھا۔ لیکن وہ جوان تھی

اس کی راتیں خوب گد.ائی ہوئی تھیں، اور دودھ اتنے بڑے تھے کہ سارے ہندوستان کو پلا سکتی تھی۔ میر نہال کو اس وقت اپنے کبوتروں کو پانی پلانے کی جلدی تھی اور وہ صرف دو پیسے کی کیریاں پتے کے واسطے لے کر لوگوں سے علیک سلیک کرتے ہوئے جنگلی کنویں تک آ گئے۔

رستے میں نثار احمد مسجد کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیے۔ یہ محلے کی مسجد میں اذان دیا کرتے تھے۔ ان کی عمر کوئی پچاس برس کی تھی۔ ٹخنوں تک اونچا شرعی پاجامہ، کھدر کا گھٹنوں تک کا کرتہ پہنے ہوئے اور سر پر جال دار خاکستری گول ٹوپی اوڑھے رہتے جس کی باڑھ میلی چیکٹ ہو کر اپنی عمر ختم ہو جانے کی پوری شہادت دیتی تھی اور ایک رومال سیدھے کندھے پر پڑا رہتا تھا۔ ان کا گھٹا ہوا سر کسیرو کی طرح معلوم ہوتا تھا جس پر ان کا ماتھا اور کنپٹی واضح اور چوڑا نظر آتا۔ چھچی سی ڈاڑھی مہندی سے مستقل رنگے رہنے کی وجہ سے گہری سرخ ہو گئی تھی۔ صوم و صلوٰۃ اور شرع کے بہت پابند تھے۔ اوپر کے لب پر مونچھیں منڈی ہوئی تھیں اور اس کا گہرا کاہی رنگ الگ نظر آتا تھا جس کے عین اوپر ان کی کلہاڑا سی ناک بالکل چٹان کی طرح سارے چہرے سے باہر نکلی ہوئی دکھائی دیتی۔ سجدے کرتے کرتے سیاہ گٹا پیشانی پر پڑ گیا تھا جو دور سے ان کی کالی رنگت میں چمکتا تھا۔ نثار احمد گھی بیچ کر روزی کماتے تھے۔ لیکن لوگوں کا کہنا تھا کہ ان کا گھی خالص نہیں ہوتا۔ مگر ان کی اذان کی کشش ایسی تھی کہ ہر زبان کو دعائیں دیتی اور لوگ اکثر ان کو جنتی کہتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ مغرب کے وقت ان کی اذان ایمان والوں کے دلوں کو خوف اور رحمتِ خدا سے لبریز کر دیتی تھی۔ شام کی گھٹتی ہوئی روشنی میں ان کی آواز آہستہ آہستہ بلند بلند ہوتی اور شوکت و نصرت کا مژدہ دیتی ہوئی ستاروں تک پہنچ جاتی۔ ان کی آواز کا کھٹکا اگر صبح کی تعلی یاد دلاتا تھا تو تراوی میں اس بات کا احساس ہوتا تھا

کہ زندگی مجازی ہے، اور کائنات غیر معتبر۔ دنیائے ناپائیدار کی عبرت دلاتی ہوئی اذان شہر کے شور و شغب کو عبور کرتی ہوئی دور دور سنائی دیتی پھر آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی اور سکون اور سناٹا تھکے ماندے دلوں کو لوریاں دینے لگتا۔

اس وقت میر نہال ان سے اتنا کہنا چاہتے تھے کہ کبوتروں کے لیے گھی بھجدیں کیونکہ گھر میں سے گھی لیتے ہوئے اس لیے ڈرتے تھے کہ بیوی فضیحتے کریں گی، مگر نثار احمد میر نہال سے بہت آگے تھے اور محلہ نیاریاں کے موڑ پر آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ یہیں شیخ محمد صادق زردوز کی دوکان تھی۔ جب ان کی نگاہ میر نہال پر پڑی وہ اپنی دوکان سے نیچے اُتر آئے اور میر نہال کی طرف بڑھے۔ اُن کی سیدھی ٹانگ پر چمڑے کا گیٹس بندھا ہوا تھا جس پر چک پھیریاں دے کر وہ مُبلا ہٹا کرتے تھے۔ ان کی تل چاولی چکّی ڈاڑھی پر مہندی سے رنگے ہوئے سر کے بال عجب مضحکہ خیز معلوم ہوتے تھے۔ ان کا لال ازار بند لٹک رہا تھا اور رسڑیں زمین کو چھوکر ادھر ادھر جھول رہی تھیں۔ انھوں نے دور ہی سے چلا کر کہا:

"میں نے فرمایا، السلام علیکم میر صاحب!"

میر نہال نے نظر اٹھا کر دیکھا اور قدم روک دیئے اور شیخ محمد صادق نے قریب آکر بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا پھر کہنے لگے:

"میں نے کیا آپ کے مزاج تو اچھی طرح ہیں؟"

میر نہال نے جواباً کہا:

"اللہ کا شکر ہے۔ میاں تم سناؤ کیا حال چال ہے؟"

اس پر شیخ جی بولے:

"ویسے تو خیر صلا ہے۔ کل میں کچھ دنوں سے ایسے الجھیڑے میں گھر یا ہوا ہوں کہ سوچتا رہا کل آپ تک آئی نہ سکا۔ کچھ ایسی بے فرصتی تھی۔" اور وہ کبھی ٹانگ

اور کبھی اپنی ڈاڑھی کھجلانے لگے۔

"میاں خیر تو ہے، بتاؤ نا؟" میر نہال نے ان کی ہچکچاہٹ کو دیکھتے ہوئے زور دیا۔

"ویسے تو سب ٹھیک ٹھاک ہے پر ایک بات تھی جس کے کارن میں آپ کے پاس تشریف لانی چاہتا تھا۔"

"تو کہو نا شیخ جی!"

"میری ہمت نہیں پڑتی۔ زبان پلٹتی نہیں پر آپ بزرگ ہیں آپ جانیں، میری اکلوتی بہن تھی وہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔ ایک بچی چھوڑ مری۔ میں نے ہی اب تو ڈی اس ایتیم اسیر کو پالا پرورشت کیا۔ اب سیانی ہونے کو آئی۔ آپ جانیں بڑے کہہ گئے ہیں کہ بن بیاہی بچی گھر میں ہو تو کھانا حرام ہوتا ہے جب تو ڈی اس کو پرایا نہ کر دیں۔ اب اس کے ہاتھ پیلے کرنا چاہتا ہوں جو آپ اجازت دیں تو بس اتنی سفارش ہے کہ آپ کے ملازم غفور سے اس کے دو بول پڑھوا دوں۔ آپ کو اللہ اجر دے گا۔ اِس ایتیم کے سر پہ ہاتھ دھریں گے۔"

میر صاحب نے پوچھا: "بچی کی عمر کیا ہے؟"

"اب ارشاد کر رہا ہوں جی، وہ ہے تو تیرہویں میں پر اللہ کا فضل ہے۔ بے فکری سے رہتی ہے۔ اٹھان اچھا ہے۔ ماشاء اللہ خاصی پندرہ سولہ کی لگتی ہے۔"

میر نہال نے کچھ سوچ کر جواب دیا:

"میاں شیخ جی غفور کے لیے مجھے بچی کی عمر کم معلوم ہوتی ہے۔ آگے تم جانو۔"

"آپ کی عرض تو سر آنکھوں پر پر میری گھر والی نے ناک کی پھننگ میں دم کر رکھا ہے۔ صبح شام اٹھتے بیٹھتے یہی وظیفہ ہے ہر گھڑی کہتی رہتی ہے تم بے فکرے ہو بچی کا دھیان ہی نہیں کرتے۔ اِس کا کبھی تو سوچو ماشاء اللہ سیانی ہو گئی۔ تم

پڑے ستاتے ہو مجھے رات رات بھر نیند نہیں آتی۔ کب تو ڑی بیٹھی رہے گی۔ اسے پرایا کرو اپنا گھر بسائے۔ چوبیسوں گھڑی کی کل کل سے حیران ہوں۔ آپ ہی عرض کریں میں اِس نیک بخت سے کیا فرماؤں ؟"

میر نہال ان کی باتیں دلچسپی سے سن رہے تھے کہنے لگے:

"آپ نے غفور کی منشا بھی معلوم کی ؟"

"آپ نے بات تو سولہ آنے ٹھیک کہی ہے۔ مگر آپ کا نوکر ہے مجھے تو یہ بتایئے آپ کی کیا مرضی ہے ؟"

میر نہال ششش و پنج میں تھے کہ کیا جواب دیں۔ اتنے میں فاضل خان کرخندار نمودار ہوئے اور میر نہال کو بہت تپاک سے سلام کر کے بولے:

"گھر میں تو سب خیر صلاح ہے "

وعلیکم السلام۔ الحمدللہ "

خیر گزری کہ وہ ٹھہرے نہیں۔ میر نہال نے شیخ محمد صادق سے یہ کہہ کر پیچھا چھڑایا:

"میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی "

شیخ جی اس جملہ کو اجازت سمجھے اور خوشی اور احسان مندی میں میر نہال کے ہاتھ زور سے پکڑ لیے۔

"خدا آپ کو خوش رکھے۔ اس وقت میری تو بگڑی بنا دی " اور وہ نہال نہال چلے گئے۔

میر نہال نے قدم اُٹھایا ہی تھا کہ سامنے سے ایک ننگ دھڑنگ مست قلندر گلی میں سے نکل آئے۔ ان کی ڈاڑھی سالن اور میل کچیل سے سنی ہوئی بلبل کا گھونسلا بنی ہوئی تھی۔ ان کے لمبے لمبے ناخنوں میں میل بھرا ہوا تھا اور وہ سیاہ اور گھناؤنے

ہو رہے تھے۔ پاؤں پر منوں غلاظت تھپی ہوئی تھی۔ قوی ہیکل جسم پر بٹ پڑے ہوئے تھے۔ اور تمام جسم کالے کالے بالوں سے ریچھ کی طرح ڈھکا ہوا تھا۔ چہرے کے بال جھاڑ جھنکار کی طرح اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے جن میں ان کی چھوٹی چھوٹی چپیاں سی آنکھیں اور زیادہ چمک رہی تھیں۔ ان کی شکل سے دیوانگی ٹپک رہی تھی مگر لوگ ان کو پہنچا ہوا سمجھتے تھے اور وہ ہمیشہ جواریوں، سٹے بازوں کے نرغے میں رہتے تھے۔ زیادہ تر وہ ہرے بھرے صاحب کے مزار پر پڑے رہتے تھے یا پھر سرمد کے مزار کے سامنے ڈیرا ڈال دیتے۔ کبھی کبھار موج ہوئی تو اُٹھ کر شہر کا گشت کر لیا۔ وہ ہمیشہ یہ انوکھی صدا لگایا کرتے تھے:

"جس کے رکھنے میں یہ مزا ہے۔ اُس کے نکالنے میں کیا مزا ہوگا"

میر نہال کو ان سے وحشت ہوتی تھی اور انھیں آتا دیکھ کر تیزی سے گھر کی طرف چل دیے۔

ایک بوسیدہ مکان میں کوئی عورت کسی لڑکی پر چیخ رہی تھی:

"اری فطو تجھ پہ خدا کی مار۔ کہاں مر گئی ؟"

اور ایک کتے نے بھبک کر بلی کا تعاقب کیا۔

میر نہال کا سر بھاری ہو رہا تھا اور بنّن جان کی طرف سے تشویش تھی۔ انھیں سرمد کی یہ رُباعی یاد آ گئی:

سرمد در دین عجب شکستے کردی
ایمان فدائے چشم مستے کردی
عمرے کہ بہ آیات و احادیث گزشت
رفتی و نثار بُت پرستے کردی

⁘ ⁘ ⁘ ⁘

۲

جب وہ گھر پہنچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ نثار احمد تکبیر کہہ رہے تھے۔ آسمان کبوتروں اور کنکوؤں سے ڈھکا ہوا تھا۔ دیواروں کے سائے لمبے ہو گئے تھے اور دھوپ منڈیروں اور چھجوں پر چلی گئی تھی۔ غفور بیٹھا ہوا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ میر نہال نے گھر میں جا کے کیریاں دلچین کو کھلبہ ملانے کو دے دیں اور خود وضو کرنے لگے۔ کوٹھے پر سے بیگم جمال کی آواز آئی:

"ہائے ہائے میں مری۔"

"خیریت تو ہے؟" میر نہال نے دلچین سے پوچھا۔

"بیوی کو بخار ہو گیا ہے۔" دلچین نے کہا۔

میر نہال نے نماز پڑھی اور پھر کوٹھے پر گئے۔ زینہ چڑھتے ہوئے محض اس لیے کھنکھارے کہ ان کی آمد کا پتہ چل جائے۔ آواز سنتے ہی سب نے اپنے ڈھلکے ہوئے دوپٹوں کو سروں پر ٹھیک کیا اور سمٹ سمٹا کر بیٹھ گئیں۔ جمال بیگم اپنے صاف ستھرے پلنگ پر لیٹی ہوئی درد سے ہائے ہائے

کر رہی تھیں۔ جمے جمائے کمرے میں ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ اور دوسری بیویاں نیچے چاندنی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ مہرو ایک کونے میں جامنی دوپٹہ پر کرن ٹانک رہی تھی۔ اصغر کی شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ بیگم نہال چھالیہ کتر رہی تھیں۔ اور سب باتوں میں اس قدر مصروف تھے کہ جمال بیگم کی مستقل ہائے ہائے اور کراہنے پر کوئی خاص توجہ نہ دے رہا تھا۔ دراصل وہ ذرا سے دکھ اور بیماری میں واویلا بھی بہت مچاتی تھیں۔

میر نہال نے جوتے دہلیز پر اتارے اور بھاوج کے پاس جا کر پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئے اور نبض دیکھتے ہوئے بولے:

"کب سے بخار چڑھا ہوا ہے بھابی؟"

"بس صبح ہی سے بخار میں بھن رہی ہوں۔"

اور پھر وہ کراہتے ہوئے کہنے لگیں:

"بھیجا پھٹ کے رہ جائے گا۔ ارے مجھ کمبخت ماری کو کوئی پانی تو دیدو۔ حلق میں کانٹے پڑ گئے۔۔۔۔۔ یا اللہ گناہوں کو معاف کر یو۔۔۔۔"

میر نہال بھاوج کی ہتھیلی سہلاتے ہوئے بولے:

"گھبرانے کی ایسی کیا بات ہے؟ لو لگ گئی ہے۔" پھر بیوی سے کہنے لگے اجمل خاں کو بلوا بھیجو۔

جمال بیگم نے دوپٹہ سر پر کس لیا تھا اور کراہتے ہوئے سر کو ادھر ادھر پٹخ رہی تھیں۔ بیگم نہال نے میاں سے کہا:

"میں نے تو پہلے ہی ان کو دکھوایا تھا، وہ نہیں ملے تو حکیم بھورے میاں کو بلوایا مگر آج وہ بھی کہیں گئے ہوئے ہیں۔ مسرور انھیں لینے گیا تھا۔ وہ غریب بھی بخار سے ہلہلاتا ہوا لوٹا۔ دونوں کو میں نے کیری کا پنا پلوا دیا ہے

اور اسی کا چھینٹا دے کر تو جھاڑ بھی دی ہے۔ اے تم بولا کیوں رہے ہو۔ اپنی خبر ہی نہیں لیتے، تم بھی بیناپی لو۔ باہر سے آئے ہو۔ آج لو بہت سخت چل رہی ہے۔"

میر نہال کہنے لگے:

"ہاں کیریاں لینے آیا تھا۔ دلچین پنّا بنا رہی ہے۔"

پھر وہ نیچے چلے گئے۔ جمال بیگم بدستور ہائے وَیلا کر رہی تھیں۔ نیچے کمرے میں مسرور فرش پر اکیلا بخار میں لوتھ پوت پڑا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد پانی پانی کرتا اور پھر غافل ہو جاتا۔ میر نہال نے اس کو پانی دیا اور سر سہلایا۔ اس کی کنپٹیاں دھک دھک بھڑک رہی تھیں۔ کمرے سے نکل کر وہ دِلچین پر برس پڑے:

"غریب بچے کو سب نے اکیلا ڈال رکھا ہے، گھر بھر میں کوئی اس کی خبر نہیں لیتا۔ کب سے وہ پانی پانی کر رہا ہے۔ تو بھی نہ گئی۔"

وہ دِلچین کو مزید ہدایتیں دے کر کبوتر دیکھنے کوٹھے پر چلے گئے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

گرم ہوا چل رہی تھی، کھجور کے پتے ایک بے کیف آواز سے سرپیٹ رہے تھے، اور دھوپ کی بے پناہ تیزی میں آنکھیں چندھیائی جا رہی تھیں۔ مگر کبوتر باز پورے انہماک سے ٹین پیٹ پیٹ کر اور زور زور سے سیٹیاں بجا بجا کر کبوتر اُڑا رہے تھے۔ پھیری والوں کی آوازیں ٹھہر ٹھہر کر آتیں جو اس گرمی میں بھی لہک لہک کر سودا بیچ رہے تھے۔ فضا اداس اداس تھی اور چار کھونٹ ایک اجاڑپن تھا....

میر نہال نے جال کا دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی کبوتر پھڑپھڑاتے ہوئے باہر نکل آئے اور پانی کے خشک کونڈے پر ٹوٹ پڑے۔ پانچ سات کبوتر گرتے پڑتے بڑی مشکل سے باہر نکلے۔ اِن میں سے کئی جال میں ڈھیر ہوئے پڑے تھے۔ یہ دیکھ کر میر نہال کا جی بیٹھ سا گیا۔ وہ سب عمدہ نسل کے پٹھے تھے۔

انھوں نے مرے ہوئے کبوتروں کو اٹھا کر ایک کونے میں رکھ دیا اور کونڈے میں پانی بھرا۔ سب کبوتر ایک ساتھ پانی پر ٹوٹ پڑے۔ ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ پانی تک اوروں سے پہلے پہنچ جائے۔ بیمار کبوتر کونڈے کی کور پر بہ مشکل چڑھنے کی کوشش کرتے لیکن اس دھکا پیل میں گر گر پڑتے۔ میر نہال نے ان کو دوسرے جال میں چھوڑ دیا اور الگ کنڈالی میں پانی پلایا۔ دو روز پہلے اُن کے ایسے ہی نادر کبوتر لُو لگ کر مر گئے تھے میر نہال کو ان کا ابھی تک قلق تھا کیونکہ ایسے بڑھیا اور سدھے ہوئے جانور دہلی میں کسی اور کے پاس نہ تھے۔ وہ اس ناقابلِ تلافی نقصان سے کچھ ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ اس دن انھوں نے کبوتر ایک بار بھی نہ اُڑائے۔

خواجہ اشرف علی اپنی دیوار پر سے اُچک اُچک کر میر نہال کو جھانک رہے تھے اور متعجب تھے کہ آج میر صاحب کو کیا ہوگیا ہے جو کبوتروں کو چکّر تک نہیں دے رہے۔ انھوں نے اپنے کبوتروں کو ایک آدھ بھڑ کی دی، لیکن میر نہال کے ڈر سے زیادہ دور نہیں جانے دیا۔ جب کبھی وہ ٹلبی کرتے فوراً انھیں واپس بلا لیتے، اور پھر اُچک اُچک کر دیوار کی منڈیر سے سر نکال اپنی دل جمعی کرنے کو دیکھتے کہ کہیں میر صاحب کبوتر تو نہیں اُڑانے والے ہیں؟ ــــ لیکن میر نہال کے کبوتر چھت پر پھر رہے تھے۔ اب خواجہ اشرف علی کو اطمینان ہو گیا کہ میر صاحب آج کبوتر نہیں اُڑائیں گے اور انھوں نے اپنے کبوتروں کو بے خوف و خطر ٹلبی کرنے دی۔ میر نہال پر ان اوچھی حرکتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ انھیں تو اپنے کبوتروں کا بہت ملال تھا جنھیں وہ اپنی جان کے برابر عزیز رکھتے تھے۔ اسی لیے اس وقت ان کی حالت اس بچّے کی سی تھی جس کا کوئی نہایت دل پسند کھلونا ٹوٹ گیا ہو اور انھیں کچھ ایسی مایوسی ہوئی کہ انھوں نے ارادہ کر لیا کہ اب اس شوق کو بالکل خیر باد کہہ دیں گے۔ درحقیقت وہ اب جوانی کی سرحدوں کو عبور کر کے بڑھاپے کی منزلوں میں داخل ہو چکے تھے

اور مزید نا امیدیوں کے سہنے کی طاقت باقی نہ رہی تھی۔

تاہم ساری عمر کا شوق یوں آسانی سے چھوٹ بھی نہ سکتا تھا اور انھوں نے اپنے کبوتروں کے مرنے پر ناچار صبر کر ہی لیا اور اگلے دن ہی جمعہ کو نئے پٹھے خریدنے چوک پہنچ گئے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

مثلث نما چڑھتی ہوئی سیڑھیوں کا سلسلہ جامع مسجد کے شاہی دروازے کے سامنے چبوترے پر ختم ہوتا تھا اور اس چبوترے پر جو سڑک سے تقریباً چالیس فٹ کی بلندی پر تھا کبوتروں کا چوک ہر شام کو لگتا تھا۔ جمعہ کو خاص طور پر بھیڑ بھڑکا زیادہ ہوتی تھی اور بہترین جانور بکنے کو آتے تھے۔ جان پہچان والوں کو علیک سلیک کرتے ہوئے جب میر نہال نے سیڑھیاں چڑھنی شروع کیں تو داہنی طرف ان کی نگاہ موٹے توندل قفلی والے پر پڑی جو اونچی مُنڈھیا پر بڑے اطمینان سے بانگ چینی گوتم بدھ کی طرح براجمان تھا۔ اس کے موٹاپے کا یہ عالم تھا کہ سوسی کے شلوکے میں سے توند کے بٹ دور سے صاف نظر آرہے تھے۔ کسی پھونک بھرے غبارے کی طرح اس کے پھولے ہوئے گال گھنی مونچھوں اور خشخاشی ڈاڑھی سے چھپ گئے تھے۔ گہرے نیلے اور سُرخ رنگ کے چوخانے والی لنگی اس نے گھٹنوں کے اوپر چڑھا رکھی تھی اور اس کی ترکی ٹوپی جس کا رنگ کبھی لال رہا ہوگا مستقل استعمال اور میل کی تہہ چڑھ جانے سے سیاہی مائل ہو چکی تھی۔ اس کے اردگرد دیسر کیوں کی نیچی منڈھیوں پر بھڑکیلے کپڑے پہنے ہوئے دلّی کے من چلے بیٹھے ہوئے تھے۔ جب کوئی قفلی مانگتا تو وہ مٹکے کے منہ پر سے سُرخ کپڑا سرکاتا اور اس کے اندر ہاتھ ڈال کر قفلی نکالتا اور ٹین کے چاقو سے جس کے دستے کی لکڑی غائب ہو چکی تھی اور اب اُس پر سیاہ چیکٹ دھجی لپٹی ہوئی تھی آٹا کھرچ کر ڈھکنا کھولتا پھر ٹین کا

چمچہ لگا کر گاہک کی طرف بڑھا دیتا۔ میر نہال کی نظر شاید اس پر جاتی بھی نہیں اگر خواجہ اشرف علی وہاں بیٹھے ہوئے ملائی کی برف نہ کھا رہے ہوتے۔ خواجہ صاحب دوہرے بدن کے تھے اور ان کی چگی ڈاڑھی کی نوک کھچڑی ہو چکی تھی۔ وہ ملگجیالے رنگ کی شیروانی اور ترکی ٹوپی اوڑھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی انھوں نے میر نہال کو سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے دیکھا تیزی سے چمچے چلانے لگے اور بولاہٹ میں برف ان کی ڈاڑھی اور کپڑوں پر ٹپک گئی۔ وہ کھاتے تھے اور مڑ مڑ کر میر نہال کو دیکھتے جاتے تھے۔ بار بار گردن موڑنے میں ان کی ٹوپی کا پھندنا ہوا میں ناچنے لگتا تھا۔ وہ ابھی قلفی ختم کرنے بھی نہ پائے تھے کہ میر نہال چبوترے تک پہنچ گئے خواجہ اشرف علی برف والے کے دام چکا کر جلدی جلدی سیڑھیاں طے کرنے لگے۔

میر نہال بھیڑ کو چیرتے ہوئے پنجروں میں کبوتروں کو جانچنے لگے۔ ایک آدھ مرتبہ تھم کر شوقین بیچنے والوں سے کبوتر ہاتھ میں لے کر ان کی نوک پلک دیکھی اور ان کے سینے مٹھی میں پکڑ کر پر پھڑ پھڑائے۔ جو ناپسند ہوئے وہ لوٹا دیئے اور جو بھا گئے وہ نذیر کبوتر باز کے پنجرے میں چھڑوا دیے اور قیمت ادا کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اس اثنا میں خواجہ اشرف علی بھی آ پہونچے اور کن انکھیوں سے میر صاحب کو دیکھتے رہے۔ میر نہال نے خواجہ صاحب کے دو کبوتر پکڑ لیے تھے۔ وہ بھی نذیر کے پنجرے میں موجود تھے۔ اپنے کبوتروں کو نذیر کے پنجرے میں دیکھ کر ان کا چہرہ سُت گیا۔ وہ اپنے کبوتر میر نہال کے سامنے خریدنے سے کترا رہے تھے۔

انھوں نے میر نہال کو سلام کیا اور مزاج پرسی کر کے کہا:

"کل آپ نے کبوتر نہیں اُڑائے۔ خیریت تو ہے؟"

"شکر الحمد للہ۔ کچھ طبیعت گری گری تھی اور دو چار کبوتر بھی لُو سے مر گئے تھے۔"

کبوتروں کے مرنے کا سُن کر خواجہ اشرف علی کے چہرہ پر مسکراہٹ کھل اٹھی اور آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ لیکن بہ ظاہر انھوں نے اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے کہا، ”جی ہاں! لو بھی تو آجکل کس بلا کی چل رہی ہے۔ جانور تو جانور آدمی بھی مرے جارہے ہیں۔“

باتیں کرتے کرتے دونوں چبوترے کے دوسرے سرے تک آگئے۔ نیچے سڑک کے اُس پار ہرے بھرے صاحب اور سرمد کے مزار تھے جن پر سقے مشکیں پیٹھ پر رکھے چھڑ کا ذکر رہے تھے اور کٹورے بجا بجا کر پانی پلا رہے تھے! اور پریڈ کے میدان کے پرے لال قلعہ کی سُرخ سُرخ فلک بوس دیواریں دُور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

مشرق کی طرف نیچے سیڑھیوں پر چڑی مار طرح طرح کی چڑیاں بیچ رہے تھے۔ جن میں الو، بٹیر، بلبل اور طوطے مینا سے لے کر شین باز، نقرنول، لال، بدڑیاں اور ہدہد سب ہی کچھ تھے۔ نچلی سیڑھیوں پر بساطی تھے جن کے پاس رنگ برنگی لنگیاں، کارچوبی ٹوپیاں، موتی اور گوٹے کی ہڑوں کے ازار بند اور چٹلے تھے۔ ان سے ذرا ہٹ کر کباڑیے ہر قسم کا پُرانا سامان لیے بیٹھے رہتے تھے۔ اس میں بوسیدہ کتابوں کے قلمی نسخوں کے علاوہ چینی کے برتن تابیں، طشت جاناں، غوریاں اور گلدان تبرنوں پرانے بلور کے شمع دان، ہنڈیاں اور فانوس، شیشے کی صراحیاں، فتیل سوز، دوشاخے اور سہ شاخے، اور یہاں تک کہ چھپر کھٹ اور میز کرسیاں، بڑے بڑے کاٹھ کے صندوق جن پر پچی کاری، جست کی چادروں پر پھول پتی اور رنگین نقش و نگار بنے ہوئے تھے، سب ہی کچھ تھا۔

شمالی سیڑھیوں اور مقابل کے میدان میں دوا فروش اور جڑی بوٹی والے سانڈھوں اور حواصل کا تیل، شیر کی چربی، ریچھ کے دانت، لومڑی کی دُم اور

مگرمچھ کے منہ اور ریڑھ کی ہڈیاں لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ بعضوں کے پاس زندہ گرگٹ، گوہ، سانپ، بچھو، کنکھجورے، نیولے، اور چمگادڑیں تار کے پنجروں اور کاٹھ کے ڈبوں یا بانس کی پٹاریوں میں بند تھیں، ان عطائی نیم حکیم طبیبوں کی جڑی بوٹیاں اور تیل، عرقیات کی بوتلیں، چٹکی بھی کی ڈبیاں اور گولیوں اور ٹکیوں کی تھیلیاں، زمین پر پھیلے ہوئے کپڑوں پر بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ ایک صاحب ناٹک کے روپ دھاریوں کی طرح چیخ چیخ کر اپنی دوائیں بیچ رہے تھے۔ ان کی حالت پھرت، نرت، سرت، بالکل ایک نقال کی تھی۔ ان کے گرد لوگوں کا ٹھٹھ لگا ہوا تھا۔ پہلے تو وہ دوا کی خاصیت بیان کرتے اور پھر گھیرے کا چکر لگاتے اور ہتھیلی پر رکھی معجون دوا لوگوں کو دکھا دکھا کر اس کی خوبیاں گناتے۔ جب ایک دوا بک چکتی تو وہ اونچی سی میز اٹھا کر بواسیر کی تفصیل کا لٹکا شروع کرتے:

عجب مرض یہ بھی بواسیر ہے
قضا کا لٹکا کاف میں تیر ہے

اگر یہ دیکھا کہ اس وقت۔ ۔ ۔ ۔ اس مرض کا مبتلا کوئی نہ تھا تو وہ چورن کے خواص نئے سرے سے دوہرانے لگے۔

"بادی کو ایسے کاٹے جیسے ریل کو انجن"۔ دوسری طرف ایک اور صاحب بہروپیے بنے تقریر کر رہے تھے۔ ان کے چاروں طرف بھی جم غفیر تھا۔ وہ اپنے دانتوں پر مل مل کر منجن دکھا رہے تھے۔ اور گا گا کر اس کی تعریفیں سنا رہے تھے۔

ان سے تھوڑی دور جیوتشی، نجومی پیتل اور ہاتھی دانت کے پانسے پھیلائے اور ہاتھ کی لکیروں کے نقشے چوکھٹوں میں رکھے، رمل، جفر کی ہندی اردو کتابیں جمائے لوگوں کی قسمت کا حال بتا رہے تھے اور رستہ چلتوں کو دیکھ کر کہہ رہے تھے "تین آئے چار بات، دل کا بھید بتائے ہاتھ۔۔۔۔"

چاروں طرف سے مختلف آوازیں آرہی تھیں۔ چیل کوّے کائیں کائیں کرکے میناروں پر بیٹھتے۔ کبوتروں کے جھلڑ جامع مسجد کے گنبدوں پر سے اُڑ اُڑ کر چلے جاتے یا اور جھنڈ صحن میں اتر کر حوض پر پانی پیتے۔ شام کے وقت دلّی کے شور و شغب میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔

میر نہال اور خواجہ اشرف علی جانے ہی والے تھے کہ حکیم بشیر آ نکلے۔ یہ بھی پرانے کبوتر باز تھے لیکن ان کو گولوں کا شغف نہ تھا جن کی پرواز ایک تو نیچی ہوتی ہے، دوسرے یہ خطِ مستقیم پر اُڑتے ہیں اور اُن کے اُڑانے میں بہت ہُو ہا کرنی ہے۔ یہ کابلیوں کے عاشق تھے۔ ایک تو یہ کہ خوب صورت بہ نسبت ہوتے ہیں پھر ان کی سفید آنکھیں گولوں کی سُرخی مائل مٹیالی آنکھوں سے کہیں زیادہ حسین ہوتی ہیں اور ان کے اعلیٰ بالا ہونے کی شناخت محض آنکھوں کی پتلیوں سے ہوتی ہے۔ ان کا حسنِ پرواز صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ تڑکے تڑکے یہ اُڑا دیئے جاتے ہیں اور خود بخود بتدریج بلند ہوتے جاتے ہیں اور آخر کار آسمان میں تارا بن جاتے ہیں۔ ان کا زیادہ عرصہ تک خلا میں رہنا اس نسل کی انتہائی صفت ہے۔ پھر ان کے اُڑانے میں نہ جھنڈیاں ہلانی پڑتی ہیں نہ سیٹیاں بجانی ـــــ چونکہ حکیم بشیر خود متین اور صوفی منش آدمی تھے انھیں ایسے سنجیدہ کبوتروں کا شوق ہونا قدرتی امر تھا۔ فضا کی پہنائیوں میں بلند ہوتے ہوئے کبوتروں کو دیکھ کر انھیں ایک خاص کیف و سرور حاصل ہوتا اور وہ محسوس کرتے گویا وہ خود بلند ہو کر قربِ الٰہی حاصل کر رہے ہیں، جس سے ان کی تشنہ روح کو سکون سا آ جاتا۔

حکیم بشیر کے آتے ہی بات کبوتروں کی مختلف قسموں اور اوصاف پر ہونے لگی اور خواجہ صاحب نے بحث چھیڑی:

"حکیم صاحب کابلی تو نشاوروں سے بہتر نہیں ہوتے۔ اس میں شک نہیں

کہ یہ گولوں کی بہ نسبت اونچی اُڑان کرتے ہیں مگر بھئی یہ تو نچلے طبقے کا شوق ہے۔ اوّل تو یہ پاموز ہیں اور پھر سُست۔ اس کے علاوہ ان کے واسطے چھتریاں لگانی پڑتی ہیں۔ یہ ہی حال کابلیوں کا ہے۔ ان دونوں ذاتوں کی دیکھ بھال میں نہ کوئی دشواری اور نہ سدھانے میں کسی خاص مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔"

حکیم جی میرٹھی تھے اور میرٹھ سے اپنے ساتھ کابلی نسل کے کبوتر لائے تھے، جو دِلّی والوں کے لئے تجربہ ضرور تھے مگر دِلّی والے ان کی خوبیوں کا اعتراف کرنے سے قاصر رہے اور یہ قسم دِلّی میں ابھی تک ہر دلعزیز نہیں ہوئی تھی۔ حکیم بشیر نے خواجہ اشرف علی کے طنز پر مسکراتے ہوئے کہا:

"نہیں قبلہ خواجہ صاحب آپ یہ غلط فرما رہے ہیں کہ کابلیوں کے لیے کوئی دردسری نہیں کرنی پڑتی اور نہ میں یہی تسلیم کرنے کو تیار ہوں کہ یہ نشاوروں سے ملتے جلتے ہیں۔ کسی جانور کا آسمان کی بلندیوں میں بند ہو کر اس طرح اُڑنا کہ آنکھ کو نظر نہ آئے اور پھر سات آٹھ گھنٹے کے بعد گھر آنا کمال کی بات ہے اور پھر ان کی پرواز کی آہستگی اور ٹھہراؤ، واہ واہ!"

خواجہ اشرف علی نے اُلٹ کر جواب دیا:

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ یہ بتایئے ان کو سدھانے میں کون سے ہاتھی گھوڑے جوتنے پڑتے ہیں اور کس ہنر کی ضرورت ہوتی ہے، بس صبح ہوئی کھول دیا اور اُڑا دیے۔ اس کے برخلاف گولوں کو سدھانا کوئی سہل کام نہیں، بڑا پِتّا مارنا پڑتا ہے۔ پھر ہم ان کو نہ صرف اُڑنا بلکہ اُڑان کے سینکڑوں طریقے سکھاتے ہیں، ٹکڑیوں میں ایک ساتھ اُڑنا، ٹکڑیوں سے کٹ کر اُڑنا اور تیر کی طرح ایک دوسرے سے الگ ہونا، کٹرنیاں لینا، دوسرے کبوتروں کو اس طرح الجھانا کہ وہ کٹنے نہ پائیں، پھر مالک کی آواز کو پہچاننا، سیٹی کی آواز کے ساتھ دھیما اور تیز ہو جانا،

جھنڈی کے اشاروں کو سمجھنا ، ارے کہاں تک گناؤں یہ سب سکھانا مُنہ کا نوالہ تو نہیں ہے اور پھر ان کی غذا میں پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ بادام، پستہ، ملائی کے علاوہ اور طرح طرح کے نسخے دیے جاتے ہیں۔ ارے میاں ان کا شوق ہر کس و ناکس نہیں کر سکتا۔ بڑے دل گُردے والوں کا کام ہے۔"

بحث کی گرما گرمی سُن کر اور لوگ بھی جمع ہو گئے تھے، اور مزے لے لے کر سُن رہے تھے۔ خواجہ صاحب کو اس سے اور تقویت ہوئی اور انھوں نے میر نہال کی جانب اس انداز سے دیکھا گویا میر نہال بھی ان کی ہاں میں ہاں ملا کر ان کی تائید کریں گے مگر میر نہال فقط مُسکرا کر رہ گئے اور لطف لینے کے باوجود بحث میں خود کوئی حصہ نہ لیا۔

خواجہ اشرف علی پھر بولے :

"ہمارے میر صاحب کے بڑے بھائی میر جمال ہی کا سُن لیجیے جو اس فن میں طاق تھے اور ان کو ایسا ملکہ تھا کہ کیا مجال وہ جس سمت جھنڈی ہلا دیں ان کا کوئی جانور پھیر تو جائے۔ جب ۱۹۱۱ء کا دلّی دربار ہوا تھا تو جشن کے موقع پر جہاں اور بہت سے کشتی، دنگل، کھیل، تماشے، مرغ اور بٹیر بازیاں ہوئی تھیں وہاں کبوتر بازی کے بھی مقابلے ہوئے تھے۔ میر صاحب کو بھی اس مقابلہ میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی تھی مگر انھوں نے تو صاف کہہ دیا تھا میں خوشامدی ٹٹوؤں اور رذالوں میں شامل نہیں ہو سکتا مگر جب لوگ بہت ہی مُصر ہوئے تو اس شرط پر راضی ہو گئے کہ ان کے کبوتر اُن ہی کی چھت پر سے اُڑیں گے اور وقت مقررہ پر لال قلعہ پر مقابلے کے لیے پہنچ جائیں گے۔ سارے کبوتر باز شکر موں کی چھتوں کو طرح بہ طرح رنگ کے اُن پر سے کبوتروں کو اُڑنے کی تعلیم دے رہے تھے۔ بس صاحب مقابلے کے دن یہ ہوا کہ عین وقت پر میر جمال کے کبوتر کڑی کمان کے تیر کی طرح

دور سے آتے دکھائی دیئے۔ تماشائیوں کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے اور ایک نعرہ بلند ہوا: "وہ آگئے وہ آگئے" اور میر صاحب کے کبوتر آئے، دوسری ٹکڑیوں سے لڑے اور کچھ دیر سب کو ساتھ ملا کر وہیں اُڑتے رہے اور پھر تو صاحب ایک فاتح فوج کی بے شمار مالِ غنیمت لے کر ہزاروں کبوتروں کے ساتھ گھر کو ہو لیے۔ یہ ہے کمال اور فن۔ ہے اس کا کوئی جواب؟"

اور خواجہ صاحب نے اپنی ٹکڑی چبوترے کے سنگِ سُرخ پر بٹھاتے ہوئے چاروں طرف بہ اندازِ فخر اس طرح دیکھا جیسے انھوں نے کوئی بڑا کارنمایاں انجام دیا ہو اور پیالا مار کے ان کی اہمیت بڑھ گئی ہو۔ میر نہال اطمینان سے کھڑے ہوئے زیرِ لب مسکرا رہے تھے۔ بعض صاحبان نے خواجہ اشرف علی کو تحسین و آفرین سے دیکھا اور بعض نے رشک بھری نگاہوں سے اُن کو تک رہے تھے۔ حکیم بشیر بھی اس قصے سے محظوظ معلوم ہوتے تھے لیکن وہ کم سخن اور سادہ لوح تھے اور خیریت اسی میں دیکھی کہ خاموش رہیں کیونکہ خواجہ اشرف علی کی لفاظی کے آگے ان کی ایک نہ چل سکتی تھی....

دونوں وقت مل رہے تھے۔ آسمان پر ڈھلتے ہوئے سورج کی آخری شعاعیں بادامی رنگ بکھیر رہی تھیں۔ اسی وقت اذان کی آواز آئی اور لوگ ایک ایک کر کے بادشاہی دروازے کی طرف جمع ہونے لگے اور جوتے ہاتھوں میں لے لے کر کھڑکی میں سے جھک جھک کر مسجد میں داخل ہو گئے اور چوک سنسان ہو گیا۔ نماز کے بعد میر نہال گھر جانے کو مسجد کے جنوبی دروازے سے باہر آئے تو شام کا ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل رہا تھا اور زندگی کی چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ کہیں پھولوں کی مہک تھی کہیں سیلانی جوڑوں کی چہلیں، شرم کی آواز اور باتوں کی جھنکار۔ ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ جنوبی دیواروں کے نیچے کبابی سا لمبا ٹولی میں بیٹھے کباب

سینخوں پر چڑھا رہے تھے اور کچھ پٹریوں پر بیٹھے دہکتی انگیٹھیوں پر سینکیں سینک رہے تھے اور تکے بھون رہے تھے اور ہوا میں گھی اور چربی کی چراند، بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ اس اشتہا خیز خوشبو سے راہ گیروں کے منہ میں پانی آجاتا اور جب کوئی کباب خریدنے بڑھتا تو کبابی بڑی مشاقی سے قیمہ کو سینکوں پہ چڑھا کر کچے دھاگے سے لپیٹ کر سلگتے ہوئے کوئلوں پر رکھ دیتا اور پلٹتا رہتا۔ جب وہ سک جاتے تو سینکوں سے اتار کر دو ٹکڑے کرتا اور ہرے ہرے دونے میں رکھ کر پیاز اور کیری کا لچھا رکھ اوپر سے کٹی ہوئی ادرک، ہری مرچیں اور ہرا دھنیا چھڑک دیتا، اور گرما گرم دونا گاہک کی طرف بڑھا دیتا۔ جو گھر تک پہنچنے کا صبر نہیں کر سکتے تھے وہ اسی وقت تنوری روٹیاں یا کلچے سے لگا کر کباب وہیں چیٹ کر جاتے یا روکھے ہی کھا لیتے۔ قریب قریب اور کئی خوانچے والے بیٹھے ہوتے تھے جن کے پاس چڑیا کے کباب، انئی کے کباب اور لونگ چڑے کھٹ مٹھے چاٹ والے دہی بڑے سونٹھ کا پانی، پھلکیاں، آلو چھولے، بیچ رہے تھے۔ کہیں پکوڑیاں تلی جا رہی تھیں، کہیں شربت اور فالودے والے میر ٹھ کے روغنی پھول دار رنگین پیالوں اور دلی کے لاکھی برتنوں میں ٹھنڈا ٹھنڈا شربت بیچ رہے تھے۔ لوگ آتے، کوئی شربت سے پیاس بجھاتا کوئی چاٹ کھا کے مرچوں کا مزا لیتا اور اپنی راہ لگتا۔

ٹریم گاڑیاں آ کر تھوڑی دیر کو رکتیں اور بچے اور بونڈا لاری پرانے ٹکٹوں کو جمع کرنے لگتے اور فقیر مسافروں کو گھیر لیتے۔ کوئی کوئی جیب سے نکال کر یا رومال کی گرہ کھول کر پیسہ دو پیسہ ان کو دے دیتا یا ان سنی کر کے دوسری طرف بڑھ جاتا۔

میر نہال اس چھپاتی فضا اور زندگی سے بھرپور نقشے سے بے نیاز گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔......

میر نہال ابھی کھانے سے فارغ ہوئے تھے کہ نذیر آگیا۔ میر نہال کبوتر لے کر چھت پر چلے گئے اور لالٹین کی دھندلی روشنی میں ان کے پر باندھ باندھ کر جال میں چھوڑ دیا۔ پھر لالٹین کی لَو بڑھا کر نئے خریدے ہوئے پٹھوں کو جال کے اندر بڑے انہماک سے دیکھنے لگے۔ جانور واقعی عمدہ تھے اور وہ اپنے انتخاب پر جی ہی جی میں خوش ہو رہے تھے۔ اتنے میں کہیں سے اُڑتا اُڑتا ایک چنڈول منڈیر پر آ کر بیٹھا اور گردن گھما گھما کر گمگھو گھو کرنے لگا۔ چنڈول کی آواز پر میر نہال نے اوپر دیکھا اور اس کو اُڑانے کے لیے گئے۔ اُسی وقت ایک شہاب ثاقب ٹوٹا اور ایک سُرخ لمبی لکیر مٹیالے آسمان پر چھوڑتا ہوا تیزی سے زمین کی طرف گرتا ہوا دکھائی دیا۔ میر نہال ذرا کی ذرا ٹھٹھکے لاحول پڑھی اور چنڈول کو اُڑا کر جال کی طرف پلٹے ہی تھے کہ غفور ہانپتا کانپتا گھبرایا ہوا آیا۔ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے سے اس کا سانس پھول گیا تھا۔

میر نہال نے پوچھا:

"کیا بات ہے؟"

اور اس نے گھبرا کر کہا:

"ببن جان بی کے ہاں سے ایک آدمی آیا ہے اور کہہ رہا ہے کہ اُن کی حالت خراب ہے۔"

غفور کے منہ سے اتنا سنتے ہی میر نہال کا دل سُن سے ہو گیا اور پاؤں تلے کی زمین نکلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ وہ بات جس کا مدتوں سے ان کو کھٹکا تھا جیسے آج ہونے ہی والی تھی۔ وہ اس خبر سے کچھ ایسے سراسیمہ ہوئے کہ انھیں بدحواسی میں جال کا دروازہ بھی بند کرنا یاد نہ رہا اور وہ فوراً ہی نیچے اُتر آئے۔

⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘

۳

جب میر نہال بنّن جان کے ہاں جانے کو گھر سے نکلے تو رات کے دس بج چکے تھے۔ لوگ جاگ رہے تھے۔ گو وہ سرِ شام کی رونق اور گہما گہمی ختم ہو چکی تھی مگر چہل پہل باقی تھی۔ کچھ لوگ اپنے گھٹے ہوئے کلھیا سے گھروں اور ان کی چار دیواریوں کی قید سے نکل کر کھلی ہواؤں میں ادھر ادھر گشت کر رہے تھے۔ چند دکانوں کے سامنے ہنسی مذاق کر رہے تھے یا تنبولی سے پان بنوا کر کھا رہے تھے۔ کوئی اکیلا دکیلا آدمی گلیوں سے نکلتا یا ان میں گھس جاتا تھا۔ ایک راہ گیر سامنے سے آتا ہوا قریب والی گلی میں مڑا اور یا خوفِ تاریکی یا احساسِ تنہائی کی وجہ سے گانے لگا۔

پس مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اُسے آہ دامنِ بادنے سرِ شام ہی سے بجھا دیا

میر نہال کا دل یکبارگی زور زور سے دھڑ دھڑ کرنے لگا اور بُرے بُرے وسوسوں نے ان کو خائف کر دیا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھانے لگے لیکن خوف و ہراس برابر ان کا پیچھا کرتے رہے جیسے کوئی چپکے چپکے بار بار کہہ رہا ہو "وہ مر جائے گی

وہ مر جائے گی۔ بنّن جان کی جدائی کا خیال ان کو شاق گذرا اور وہ یہی سوچتے رہتے کہ اگر وہ چل بسی تو ان کی محبت کا دم کون بھرے گا پھر ان کی پرواہ کس کو رہے گی؟

یہ ضرور تھا کہ وہ گھر بار والے تھے اور ان کی ضرورتوں اور آرام و آسائش کا خیال رکھنے والی ان کی بیوی موجود تھیں۔ لیکن یہ گھریلو دنیا بے کیف و خشک تھی۔ تنقیص خانگی جھمیلے اور ذمہ داریوں کا بوجھ اور کامیش زندگی کی حقیقتوں میں گرفتار جسم و جان تھے اور تراوٹ سے محروم دل، جس میں نہ چاؤ تھی نہ لذت پانچ برس پہلے انھوں نے بنّن جان کو محض وقت گزاری اور اپنی دل بستگی کے لیے بطور داشتہ رکھ لیا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ ایک وقت آیا کہ یہ وقتی دلبستگی بڑھتے بڑھتے اس قدر بڑھی کہ دونوں میں رشتہ محبت استوار ہو گیا اور انھوں نے بنّن جان کے ہاں اپنی دنیا الگ بسالی، ایک خواب کی سی دنیا جہاں پہنچ کر وہ اپنے تمام غم غلط کر لیا کرتے اور اپنے تئیں تھوڑی دیر کو بھول جاتے تھے جس سے روح میں نمو اور زندگی کی خواہش تر و تازہ اور شاداب ہو جاتی تھی اور اب پیرانہ سالی میں یہ سارے تکلیف دہ احساسات جو احتیاجِ دل کا باعث ہو رہے تھے اور ان کو اپنی زندگی کی شام ہوتی دکھائی دی جس میں تنہائی کے سائے طویل اور ویران تھے۔

جب وہ بنّن جان کی گلی میں پہنچے تو کسی ڈیوڑھی میں کوئی شخص کھڑا ہوا کسی کو یہ شعر سنا رہا تھا:

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد

اور یہ سنتے ہی میر نہال کے ٹھنڈے پسینے چھوٹ گئے۔ اب تو ان کو پورا یقین ہو گیا

کہ بین جان ختم ہوگئی۔ وہ قدم رکھتے کہیں تھے اور پڑتا کہیں تھا۔ کچھ دور چلے تھے کہ ایک بلی اچانک کہیں سے نکلی اور ان کا راستہ کاٹتی ہوئی ایک کونے میں دبک کر بے بسی سے میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی تنہا ہے اور محبت کی بھوکی۔ ابھی وہ چند قدم آگے گئے تھے کہ کسی گھر میں سے نیند میں ڈرے ہوئے بچے کے بلک بلک کر رونے کی آواز آئی جو اپنی ماں کو بے اختیار پکار رہا تھا۔ اس کے بعد ہر طرف سکوت ہی سکوت پھیل گیا۔

جب میر نہال بتن جان کے ہاں پہنچے تو اس کی ماں اکیلی بیٹھی ہوئی چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر میر نہال کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ ان کے حلق میں کانٹے پڑ گئے اور انھوں نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلیہ راجعون کہا اور پوچھنے لگے۔ کب انتقال ہوا؟ ان کی ماں نے میر نہال کو دیکھا اور بولی:

"آدھ گھنٹہ ہوا!"

پھر وہ پچھاڑیں کھانے لگی اور بین کرنے لگی:

"میرے بڑھاپے کا سہارا دیا تھی۔ میں تنہا خالی ہاتھ رہ گئی۔ اس کے تو ابھی بہاروں کے دن تھے۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ میں کیا کروں۔ یہ منحوس دن دیکھنے کو میں تنہا رہ گئی۔ اب کون ہے جو میرا خیال کرے گا۔" روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔

میر نہال کا اپنا حال شدتِ غم سے غیر تھا لیکن وہ بڑے ضبط سے کام لے کر اسے دلاسا دینے لگے:

"قانونِ قدرت کے فیصلے اٹل ہیں اور حکمِ خداوندی سے سرتابی کی مجال کسی کو نہیں۔ البتہ صبر ان تمام کلفتوں اور اذیتوں کا علاج ہے جو ہمیں

وقت کے ہاتھوں اٹھانی پڑتی ہیں اور اب رونے دھونے سے کیا فائدہ؟"
لیکن وہ برابر روتی رہی۔ ماما کے آگے ساری تسلّی تشفّی بے کار تھی۔
لہٰذا میر نہال اٹھے اور برآمدے میں آئے جہاں مٹّن جان سر سے پاؤں تک چادر سے ڈھکی ہوئی تھی انھوں نے لالٹین اٹھا کر لَو بڑھائی اور رسان سے اس کا منہ کھول کر دیکھا۔ اگرچہ وہ مرچکی تھی پھر بھی موت اس کا حُسن نہ چھین سکی۔ اس کی بھویں کھنچ کر کماندار ہوگئی تھیں اور اس کے ہونٹ بڑی نزاکت سے ایک دوسرے سے پیوست تھے اور ان پر ایک خموش تبسم تھا جیسے وہ بے ثبات جہاں کی بے ثباتی کا مذاق اڑا رہی ہو اور اس کا چہرہ کچھ اس قدر پُرسکون تھا کہ یہی معلوم ہوتا تھا وہ گہری اور میٹھی نیند سو رہی ہے اور اپنے خوابوں میں اس حقیقی مسرت کا دائمی راز پالیا ہے جو اس پُرآشوب جہاں میں نصیب نہیں۔

فراوانیٔ رنج وغم سے مغلوب ہوکر میر نہال نے اُس کے منہ پر چادر اُڑھادی اور لالٹین رکھ کر صحن میں آگئے۔ ابھی تک اُس کی ماں دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے ساکت و صامت بیٹھی ہوئی تھی اور آسمان کو پتھرائی ہوئی نظروں سے تک رہی تھی گویا اس کے واسطے ہر شے لایعنی اور بے مقصد ہے۔ میر نہال بھی اس کے پاس آکر ایک طرف کو بیٹھ گئے۔ اچانک وہ بہت ضعیف اور مغموم نظر آرہے تھے۔ ان کے اعضاء کی طاقت سلب ہوچکی تھی اور سارا جسم پل بھر میں کاہیدہ، نزار و ناتواں ہوگیا تھا گویا خزاں ان کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔

بہت دیر تک میر نہال کہیں دور کھوئے خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں غرق رہے پھر آہستہ سے پوچھا:

"تم نے اپنی برادری والوں کو بھی اطلاع کروادی؟"

"جی ہاں! استاد جی سب کو سناؤنی دینے گئے ہیں۔ گھڑی بھر میں وہ

سب آجائیں گے اور میرے دل کے ٹکڑے کو مجھ سے جدا کردیں گے ۔"

بیٹی کی یاد میں پھر اس پر رقت طاری ہوگئی اور اس نے دوبارہ آہ و بکا شروع کردی :

"اتنی بڑی دنیا میں یکا و تنہا رہ گئی ۔ اس کا غم میں اکیلی اٹھاؤں گی !" وہ تاسف سے کبھی ہاتھ ملتی اور کبھی اپنا سینہ پیٹتی ۔ غم نے آنسوؤں کی راہ دیکھ لی تھی ۔ جب وہ جی بھر کے رو چکی تو اس کی دل کی بھڑاس ایک حد تک کم ہوگئی ۔

میر نہال نے اس خیال سے کہ اب اس کے برادری کے لوگ آتے ہی ہوں گے اس کی ماں کو روپیے دیے اور اٹھ گئے ۔ اس وقت ان کا دل سُن تھا اور دماغ ماؤف ۔ انھوں نے جاکر مرنے والی پر دیر تک محبت و حسرت کی ایک آخری نگاہ ڈالی ۔ ایک سیلِ غم آیا اور ان کی تمام تمناؤں اور آرزوؤں کا اندوختہ بہا کر لے گیا اور وہ چراغ جو کچھ عرصہ پہلے ان کے دل میں جل رہا تھا گُل ہوگیا ۔ انھوں نے اپنے مضمحل اور بے طاقت قدم اٹھائے اور اور ایک تھکے ماندے مسافر کی طرح وہاں سے لوٹ آئے ۔ وہ راہِ محبت مسدود ہوچکی اور وہ بَین جان جس کی خاطر وہ یہاں آتے تھے موت کی نامعلوم وادیوں میں جاچکی تھی اور اب اس کا کھوج پانا بھی مشکل تھا ۔ اس دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کو واپس نہ لاسکتی تھی ......

میر نہال کی صبح جب آنکھ کھلی تو سب سے پہلا خیال ان کو بَین جان کا ہی آیا اور اس کی یاد آتے ہی دل سے ایک دھواں سا اٹھا اور وہ نڈھال ہوگئے روح غمناک تھی اور چہرہ پژمردہ ۔ ان کا جی اپنی جان سے بھی گزر جانے کو چاہتا تھا ۔ وہ بہت دیر تک بُت بنے پلنگ پر گُم سُم بیٹھے رہے ۔ سرگشتگی کا یہ عالم تھا کہ کچھ کرنے کو طبیعت نہ چاہتی تھی ، لیکن تا بہ کے ۔ کارِ جہاں کے تقاضوں نے مجبور

کردیا اور وہ بہت بے دلی سے اُٹھ کر زندگی کی مصروفیتوں میں لگ گئے۔

جب وہ اپنے کبوتروں کو دیکھنے کو کھٹے پر جانے لگے تو سیڑھیوں پر کبوتروں کے پر بکھرے ہوئے نظر آئے اور جب چھت پر پہنچے ہیں تو ہر طرف پَر ہی پَر اُڑ رہے تھے، اور ہوا نے سمیٹ کر ایک کونے میں پَروں کا انبار لگا دیا تھا۔ ان کی نگاہ جال پر گئی جس کا دروازہ وہ رات کو اپنی بے حواسی میں کھلا چھوڑ گئے تھے اور بلّیوں نے موقع پاکر دھاوا بول دیا تھا اور جی کھول کر کبوتروں کا قتلِ عام کیا تھا۔ محض چند کبوتر کسی طرح جان بچا کر باہر اُڑ گئے تھے جو بلّی کا لقمہ بن جانے سے بچ گئے، مگر وہ بھی منتشر پَروں کو دیکھ دیکھ کر نیچے اُترتے ہوئے سہم رہے تھے۔ لیکن جب انھوں نے اپنے مالک کو دیکھا تو ایک ایک کرکے اُترے اور ان کے شانوں پر ایک امید میں آ بیٹھے اور میر نہال کی ڈاڑھی میں اپنی چونچیں مار مار کر دانا مانگنے لگے۔ کبوتروں کی اس معصومانہ اور بے غرض حرکت میں محبت کا کچھ ایسا انداز تھا کہ میر نہال کا جی بھر آیا اور ان کے سینہ میں ایک تلاطم برپا ہو گیا۔ ان کو اپنی آشفتہ حالی پر ترس آنے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ ان کو یوں محسوس ہوا کہ افراطِ رنج اور وفورِ غم سے ان کا دل پاش پاش ہو جائے گا اور سوزِ دروں نے کچھ ایسا پامال کیا کہ صرف ایک بے ثباتی تھی جو انھیں محصور کیے رہتی۔ ان کے چاروں طرف ناپائیداری کی خندقیں اور ان کے سامنے موہومِ جہاں کے سوا باقی کچھ نہ تھا۔

کبوتر بازوں کی پُرشور آوازیں لگاتار آ رہی تھیں ——— جب کبوتروں کی ٹکڑیاں زنّاٹے بھرتی ہوئی ان کے سر پر سے ہو کر شائیں سے گزرتیں تو پَروں کی سرسراہٹ اور پنجنیوں کی سریلی چھن چھن ان کے کانوں میں آتی اور خواجہ اشرف علی کی آواز اور دل کی آواز سے بالا سنائی دیتی۔ مگر انھیں کیا؟ خواجہ اشرف علی ہوں، کبوتر ہوں یا کبوتر باز یا ان کی گوہا اور ہا کو؟ صد حیف ———

کوئی یہاں جاوداں نہیں۔ نہ بہار کو قرار ہے نہ خزاں کو ثبات۔ ہر شے آتی جاتی
ہے۔ پل بھر میں سب فنا ہو جائے گا۔ دُنیا نقش بر آب ہے اور زندگی حباب...

خاصی دیر تک ان پہ یہی کیفیت طاری رہی، لیکن کبوتر بھوکے پیاسے تھے
انھوں نے چونچیں مار مار کر دانے کا تقاضہ کیا۔ باقی کے کبوتر دوسرے جال میں
بند تھے جو پنجۂ اجل سے محفوظ رہ گئے تھے۔ میر نہال نے ان کا جال کھول کر دانا ڈالا
اور بچے ہوئے کبوتر بھی اسی جال میں چُنے گئے۔ جب وہ دانا دے کر جال کا دروازہ
بند کر رہے تھے تو اچانک انھیں خالی جال میں دھب دھب کی آواز آئی جیسے
کوئی زور زور سے کود رہا ہو۔ انھوں نے جا کر دیکھا تو ایک خونخوار بلی جال میں
تھی جو رات کو سارے کبوتر ہڑپ کرنے کے بعد جال کے بالائی حصہ میں اطمینان
و بے فکری سے آرام فرما ہو گئی تھی اور اب باہر نکلنے کو اوپر سے کودی تھی۔ جیسے
ہی بلی نیچے کودی میر نہال نے جھپٹ سے جال کا دروازہ بند کر دیا۔ پھر جا کر زینہ
کے پٹ بھی بند کر کے کنڈی لگا دی اور کبوتر اڑانے کی جھنڈی لے کر جو ایسے
موقعوں پر ہمیشہ مضبوط اور کارآمد ثابت ہوتی تھی اپنا انتقام لینے بلی پر پل پڑے۔
بلی چاروں طرف دوڑ دوڑ کر باہر نکل جانے کا راستہ ڈھونڈ رہی تھی۔ تمام ناکے
میر نہال پہلے ہی بند کر چکے تھے۔ چنانچہ بلی راستہ نہ پا کر جان بچانے کو جال کی دیواروں
پر لٹک گئی اور اوپر سے کود کر جانے کی جدوجہد میں تھی کہ میر نہال نے بلی کو نیچے
اتارنے کے لیے دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلا دیکھ کر اُس نے باہر نکلنے کے لیے جست
لگائی اور جوں ہی دہلیز پر پہنچی میر نہال نے بھرپور وار اس کے سر پر کیا۔ بلی یکلخت
لڑکھڑائی مگر تنت اٹھ کر دیوار کی جانب دوڑی۔ چھلانگ ماری لیکن منڈیر
تک نہ پہنچ سکی اور اس نے پنجوں کی مدد سے دیوار پر چڑھنا شروع کیا۔ اگلے پاؤں منڈیر
کی کگر تک پہونچ چکے تھے کہ میر نہال نے پھر جا لیا اور اب کے ایسی کاری ضرب لگائی

کر وہ ایک دل خراش میاؤں کر کے نیچے آپڑی۔ لیکن وہ پھر اٹھی اور اس دفعہ زینے کی طرف لپکی، جب اس کو بھی بند پایا تو پھر پلٹی۔ اس سے پہلے کہ وہ کہیں اور پناہ لیتی لکڑی ٹھیک اس کے مغز پر پڑی اور وہ ادھ موئی ہو کر بے حس و حرکت ملنی ملمی ہاتھ پیر پسار کر پڑ گئی۔ مگر میر نہال کی جچی تلی لکڑیاں تابڑ توڑ اس پر برستی رہیں اور وہ تھکیچا تھکیچا کر اسے مارتے رہے یہاں تک کہ ان کے بازو شل ہو گئے اور وہ خود پسینے میں شرابور۔ اس سے بدلہ لینے کی بس یہی ایک صورت تھی۔

بلی سے اس طرح انتقام لینے کے بعد ان کا دل کچھ ہلکا ہوا اور وہ تعلق جو دنیا سے عارضی طور پر منقطع ہو چکا تھا پھر قائم ہو تو گیا مگر ان میں سے زندگی کی رمق جا چکی تھی، وہ رمق جو فروغ زندگانی کی ضامن ہے۔

وہ اب اتنے بد دل ہو چکے تھے کہ اپنے کام پر بھی نہیں گئے۔ جب وہ ہی نہ رہی تو پھر کس کے لیے کمائیں؟ ان کے بیٹے باپ کی خدمت کرنے کے خواہاں تھے۔ بار بار خوشامد کرتے کہ "ابا میاں آپ کے دن اب آرام کے ہیں، آخر ہم کس لیے ہیں؟" مگر بیٹوں کے مستقل اصرار کے باوجود میر نہال نے اپنا کاروبار ترک نہیں کیا تھا اور وہ اس قدر غیور اور خوددار تھے کہ ان کی حمیت نے یہ بات گوارا نہ کی کہ چلتے ہاتھ پیروں کسی کے محتاج ہو جائیں، چاہے وہ اپنی اولاد ہی کیوں نہ ہو؟ علاوہ ازیں وہ اپنی کمائی کے خود مالک و مختار تھے، جس طرح جی چاہتا خرچ کرتے، جس پر چاہتے اٹھاتے، کسی کی پابندی نہ تھی۔ وہ اپنی آمدنی میں سے بیوی کو سوائے لگے بندھے پاندان خرچ کے کچھ نہیں دیتے تھے کیوں کہ گھر کے اصراف کے واسطے جائداد کا کرایہ معقول اور کافی تھا۔ رہی اُن کی اپنی کمائی تو اس میں سے بیشتر تو بتّن جان کے چاؤ چونچلوں پر اُٹھ جاتی اور جو باقی بچتی وہ ان کے دوسرے شوقوں اور دوست احباب پر خرچ ہو جاتی

اب اس کی ابدی مفارقت سے وہ سررشتہ ہی گم ہو چکا تھا جو جذبات کو لطافت اور اُمنگ عطا کرتا ہے۔

بتن جان کی موت نے ان کا دل مجروح کر دیا اور کچھ ایسا داغ ہوا تھا کہ نومید ہو کر خواہشیں دل سے ہی چلی گئی تھیں، اور اُن کی جگہ یاس و حسرت نے لے لی تھی۔ اب ان کی بلا سے بیٹے اُن کا خرچ اٹھائیں یا کوئی غیر۔ لہٰذا انھوں نے سرے سے کاروبار کو بھی طاق پہ اٹھا رکھا۔

۴

وہ جب گھر کے اندر گئے تو دلہن نے پوچھا:

"میاں آپ کے کبوتر تو ٹھیک ہیں؟ کل رات کو موئی بلی کہیں سے ایک کبوتر لا کے تخت کے نیچے بیٹھی کھا رہی تھی۔ میں نے جا کر کابک کے کبوتر دیکھے وہ تو سب سلامت تھے۔"

میر نہال نے گمشدگی کے عالم میں گلوگیر آواز سے جواب دیا:

"میرا ہی ہوگا۔ کل رات بلیوں نے کبوتروں کا صفایا کر دیا۔"

"ہے ہے۔" بیگم نہال زور سے پریشان ہوتے ہوئے بولیں:

"خدا کی مار بلیوں پر جان کا عذاب بن گئیں، نہ معلوم دلی میں بلیوں کی فوج کہاں سے آ گئی۔ کمبخت جال میں کیسے گھس گئیں؟"

میر نہال نے بے پروائی سے جواب دیا:

"رات کو جال کا دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا۔"

"بیچارے کبوتر!" مہرو نے افسوس سے کہا: "ابا وہ تو آپ کے سب سے

عمدہ کھوتر تھے نا ؟"

میر نہال نے ٹھنڈا سانس بھرا اور بولے :

"ہاں بیٹی ! خیر جو ہونا تھا سو ہو گیا ۔"

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئے اور دور باورچی خانے میں دلچین کو دیکھنے لگے جو کھانا لے کر آ رہی تھی ۔

جب وہ دسترخوان پر بیٹھے تو انھیں کھانا کھانے کی مطلق خواہش نہ تھی مگر زبردستی نوالے زہر مار کرتے رہے ۔ بتن جان کسی طرح ان کو بھلائے نہ بھولتی تھی بار بار یہی خیال ستاتا تھا کہ دنیا عجب جا ہے ، بہت سنگ دل اور خود غرض ۔ کل ہی کی بات ہے کہ وہ اس دنیا میں زندہ تھی ۔ روح کا وجود اس میں سمایا ہوا تھا اور حرارت و تمازت سے اس کی ہستی گرم و گداز تھی اور جسم میں زندگی رقصاں جس کا پرتو اس کے سراپا پر پڑ رہا تھا ۔ مگر آج وہ شہر خموشاں میں بے خبر سو رہی ہے ۔ خاک کا سخت بچھونا اس کے حسین و کومل بدن میں چبھ رہا ہوگا اور اس کے وہ تیکھے نقش و نگار وہ اس کے گلگونہ رخسار موت کی سیاہ چادر میں اپنا حسن اور اپنی رعنائی کھو بیٹھے ہوں گے اور اس کا پیکر خراب و خستہ اور اس کی تمام ہستی ایک رنگ شکستہ ہو چکی ہو گی اور میں جو اس کی زندگی میں محبت کا دم بھرتا تھا یہاں بیٹھا ہوا کس مزے سے لقمے پہ لقمہ اُتار رہا ہوں گویا اس کی موت کوئی سانحہ نہ تھی اور میں اِس زندگی کی ہوا میں شامل ہوں جو چشمکِ پیالہ و ساغر کی طرح پلک جھپکتے ختم ہو جائے گی ۔ اور ان کا دل اپنی اس بے حسی پر منفعل ہو کر ملامت کرنے لگا ۔ اس وقت اس دنیا کا ذرّہ ذرّہ تیر و نشتر کی طرح ان کے رگ و پے میں چبھتا ہوا معلوم ہوا جس کی کھٹک میر نہال کی روح تک اُتر گئی ۔

آنکھیں طوفان لانے پر تُلی بیٹھی تھیں لیکن انھوں نے انتہائی ضبط سے اپنے

آنسو پی لیے۔ ایک تاسف بھری سرد آہ لبوں تک آئی اور چلی گئی اور دل کا درد دل ہی کو دکھا کر رہ گیا۔ پرنم آنکھوں سے وہ باہر دیکھنے لگے۔ صحن میں مہندی کی کملائی ہوئی پتیاں اور کاغذوں کے پرزے پھیلے ہوئے تھے۔ ہوا بے پروائی سے آئی اور سب کو ایک ہی جھونکے میں اڑا کر نالی کے کنارے لگا دیا۔ وہاں سے ہٹ کر ان کی نگاہیں کھجور کے درخت پر پڑیں جس کی پھننگ پر کھلی دھوپ پوری شدت سے پڑ رہی تھی۔ سورج نے اس کے پتوں کو پھونک کر خشک کر دیا تھا اور درخت نیم مردہ دکھائی دیتا تھا۔ ہوا جب اس کے زرد پتوں کو ہلاتی ہوئی گزری تو ایک بے کیف سی کھڑکھڑ کا دھیما شور ابھرا اور اس میں موت کا راگ اور فنا کا اداس نوحہ نالہ و شیون کرتا ہوا سنائی دیا۔ انھوں نے آہ بھری اور اپنے سے کہا: "میر صاحب راہِ حیات کا آخری موڑ آ ہی گیا۔"

بیگم نہال سامنے بیٹھی ہوئی اپنے میاں کا بغور مطالعہ کر رہی تھیں۔ میر نہال کے چہرے کا رنگ اڑا اڑا اور ان کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے جو یاس و حسرت کا پتہ دیتے تھے، وہ سمجھیں کہ شاید میاں کو اپنے جانوروں کا صدمہ ہے۔ وہ کبوتروں کے شیدائی تھے اور کبوتروں کی وجہ سے اکثر دونوں میں نوک جھونک ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن آج میاں کا اترا ہوا چہرہ اور انھیں چپ چپ دیکھ کر بیگم نہال کو اس وقت سچ مچ افسوس ہوا اور وہ ایک ہمدرد و غمگسار بیوی کی طرح بڑے خلوص سے دلدہی کرتے ہوئے کہنے لگیں،

"اے تو اس میں آخر ایسی کڑھنے کی کیا بات ہے جو کل سے جی ہلکان کیے لیتے ہو۔ مر گئے تو مر گئے۔ نہ جانے گھر کی کون سی بلا ٹلی۔ موئے وہ بھی کوئی ایسی بڑی چیز تھے، بازار سے اور لے آؤ، نہیں تو نذیر سے کہلوا بھیجو وہ یہیں پہنچا دیگا دنیا بھی آتی جاتی ہے۔ موئے کبوتروں کی موت پر کوئی یوں تمہاری طرح اپنی جان

پر بنا لیتا ہے؟"

میر نہال نے بیوی کو کچھ اس بے کسی سے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں افسوس تم میرے اصل رنج سے بے خبر ہو اور جو کچھ تم سمجھ رہی ہو سراسر غلط ہے۔ مگر انھوں نے بیوی سے محض اتنا کہا:

"تم کہتی تو ٹھیک ہو، مگر یہ شوق ہی اب ختم ہوا۔" پھر وہ دستر خوان سے اُٹھ کر باہر چلے گئے۔

انھوں نے نذیر کو بلوایا اور اپنا ایک ایک کبوتر فروخت کرنے کو دے دیا۔ پہلے تو نذیر سمجھا کہ میاں یوں ہی کہہ رہے ہیں، لیکن میر نہال کو سنجیدہ دیکھ کر اس کو اچنبھا اور تکلیف ہوئی۔ وہ منّت سماجت کرنے لگا، مگر آج میر صاحب کا فیصلہ اٹل تھا اور وہ مجبور ہو کر بادلِ ناخواستہ کبوتر لے کر چلا گیا۔ اور کبوتر بِک گئے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

بلّی کو غفور سے گلی میں کوڑے کی کراچی پر پھنکوا دیا تھا۔ لیکن شام کو جب میر نہال گلی میں سے گزرے تو دیکھا کہ بلّی موری کے کنارے بیٹھی ہے اور انھیں آتا دیکھ کر لنگڑاتی ہوئی ایک کونے میں جا دبکی۔ میر نہال کو بڑا تعجب ہوا کہ نالی کا پانی اس کے لیے آبِ حیات بن گیا اور وہ کمبخت اتنی شدید چوٹوں کے باوجود زندہ تھی۔ اُن کو اس وقت اس بات کا احساس ہوا کہ زندگی کسقدر سنگین اور سخت جان ہے۔ وہ انسان کو بھی اسی طرح پے بہ پے ضربوں پہ ضربیں لگا کر گھائل کر دیتی ہے۔ گو انسان چوٹوں سے بے تاب اور زخموں سے چور چور ہو جاتا ہے۔ مگر کچھ عرصے نزار و نڈھال رہنے، دکھ درد و آزار کھینچنے کے بعد اس میں پھر سے جان داری اور تندرستی و توانائی آجاتی ہے۔

بلّی کو زندہ دیکھ کر انھیں ببّن جان بے اختیار یاد آگئی اور اس کی یاد کے

میر نہال نے جواب دیا:

"اللہ کا شکر ہے اور آپ کی عنایت۔ آج کچھ تکان سی ہے۔"

نواب پتن نے کچھ اور پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ باتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ذوق اور داغ کا کلام زیر بحث تھا۔ تھوڑے توقف کے بعد میر نہال بھی اپنے کو بھول بھال کر گفتگو میں شامل ہو گئے۔ ان کو سب شعرا میں میر تقی میر بہت پسند تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میر کا اندازِ بیان نہ صرف قدیم وضع اور پرانی روایات کا آئینہ دار تھا بلکہ انھوں نے شاعری میں ایک اچھوتے اسلوب اور دل میں کھُب جانے والے نئے رنگ کی طرح ڈالی تھی۔ جب بات تغزل کی نزاکتوں تک پہونچی تو میر نہال نے کہا:

"صاحب میں یہی کہوں گا کہ چاہے اور شعرا نے کتنے بھی خوبصورت شعر کیوں نہ کہے ہوں، جو پُر کیف سادگی اور بے پناہ نزاکت میر کے رنگ میں ہے وہ کچھ میر ہی کا حصّہ ہے۔ اور پھر ان کے عاشقانہ خیالوں کا سوز و گداز، اضطراب و قلق اور حرمان و مایوسی اور میر کے تغزل کا وہ نمایاں جوہر، اُن کی حُسن پرستی کچھ ایسا والہانہ اور انوکھا ہے کہ وہ شاعری میں سب سے الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ کسی میں بھی ان کی ندرت کہاں؟"

نواب پتن نے محض میر نہال کو چھیڑنے کی غرض سے کہا:

"اور میر صاحب کچھ اُستاد ذوق کو بھی دادِ سخن عطا ہو۔" حالانکہ وہ جانتے تھے کہ میر نہال کو ذوق کے کلام سے ذرا بھی لگاؤ نہ تھا۔

اس پر میر نہال برجستہ بولے:

"صاحب ذوق کا کیا ٹھکانہ۔ ان کی تو آپ جیسی ہستیاں شیدا ہیں اور انھیں سراہتی ہیں۔ میں بندۂ ناچیز بھلا ان کی شان میں کیا لب کشائی کر سکتا ہوں؟"

"ارے صاحب آخر ایسی بھی کیا تنگ دلی ہے کہ میر کے علاوہ آپ کسی کی تعریف ہی نہ کریں۔"

میر نہال کہنے لگے:

"حضرت جو سچ پوچھیے تو میں ذوق کے متعلق اتنا کہوں گا کہ وہ محض درباری شاعر تھے۔ چونکہ بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے لہٰذا ان کا کلام بھی امراد رؤسا کو مرغوب تھا۔ عوام میں تو وہ زیادہ مقبول نہ ہوئے۔ رہے میر تقی تو ان کا ثانی نہ پیدا ہوا ہے نہ ہوگا۔ مومن اور غالب بھی اس ظالم کی بات پیدا نہ کر سکے۔ میں تو کہونگا کسی میں نہ آئے گی وہ بات مولوی مدن کی سی۔ دلی والوں کے ہر دل عزیز شاعر تھے۔ زبان واہ واہ، صاف سلجھی نکھری ستھری۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں کی منجھی منجھائی زبان ہے، ٹکسالی اردو کے وہی اکیلے جھگڑے استاد ہیں۔" اور میر نہال نے میر کے دو چار شعر لطف لے لے کر سنائے۔

چوں کہ محفل میں نواب سراج الدین خاں سائل بھی موجود تھے اور نواب مرزا خاں داغ کے داماد تھے اور ان کی تعریف و توصیف کے پل باندھتے تھے نواب بتن نے جولانیِ طبع میں میر نہال سے کہا:

"اچھا صاحب مان لیا آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں اور ذوق درباری شاعروں کے زمرے میں آ گئے، لیکن استاد داغ کی شاعری کے متعلق حضور کا کیا ارشاد ہے؟ داغ کا طوطی تو عوام میں بول رہا ہے۔ خاص کر زبان اور محاورہ ان کا بھی ٹکسالی ہے۔ ان کی زبان بھی ٹھیٹھ دلی کی ہے اس پر ان کی تیکھی بندش اور چستی اور ان کا بے ساختہ پن۔ میر صاحب میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ داغ کا پلہ بھاری ہے۔ رہا اصناف شاعری کا تو اس میں غم و حسرت کے سوا اور بھی تو چیزیں ہیں۔ زبان کا چٹخارہ، واردات عشق، داغ کا وہ شوخ اور عیار

معشوق، اس کی شرارتیں، بے وفائی، اس کا وہ ناز و غمزہ و عشوہ، اپنے جور و ستم پر اس کی بے باک ڈھٹائی، اور پھر مقطع میں تخلص کا برجستہ باندھنا میر صاحب یہ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔"

میر نہال نے نواب پتن کی باتوں کا جواب سائل کے لحاظ سے نہ دیا۔ لہٰذا تھوڑی دیر بزم میں خاموشی رہی۔ نواب پتن نے سب کو پان پیش کیے۔ ایک آدھ نے پیچوان اپنی طرف سرکائے، ایک دو کش لگا کر اپنی طلب بجھائی اور اس کے بعد سائل صاحب نے بہ نظرِ عقیدت یہ اپنا فرضِ عین سمجھا کہ اپنے خسر داغ کا کمالِ فن ثابت کریں۔ لہٰذا نواب پتن سے مخاطب ہو کر سخن آرا ہوئے۔ ان کی پاٹ دار آواز صحن کے آخری کونے تک واضح اور صاف سنائی دیتی تھی:

"حضرت آپ نے جو کچھ استاد داغ مرحوم کے لیے فرمایا میں اس کی تائید کرتا ہوں۔ صاحب، استاد کے شعر کیا ہیں معلوم ہوتا ہے رُو بہ رُو بیٹھے ہوئے باتیں ہو رہی ہیں۔ اور زبان؟ زبان کے کیا کہنے۔ واللہ ایک ایک حرف جچا تُلا نیا۔ نگینے کی طرح ترشا ہوا جس کا ہر پہلو مرصع۔ اور میاں کیوں نہ ہو، زبان اور محاورہ ان کے دست بستہ لونڈی غلام تھے جن کو برتنے میں ان کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ نواب صاحب، شاعری میں مزہ زبان اور خیال دونوں کا ہے۔ لیجیے استاد کا بس ایک ہی مقطع عرض کرتا ہوں:

اگر نام و نشاں پوچھیں تو قاصد یہ بتا دینا
تخلص داغ ہے وہ عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

بلاشبہ استاد اس فن میں لاثانی و یکتا تھے۔ ہم تو میاں ان کو شاعری میں اپنا پیمبر اور قبلہ جانتے ہیں۔"

سب چپ چاپ سائل صاحب کی گفتگو سنتے رہے اور ان کے ارشاد

کے بعد بحث کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ حاضرین کو لاجواب پاکر سائل کا دل باغ باغ ہوگیا
اور وہ داغ کی برتری پر پھولے نہ سماتے تھے۔

مغرب کا وقت قریب تھا اور شام کی سیاہی دھیرے دھیرے بڑھ رہی
تھی۔ مکانوں اور پیڑوں کے سائے لمبے لمبے ہوکر گہرے ہو چلے تھے۔

دن بھر کا تھکا ماندا افتادہ آفتاب سکون و آرام کی جستجو میں اس خطۂ خاک
کے اُس پار کسی اور حسین اور دلفریب دنیا میں چلا گیا تھا۔ ہوا میں گرد و غبار تھا،
اور آسمان تاب و تب سے محروم ہوکر بے رنگ دکھائی دیتا تھا۔ لیکن غروب
آفتاب کے ساتھ ہی افق شوخ نارنجی رنگ سے رنگ گیا پھر مدھم روشنی پورے
مغربی آسمان پر یہاں سے وہاں تک پھیل گئی جس کے عکس سے ہر شئے گلنار ہوکر
خوب صورت دکھائی دیتی تھی اور اس سُرخ اجالے میں اچانک احساس ہوتا
تھا کہ قلبِ کائنات تھوڑی دیر کو سُپردِ حیات ہوگیا ہے۔

ایک ایک کر کے نواب چھٹن کے سب مہمان رخصت ہوگئے اور جب صرف
میر نہال اکیلے رہ گئے تو نواب چھٹن نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا:

"میر صاحب اب کے تو بہت دنوں میں یاد فرمایا۔ کہیے بتّن جان کا کیا
حال ہے۔ آپ نے بتایا تھا کہ اس کی طبیعت خراب ہے۔"

میر نہال فرش کو دیکھتے ہوئے بولے: "کل شب اس کا انتقال ہوگیا۔"

نواب چھٹن یہ سن کر ذرا چونکے اور پھر کہا:

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ یہ تو بُری خبر سنائی۔ اللہ مغفرت کرے۔ سُن کر
بڑا صدمہ ہوا۔ کیا ہوا تھا؟"

میر نہال افسردگی سے کہنے لگے: "ایسی تو بیمار نہ تھی کہ پروانۂ اجل آجائے
معمولی موتی جھرہ نکلا تھا۔"

نواب بتن دلجوئی کرتے ہوئے بولے :
"آپ کو تو خیر اس سے جو تعلق تھا سو معلوم ہے، مگر مجھے بھی اس کی مرگِ ناگہاں کا سُن کر خاصی تکلیف ہوئی۔ بالکل جوان تھی۔"
لمحہ بھر کو دونوں پرانے جلیس و ہمدم خاموش ہوگئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اوراقِ ماضی پلٹ رہے ہوں۔ محلّے میں کہیں ایک بچّہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا، اور ایک مرد کے زور زور سے ڈانٹنے کی آواز آرہی تھی۔
یہ دنیا ایک آئینہ خانہ ہے جس طرف نگاہ اٹھاؤ اپنی ہی صورت نظر آتی ہے یہاں تک کہ اپنے ہجومِ عکس اور کثرتِ تصویر سے انسان خود اپنے آپ سے ہیبت زدہ ہو جاتا ہے۔ اور میر نہال کو یہی معلوم ہوا کہ ابھی ابھی جو بچے کے رونے کی آواز سُنائی دی تھی وہ دراصل ان ہی کی آوازِ شکست اور ان ہی کے دلِ تباہ کی صدا تھی۔ اس گھڑی بھر میں ان کو ضبط کا یارا نہ رہا۔ صبر و شکیب اس قدر کھنچے کہ ان کا دامن ہاتھوں سے چھوٹتا ہوا محسوس ہوا ان پر ایک جنون کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور ان کا جی چاہتا تھا کہ اپنا دامن تار تار کر دیں اور ایک بچّے کی طرح بے اختیار دھاڑیں مار مار کے رونے لگیں۔ اتنے میں نواب بتن کے بولنے کی آواز آئی اور وہ ناگوار سکوت ٹوٹ گیا اور میر نہال اپنے آپے میں آگئے۔ نواب بتن کہہ رہے تھے :
"آپ نے تو میر صاحب کمال کر دیا۔ ذرا دیکھیے تو سہی ایک دن میں صورت کیا سے کیا ہو گئی۔ ایک رنڈی اور اس کا اتنا غم کہ گھُل کر رہ گئے۔ حضرت اللہ کی دی بہت۔ آپ کو کیا کمی ہے ایک اور داشتہ رکھ لینا۔"
اس بات کا جواب میر نہال دیتے بھی تو کیا دیتے۔ نواب بتن ان کے جذبات کی تہہ تک رسائی نہ کر سکتے تھے۔ دولت اور امارت سے ان میں

رعونت آ گئی تھی۔ قلب و جگر کی واردات وہ کیا سمجھتے۔ محبت ان کے واسطے ایک قلیل متاع تھی۔ یہ خیال ہی ان کے فہم و شعور سے کوسوں دور تھا کہ کبھی کبھی ایک ٹکے کی کسبی کی محبت اور اس کی موت کسی شخص کی دلگیری کا سبب بن سکتی ہے۔ میر نہال صاحب دل تھے۔ محبت کی تھی، اس کا مزہ معلوم تھا۔ وہ محبت کی چبھن اور چبھن کی وہ میٹھی میٹھی دلگداز کسک اور اس کی درد انگیز خلش جانتے تھے اور اس وقت نواب ببّن کی بات ان کو بارِ خاطر تو بہت ہوئی لیکن پاسِ مروّت اور بہ خیالِ دوستی یہ کہہ کر ٹال دی:

"ببّن صاحب! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں ابھی جوان ہوں؟ حضرت ذرا میری یہ وضع دیکھیے اور یہ میری عمر دیکھیے۔ اب ہمارے تو یہ دن ہیں کہ کسی گوشے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کریں۔"

اسی وقت موذّن نے مغرب کی اذان کہہ کر جیسے میر نہال کے اس کہنے کی پوری پوری تصدیق کر دی۔ نواب ببّن اور میر نہال نماز کے لیے کھڑے ہو گئے درختوں کی اونچی اونچی چوٹیوں پر بے گنتی کوّے کائیں کائیں کر کے بسیرے کے لیے جمع ہو رہے تھے اور جنگلی کبوتروں کے غول کے غول عمارتوں اور مکانوں کی چھتوں پر اُتر اُتر کر چھجّوں اور موکھوں میں جگہ تلاش کر رہے تھے۔

نماز ختم ہوتے ہی نواب صاحب کا ملازم پیچوان لے کر حاضر ہو گیا جس کی فرشی نقرئی تھی اور اس پر ریخ رنگی میناکاری کے پھول پتّے بنے ہوئے تھے اور چنبل کے چاروں طرف چاندی کی زنجیریں لٹک رہی تھیں سٹک اور مُنال پر موتیا کے تازے تازے ہار لپٹے ہوئے تھے۔ نواب ببّن گاؤ تکیہ سے لگ کر غالیچے پر بیٹھ گئے، اور بڑے اطمینان و آسودگی سے حقّے کے کش لگانے لگے، اور میر صاحب سے مخاطب ہوئے:۔

"مبارک ہو۔ سنا ہے آپ کے صاحبزادے کی شادی مرزا شہباز بیگ کی دختر سے ہو رہی ہے۔ آپ نے مجھ سے اس کا تذکرہ تک نہ کیا۔"

میر نہال نے اصغر کو کچھ اس طرح بھلا دیا تھا کہ اس کا خیال ہی اُن کے ذہن سے یوں اتر گیا تھا جیسے اصغر کا وجود کبھی تھا ہی نہیں۔ اصغر بھوپال جا کر برسرِ روزگار ہو گیا تھا اور گھر میں اس کی شادی کی تیاریاں ڈھکی چھپی ہو رہی تھیں۔ گو میر نہال کو ان باتوں کا علم تھا مگر وہ جان کر انجان بنے رہے، اور زیادہ پرواہ نہ کی کیونکہ ایک تو یہ رشتہ ہی انھیں ایک آن پسند نہ تھا اور پھر اجازت تو درکنار کسی نے ان کو کانوں کان بھی خبر نہ کی تھی۔ پھر ان کو کیا پڑی تھی کہ خواہ مخواہ خود پوچھتے اور کچھ کہتے البتہ جو حیرت انھیں ہوئی وہ اس بات پر کہ یہ خبر گھر سے باہر الم نشرح کیسے ہوئی۔ اب اگر وہ نواب بیتن کے کہے کی تردید کرتے ہیں تو اس کا یہی مطلب ہو گا کہ یا تو میر نہال خود دروغ گوئی کر رہے ہیں۔ یا پھر مرزا شہباز بیگ۔ اور صرف مرزا شہباز بیگ ہی نے نواب بیتن کو بتایا ہو گا۔ وہ اسی کشمکش میں تھے کہ نواب بیتن کے اچانک سوال کا جواب کیا دیں۔ چاہے وہ اصغر سے کتنے ہی خفا اور کبیدہ خاطر کیوں نہ رہے ہوں تھا تو آخر اُن کا ہی خون اور ان کا بیٹا۔ بھلا وہ کیسے گوارا کر لیتے کہ غیروں کی نگاہوں میں وہ سبک ہوں، چاہے وہ نواب بیتن جیسا عزیز اور پرانا دوست ہی کیوں نہ ہو۔ اور اس خیال کے ساتھ ہی ان کے دل میں آئی کہ اصغر کو اس کی حسب مرضی شادی کرنے کی اجازت دے دینی چاہیے۔ اپنی اپنی کھیتی آپ پار اُترنی۔ میر نہال نے خود بُری بھلی جیسے تیسے اپنی زندگی تو گزار دی۔ اب ان کو دوسروں کی زندگی سے کیا واسطہ؟ شادی اصغر کی ہو رہی تھی۔ نباہ اسے کرنا تھا اور جب اُسے خود ہی اپنے نیل بگڑ جانے کا خیال نہ تھا تو پھر انھیں دُگدا میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ کوئی قیامت کے بوریے سمیٹتے تو بیٹھے نہ رہیں گے۔ ان کی بلا سے اصغر اشرافوں کی

بیٹی لائے یا دھنے جگاہے کی۔ وہ خود تو ستایہ سحری تھے۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ اوران کا ضمیر مطمئن تھا کہ وہ اپنے تمام فرائض اور ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ زندگی کے نشیب و فراز اور برائی بھلائی سمجھا دینا ہی ایک باپ کا فرض ہوتا ہے جو وہ خوش اسلوبی سے انجام دے چکے تھے۔ اب اولاد ان کی بات ماننے یا نہ مانے۔ حتی المقدور انھوں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تھا۔ نہ صرف یہی بلکہ آج تلک اسلاف کی نجابت اور بزرگوں کی عزت و آبرو کو بندریا کے مُردہ بچے کی طرح اپنے سینے سے چمٹائے ہوئے تھے اور خاندان میں کسی قسم کی فی نہ کرنے دی تھی جو کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع ملتا۔ لیکن کس لیے اور کیوں؟ ان کو کیا ملا۔ زندگی ان پر کون سی مہربان ہوئی اور مقدر نے ان کے ساتھ کونسا اچھا سلوک کیا جو انھیں اب کوئی ارمان اور تمنا ہو؟ اس آخری وقت میں اگر ان کا بیٹا بھی پر پرزے نکال کر ان کے ہاتھوں سے جا تا رہے تو یا تقدیر یا قسمت۔ مقدر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ رنج و افسوس بے بنیاد ہیں۔

پھر کیوں نہ ہنس کر ہر تلخی کو گوارا کر لیں۔ اگر اصغر کی شادی ان کی بے اجازت ہو گئی تو پھر ان کی بزرگی اور ان کی اپنی حقیقت کیا رہ جائے گی؟ حالات کو بد سے بدتر بنا کر مفت کی جگ ہنسائی اور ذلت و خواری اٹھانا کہاں کی عقلمندی ہے؟ اب انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے ضعیف اور بوڑھے شانے بارِ گراں اٹھانے کے قابل نہیں رہے۔ جوانی کے جاتے ہی زندگی کا طنطنہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ وہ سب باتیں بھولے بسرے خواب ہو گئیں اور اس بڑھاپے میں جو حقیقت باقی رہ گئی تھی وہ میر نہال کی ذرا سی خودی تھی۔ اس چھوٹی سی شمع کو انھوں نے تمام عمر زیرِ داماں رکھ کر ہر حادثہ اور طوفان سے بچایا تھا۔ اور جس طرح باعزت وہ اُس کے اجالے میں جیے تھے اب اسی اُجالے میں اسی خودداری سے اس دار الفنا کو الوداع

کہہ کر موت کا مسرور خروئی سے استقبال کرنا چاہتے تھے۔

برق کی لہر کی طرح آنِ واحد میں یہ سارے خیالات ان کے دماغ میں آئے اور ان کو ایک نئی ہمت دلا کر صابر و متحمل بناتے ہوئے گزر گئے۔ چنانچہ میر نہال نے نواب مہنّٰن سے کہا:

"بھلا یہ ممکن ہے کہ اصغر کی شادی ہو اور آپ کو اطلاع نہ کی جائے۔ شادی ابھی بہت دور ہے۔ میں اپنی گتھیوں میں ایسا الجھا رہا کہ ادھر دھیان ہی نہ دیا۔"

گھر پہنچتے ہی انھوں نے اپنی بیوی کو بلا کر اجازت دے دی کہ اصغر کا جہاں جی چاہے اس کی شادی کر دو۔

۵

مصائب و آلام کے باوجود انسان زندگی سے رشتہ استوار کرلیتا ہے، کیوں کہ زندگی کے بہاؤ کا ہر حالت میں آگے بڑھنا لازمی ہے۔ میر نہال بھی قسمت پر صابر و شاکر ہو کر حسبِ معمول زندگی گزارنے کے خوگر ہو گئے۔ یہ ضرور تھا کہ وہ کام پر نہ جاتے تھے اور کبوتر اڑانے کا شوق ان کی دیرینہ خوشیوں اور یادوں کے ساتھ دائمی نیند سو گیا تھا۔ یہ عہدِ رفتہ کی باتیں تھیں اور ماضی کو وہ بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اب زندگی کی راہ دھندلی اور کٹھن تھی مگر وہ ہمت اور استقلال سے تنہا اس پر چلنے کو تیار ہو چکے تھے۔

بیکاری میں بیٹھے بیٹھے حکمت کا پرانا ذوق پھر تازہ ہو گیا، اور ایک دن انھوں نے صندوق کھول کر وہ ساری حکمت کی بیاضیں اور کاغذات نکالے جن میں کبھی دوائیں اور نسخے درج کرلیے تھے۔ انھیں کتابوں میں کیمیا بنانے کی یادداشتیں بھی موجود تھیں۔ اور وہ وقت جو خالی بیٹھے بیٹھے گزارنا ان کو وبالِ جان تھا، بڑی دلچسپی میں کٹنے لگا۔ وہ صبح سے شام تک بڑی محویت سے دوا دارو بنانے میں

مشغول رہنے لگے۔ پیٹ کے درد سے لے کر فالج، لقوہ اور کھانسی کی گولیاں، چورن اور تیل تیار کیے جاتے۔ انواع و اقسام کی جڑی بوٹیاں جمع کر کے احتیاط سے شیشوں اور ڈبوں میں بند کی جاتیں۔ پھر یہ سلسلہ اتنا بڑھا کہ ان کے پاس ایسے فقیروں اور دوستوں کا مستقل جمگھٹا رہنے لگا جو جڑی بوٹی کے سینہ بہ سینہ آئے ہوئے مجرّب نسخوں کے مالک تھے۔ ان ہی میں چند سادھوؤں نے بھی آنا جانا شروع کر دیا جو کیمیا کے دھتّی اور عمر کا سنہری حصہ اس کے حصول میں رائیگاں کر چکے تھے۔ یہ لوگ بیٹھ کر آپس میں تبادلۂ خیالات کرتے۔ جڑی بوٹیوں کے اوزان پر بحث ہوتی، ماہیت و خواص پر تبصرے، اور نسخوں پر مکرّر نظر ثانی کی جاتی۔ کبھی ترمیم و اضافے ہوتے اور کبھی کاٹ چھانٹ، اور جا بجا ذکر در کے ساتھ ساتھ پیر فقیر، سائیں گسائیں، جوگی یوگی اور اللہ والے باکمال لوگوں کے عجیب و غریب قصے اور ناقابلِ یقین حکایتیں بیان کرتے۔

اس دلچسپ جماؤ میں ایک شخص میر سنگی بھی آیا کرتے تھے ان کا سر گنجا تھا اور کالے تام ڑے پر سفید چھوٹے چھوٹے بال باقی رہ گئے تھے۔ جو بالکل جمگادڑ کا رُواں نظر آتے تھے۔ کسی زمانے میں یہ امیر و کبیر رہے تھے لیکن کیمیا گری کے شوق میں ان کی دولت اور تمام اثاثہ پھونک چکا تھا لیکن انھیں سونا بنانے میں ایک دفعہ بھی کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس کی جستجو میں جنون شوق وہی تھا۔ اس قماش کے آدمیوں میں لال شاہ بھی تھے۔ لمبی ڈاڑھی ہمیشہ سُرخ رنگی رہتی تھی اور اس کی وجہ سے یہ لال شاہ کہلانے لگے تھے جس قدر ناک اونچی اور نمایاں تھی آنکھیں اسی قدر چھوٹی چھوٹی۔ سارا جبڑا تو جا چکا تھا لیکن سامنے کے دانت سلامت تھے جن پر کھانے کے ذرات ریخوں میں چپکے ہوئے دکھائی دیتے تھے اور دانتوں پر پھپھوند آ کر بالکل زرد ہو گئے تھے اور بلا مبالغہ ان کو دیکھ کر گھوڑے کے بڑے بڑے

دانت باد آجاتے تھے۔ ان کی سیاہ فام رنگت میں جگہ جگہ کالونس کے گہرے دھبے کچھ اس طرح چمکتے تھے جیسے وہ کسی جلدی مرض میں مبتلا ہوں اور جو سب سے زیادہ مضحکہ خیز بات ان کی ذات میں تھی وہ یہ کہ وہ اس رنگ وروپ پر سفید کنٹوپ اوڑھے رہا کرتے تھے۔

ایک روز میر نہال بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ میر سنگی مولوی دُلہن کو لے آئے۔ یہ سدا سہاگن تھے، سُرخ ساڑھی، ہاتھ بھر کے چھنچھناتی ہوئی سبز سُرخ چوڑیاں، عورتوں کی طرح پیٹھ پر لمبی لمبی لٹیں جو خوشبودار تیل میں ڈوبی ہوئی تھیں اور کمر تک آرہی تھیں۔ آنکھیں سُرخ مگر کاجل سے کجلائی ہوئی۔ بظاہر دنیا سے ناطہ توڑ کر سچے پیا سے جوڑ لیا تھا اور اللہ میاں کی دُلہن کہلانے لگے تھے لیکن کیمیا بنانے کا نشہ ابھی ہرن نہ ہوا تھا۔ میر نہال نے ان کو بارہا دیکھا تو تھا مگر ان کے اس شوق کا علم نہ تھا۔ وہ تو میر سنگی نے کسی طرح سُن گن پائی تھی تو میر نہال کے ہاں لے آئے۔

مولوی دلہن نے بڑے رازدارانہ انداز میں پوچھا:

"آپ کو اس نسخہ کا علم ہے جو جامع مسجد کے شمالی دروازے پر کندہ ہے؟"

لال شاہ بتیا بانہ بولے:

"ہاں قبلہ جانتا ہوں اور مدتیں بلکہ اپنی عمر اس کی تلاش میں برباد کی ہے لیکن قبلہ آپ کچھ بتا سکتے ہیں کہ اس نسخے میں وہ کیا چیز ہے جو نہیں لکھی ہے۔ ہو گی تو اڈھی کی چیز مگر ہنوز معلوم نہ ہو سکی۔ اگر اس بوٹی کا اتا پتا مل جائے تو سبحان اللہ پھر تو ساری مشکل ہی آسان ہو جائے۔"

مولوی دُلہن کہنے لگے:

"ایک دفعہ مجھے ایک بزرگ نے وہ چیز دکھائی تھی جو جامع مسجد والے نسخے

میں "آدھی کی وہ مہ کے نام سے دی ہوئی ہے۔"

"آخر وہ کیا تھی؟" لال شاہ بڑی جستجو اور اشتیاق سے پوچھنے لگے۔ مولوی دلہن بولے:

"تھا کیا۔ یہ ایک سنہری پھول تھا جس کی پنکھڑیوں پر سرخ سرخ ٹیکے اور کنکریاں نگینے کی طرح جڑی تھیں۔"

"صاحب اس کا نام کیا تھا؟" میر نہال بھی دلچسپی سے پوچھنے لگے، کیونکہ انھیں بھی ایک ایسا ہی پھول دیکھنا یاد آ گیا، جس کا نام شب چراغ تھا۔ مولوی دلہن بولے:

"مجھے اس کا نام تو یاد نہیں رہا شاید عطرِ زریں تھا۔ یہ جب کی بات ہے جب مجھے یہ گمان بھی نہ تھا کہ مجھے بھی کیمیا بنانے کا شوق چرائے گا۔ کم سنی کا زمانہ تھا۔ میں اپنے ماموں کے پاس ایک گاؤں میں رہا کرتا تھا۔ ایک دن یہ شاہ صاحب اپنے پھیرے پر آئے اور گاؤں کی مسجد میں قیام کیا۔ بچپن سے مجھے صوفیوں اور فقیروں سے والہانہ عقیدت اور لگاؤ تھا۔ بس میں شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر رہنے لگا۔ ان کے پاؤں دباتا، کھانا کھلاتا اور ان کی ہر چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کو بہ دل و جان پورا کرتا۔ مجھے ان سے روحانی انس و محبت ہو گئی اور وہ بھی مجھ پر مہربان رہنے لگے۔ ایک دن کی بات ہے کہ میں اکیلا تھا۔ مجھ کو اپنے پاس بلایا اور اپنے بٹوے میں سے وہ پھول نکال کر دکھایا اور کہا بچہ یہی وہ چیز ہے جس کا نام جامع مسجد والے نسخے میں سے غائب ہے، اور یہی کیمیا کا اصل جز ہے۔" میں کھڑا کھڑا اشتیاق اور حیرت سے اس پھول کو دیکھتا رہا۔ پھر انھوں نے کہا:

"دیکھ پہچان لو۔ کبھی برا وقت آن پڑے تو اس پھول سے سونا بنا لینا۔ مولا چاہے تو بیڑا پار ہو گا۔"

میر نہال مولوی دلہن کی بات کاٹ کر کہنے لگے :

"کیا آپ کے ان شاہ صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ پھول کس جگہ دستیاب ہو سکتا ہے؟"

مولوی دلہن نے وثوق سے کہا :

"جی ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ شاہ صاحب نے بتایا تھا کہ یہ پھول راجپوتانہ کی پہاڑیوں میں ملتا ہے۔ وقت وقت کی بات ہے۔ جب مجھے اس کی قدر نہ تھی تو غیب سے مدد ہوئی۔ اس کے بعد سینکڑوں مرتبہ اس پھول کو تلاش کیا۔۔۔۔۔"

اتنا کہہ کر وہ رک گئے۔ سب ہمہ تن گوش ہو کر اس پر اسرار کیمیا کی باتیں سن رہے تھے۔ ان کی خاموشی پر سب کی نگاہیں مولوی دلہن پر جم گئیں اور ان کے دل اس خیال سے بلیوں اچھل رہے تھے کہ بس اب کیمیا کے راز کی عقدہ کشائی ہوئی اور اب ہوئی۔ کمرے کی فضا ساکت تھی اور امید و بیم کی گھڑیاں گزارنی مشکل ہو رہی تھیں مولوی دلہن کے ایک جملے پر کیمیا کا دارومدار تھا۔ وہ لوگ سدا سہاگن کے دوبارہ لب ہلنے کے انتظار میں تھے۔ مولوی دلہن اپنی انگلیوں کو جن میں پور پور چھلے اور انگوٹھیاں تھیں دیکھ رہے تھے۔ آخر آہستگی سے کہنے لگے :

"اس کے بعد سینکڑوں مرتبہ اس پھول کو تلاش کیا۔ اس جیسے ہزاروں پھول تھے لیکن جو شاہ صاحب نے مجھ کو دکھایا تھا وہ نہ تھا۔ میں نے ان شاہ صاحب کی تلاش میں صحرا نوردی کی لیکن آج تلک دونوں میں سے کسی کو نہ ملنا تھا نہ ملے۔"

اس گفتگو کے ساتھ ہی وہ شوق جو سب کے دلوں میں موجزن تھا، حسرت تمنا بن گیا ــــ کاش وہ پھول مل جاتا۔

کافی توقف کے بعد میر نہال نے میر سنگی سے کہا :

"یہ وہی پھول ہوگا جو مجھے اس لوہار نے دکھایا تھا۔"

لال شاہ پر دلاوی دلہن کے قصے کا بڑا اثر تھا، لیکن میر نہال کے اس جملے پر ان کے کان کھڑے ہو گئے اور انھوں نے پوچھا:

"میر صاحب کون سا پھول ہے کیا آپ نے کبھی دیکھا ہے؟"

میر نہال نے کہا:

"اللہ مغفرت کرے ماموں جان مرحوم بڑے خدا رسیدہ بزرگ تھے جوانی ہی میں انھوں نے دنیا کو چھوڑ دیا تھا عشقِ الٰہی میں مضطرب و بے قرار رہتے تھے۔ ایک دن یہ بے قراری اس قدر بڑھی کہ چپکے سے گھر سے نکل گئے۔ برسوں دشت و بیاباں میں روپوش رہے، اور جب دُرویشی کی تمام سنگلاخ منازل طے کرلیں تو راجپوتانے کی گھاٹیوں میں مسکن بنالیا، اور وہیں اللہ اللہ کرنے لگے۔ ماموں جان سونا بنانے کے راز سے بھی واقف تھے۔ مجھ کو تو یہ بات اتفاقاً اس طرح معلوم ہوئی کہ اللہ بخشے ماموں کے انتقال کے کوئی بیس برس بعد میرا جانا راجپوتانہ ہوا۔ میں ان کی قیامگاہ جولق و دق پہاڑوں میں تھی گیا۔ اب وہیں آپ کا مزار مبارک ہے۔ وہاں ایک شخص سے ملنا ہوا، جو ذات کا لوہار تھا لیکن بعد میں میرے ماموں کا مرید ہوگیا تھا۔ جب اُس کو یہ معلوم ہوا کہ میں اُس کے پیر و مرشد کا بھانجا ہوں تو اُس نے وہ پھول مجھ کو دکھایا۔ وہ خود سونا بناتا تھا۔ یہ علم میرے ماموں نے اس کو سکھایا تھا اس پھول کو شب چراغ کہتے ہیں۔ اللہ اللہ اس کا سنہری رنگ آج تک نگاہوں کے سامنے پھرتا ہے۔ کندن کی دمک اس کے سامنے ماند تھی۔ وہ لوہار ایک مرتبہ مجھے بھی اپنے ساتھ لیکر وہ پھول لینے گیا تھا۔ یہ پھول چاند کی آخری تاریخوں میں کھلتا ہے۔ اس دن گھپ اندھیری رات تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا تھا۔ پہاڑ پر چڑھنا تھا، راستہ انتہائی خطرناک اور جنگلی جانوروں کی آوازیں دل ہلائے دیتی تھیں۔ جب ہم ڈھلان پر پہونچے تو لوہار مجھ سے کہنے لگا اب ہاتھ پاؤں کے بل چلو اور ہم کھسک کھسک کر

آگے بڑھنے لگے اور جب ہم اس اصل جگہ پہونچے جہاں وہ پھول کھلنا تھا تو وہ آہستہ آہستہ سرکنے لگا بالکل اس طرح جیسے بلّی اپنے شکار کی طرف بڑھتی ہے اس کے ایک ہاتھ میں رومال تھا اور دوسرا ہاتھ ہوا میں بلند۔ وہ مجھ سے کہنے لگا کہ صرف وہ پھول ہمارے کام کے ہیں جن میں جگنو کی سی روشنی کی ہلکی ہلکی شعاع لپکتی نظر آئے یا وہ جو کبھی کبھار جگمگا اٹھیں۔ وہ ہاتھ ہوا میں اٹھائے ہوئے اسی طرح بڑھتا رہا جوں ہی کوئی چیز چمکتی وہ فوراً نوچ لیتا تھا اور اپنے رومال میں رکھ لیتا۔ بڑی دیر تک وہ پھول توڑ توڑ کر جمع کرتا رہا اور جب اس کا رومال بھر گیا تو ہم وہاں سے واپس ہوئے۔ پو پھٹنے والی تھی۔ گھر پہونچ کر وہ پھول میں نے اجالے میں دیکھا۔ مولوی صاحب نے جس پھول کا تذکرہ کیا تھا یہ ہو بہو اس کا مشابہ تھا۔ لوہار اور جڑی بوٹیوں کے ساتھ کیمیا پھونکنے کی تیاری کر رہی رہا تھا کہ مجھے عجلت میں دلّی واپس لوٹنا پڑا اور سونا بنانے کا طریقہ اپنی نگاہ سے نہ دیکھ سکا۔۔۔۔۔؟

لال شاہ کفِ افسوس ملتے ہوئے مری ہوئی رسی آواز میں بولے:

"واللہ میر صاحب کیسی غلطی ہوئی۔ علمِ عظیم اللہ تعالیٰ خود آپ کو عطا فرمانا چاہتا تھا اور آپ نادانی میں محروم رہے۔"

میر سنگی نے بھی ایک لمبی اور ٹھنڈی آہ بھری اور اپنی چچا زاد بہن کا قصہ سنانے لگے جنہوں نے بچپن میں ایک دفعہ چاندی بنائی تھی:

"ہوا یہ کہ ایک دفعہ وہ اپنی ہمجولیوں کے ساتھ کوٹھے کی چھت پر گڑیاں کھیل رہی تھی۔ وہ سب مل کر اپنی گڑیا کے واسطے رانگ کا زیور گھڑ رہی تھیں۔ ایک کمر چھے میں رانگ بھر کر انھوں نے آگ پر رکھ دیا۔ جس وقت رانگ گرم ہو کر پگھل گیا تو یہ کسی کی عقل میں نہ آیا کہ اس کو ٹھنڈا کس طرح کیا جائے۔ کم عمری بھی عجیب ہوتی ہے۔ اور تو کچھ انھیں سجھائی نہیں دیا، چھت پر جو خودرو بیل بوٹے برسات

میں آگ آتے تھے پگھل کر ان کا عرق رانگ پر ڈال دیا۔ بس عرق کا ڈالنا تھا کہ زور سے چھن مُن ہوئی اور رانگ بیٹھ گیا اور کڑھیے میں جم کر رہ گیا۔ میری بہن بہت گھبرائی کہ اماں سنیں گی تو بڑی صلواتیں سنائیں گی۔ مارے ڈر کے اس نے کڑھیا باورچی خانہ میں چھپا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سجاد سے چچا ابا کو چلم بھرنے کے لیے آگ کی ضرورت ہوئی تو انھوں نے کڑھیا ڈھونڈا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ اس کے اندر چاندی کا ڈلا پڑا چمک رہا ہے۔ پھر تو انھوں نے پوچھ گچھ شروع کی اور معلوم ہوا کہ یہ کارنامہ ان ہی کی صاحبزادی کا ہے۔ اوپر جا کر ساری جھاڑی بوٹیاں دیکھیں کہ آخر یہ کرشمہ کس بوٹی کا تھا۔ لیکن بچیوں نے کوٹ پیس کر ان کا ایسا حلیہ کیا تھا کہ گھور گھور کر دیکھنے پر بھی پہچان نہ ہو سکی۔"

میر سنگی یہ قصہ سنا ہی رہے تھے کہ کمبل شاہ موٹا سا ڈنڈا بجاتے ہوئے دیوان خانے میں آ گئے۔ اپنی وضع کے یہ بھی ایک ہی تھے۔ یہ افغانستان کے باشندے تھے اور زبان تو ٹوٹی پھوٹی بولتے تھے۔ ٹخنوں سے اونچا تہبند باندھتے اور ایک کمبل تمام دن اوڑھے رہا کرتے تھے۔ برسات جائے جاڑا آئے جیٹھ بیساکھ ہو ان کا کمبل بدن سے جدا نہ ہوتا تھا اور وہ کمبل بھی عجوبۂ روزگار تھا۔ ہر رنگ کی کترن اور ہر قسم کے کپڑے کے ستر ہزار پیوند اس میں لگے ہوئے تھے۔ لحیم شحیم اور قد آور تو تھے ہی اس پر ان کی لمبی سی گھنی سیاہ داڑھی نے ان کو اس قدر پرجلال بنا دیا تھا کہ لوگ انھیں دیکھتے ہی مرعوب ہو جاتے تھے۔ ان کے لیے مشہور تھا کہ انھوں نے سارے مدارج طے کر لیے ہیں اور اب درویشی کا رتبہ حاصل ہے۔ عام طور پر کاملین اپنی کرامتیں کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ کمبل شاہ سدا ننگے سر اور ننگے پاؤں پھرتے تھے اور لوگ کہتے تھے کہ وہ اس قدر پہنچے ہوئے ہیں کہ آج تک ان کے قدم کا نشان کسی نے زمین پر پڑتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میر نہال سے ان کی ملاقات اس زمانے سے تھی جب وہ شروع شروع افغانستان سے آ کر میر نہال کے ایک قریبی عزیز کے ہاں ٹھہرے تھے۔ میر نہال

سے ان کو خاص انس ہو گیا تھا اور اکثر ملتے رہتے تھے۔ ان کو کیمیا سے کوئی سروکار نہ تھا بلکہ اس کی مذمت کیا کرتے تھے۔ ان کا مقولہ تھا کہ یہ شیطانی علم ہے۔ لیکن اس کے باوجود میر نہال اور ان کے ہم نشینوں کو یہ خوش اعتقادی تھی کہ کمبل شاہ کیمیا کا راز بخوبی جانتے ہیں اور اس خوش اعتقادی کی وجہ صرف اتنی سی تھی کہ ایک بار باتوں ہی باتوں میں انھوں نے میر نہال سے نہیں اتنا کہہ دیا تھا کہ میر صاحب میں اس علم سے واقف ضرور ہوں لیکن میں نے قسم کھائی ہے کہ ہرگز کسی کو اس کا راز نہ بتاؤں گا۔ پھر بھی میر نہال سے ان کے دوستوں اور کیمیا کے دلدادہ مقربین یہ کہا کرتے تھے کہ دیکھ لینا کسی دن کمبل شاہ موج میں آگئے تو آپ کو سب کچھ سکھا دیں گے۔ آپ پر ان کی خاص نظرِ کرم ہے آپ ان کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہ کیجیے گا اور وہ سب اس مبارک ساعت کی آمد کے منتظر رہنے لگے کیونکہ یہ علم ایسے ہی اللہ والوں فقیروں، بھکشوؤں اور جوگیوں کے پاس ہوتا ہے.....

کمبل شاہ بیٹھے ہوئے اپنے کمبل میں ایک کترن کا پیوند لگانے لگے۔ ذرا دیر بات چیت کا سلسلہ بدستور قائم رہا۔ لال شاہ سنانے لگے:

"ایک دفعہ قبلہ والد صاحب کو ایک جوگی نے اکسیر دی تھی جس کی ایک سینک لگاتے ہی تانبا خالص کندن بن جاتا تھا۔"

کمبل شاہ اس پر بولے:

"ہاں اس میں بھی مشیت ایزدی کا اسرار پوشیدہ ہے طرح طرح سے وہ اپنے جلوے دکھاتا ہے۔ وہ اپنا ظہور کرتا ہے اور ہم پہچاننے سے قاصر رہتے ہیں بندوں کو چاہیے کہ اس کے رازوں کو جاننے کی کوشش نہ کریں بلکہ اپنے وجود کی حقیقت اور اسرار ڈھونڈیں۔ اگر ہر شخص کیمیا بنانے لگے تو امیر و غریب کا امتیاز اٹھ جائے گا اور انسان اپنے غرور و تکبر میں خدا سے بے بہرہ ہو جائیں گے۔

اتنا کہہ کر انھوں نے اپنا ڈنڈا سنبھالا اور چل دیئے۔ تھوڑی دیر تک میر سنگی، مولوی دلہن اور لال شاہ ششدر اور کھوئے کھوئے بیٹھے رہے۔ پھر ایک ایک کر کے وہ بھی رخصت ہو گئے۔

برسات کا موسم تھا سورج ڈھل رہا تھا کالی کالی گھٹاؤں کے پس منظر میں سورج کی سرخ، نارنجی اور سنہری روشنی پرسکون بادلوں کے ٹکڑوں پر پڑ کر دلفریب نقش و نگار بنا رہی تھی اور نگاہوں کے سامنے بے شمار سنہرے سنہرے زرّیں خزانے بکھرے ہوئے تھے جنہیں دیکھ کر ذہن ایک ایسی سرمستی سے سرشار اور روح ایک ایسی سرخوشی سے بھرپور تھی جو نا دیدہ اور اچھوتی ہے۔ اور میر نہال دوڑتی ہوئی اودی اودی بدلیوں اور ان کے شہابی کناروں کو دیکھ دیکھ کر یہی سوچتے رہے کہ جو کچھ کمبل شاہ کہہ رہے تھے شاید صحیح ہو۔ ان کے ماموں نے بھی اس لوہار سے یہی کہا تھا کہ کبھی حرص و ہوا کے دام میں نہ گھر جانا۔ بقول لوہار کے ان کے ماموں کا خود یہ چلن تھا کہ جب پیٹ پر پتھر بندھنے کی نوبت آجاتی اور کہیں سے بھی کھیل کا دانا اڑ کر منہ میں نہ آتا تو مجبوراً سونا بنا لیا کرتے تھے اور اس کو بیچ کر جو دام آتے وہ غریبوں اور یتیموں اور فقراء کے کھانے پینے پر خرچ کر دیا کرتے اور محض آٹے میں نمک کے برابر اپنے طعام اور خوردنی پر صرف کرتے۔

یہ واقعہ جب میر نہال نے اپنے دوست احباب کو سنایا تو انھوں نے یہی کہا: "افسوس میر صاحب، بڑی حماقت کی۔ زندگی میں ایسی ساعتیں بار بار تھوڑی ہی آتی ہیں۔ اپنے ہی ہاتھوں سنہری موقع گنوا دیا!" ان سب کی باتوں کا یہ اثر ہوا کہ آخر کار میر نہال کو خود بھی کیمیا میں دلچسپی پیدا ہو گئی، اور وہ نسخے کی تلاش میں دوبارہ راجپوتانے گئے بھی۔ لیکن لوہار مر چکا تھا اور یہ سفر بے سود رہا۔

اس کے بعد تو وہ کیمیا کے درپے ہو گئے اور اس کے راز کی ٹوہ میں عجیب و

غریب ہستیوں سے ملتے رہے سینکڑوں تجربے کیے، دھات اور پتھر طرح طرح سے پھونکے، لیکن ہر بار کچھ نہ کچھ کمی بیشی رہ جاتی تھی۔ کبھی تو وہ زیادہ پھنک جاتا تھا اور کبھی ایک آنچ کی کسر باقی رہ جاتی تھی، سینکڑوں جوگی فقیر، ہزاروں ولی اللہ آئے اور گئے مگر نہ تو کسی نے ان کو کچھ سن گن دی نہ صحیح ترکیب ہاتھ آئی۔ کوئی کہتا پارہ کا کشتہ ابابیل کے گھونسلے کی مٹی اور بیٹ سے پھونکنا چاہیے، کوئی کہتا اسے لومڑی کے خون میں حل کرنا ضروری ہے یا شیر کی چربی میں لپیٹ کر تو ے اُپلوں کی آنچ میں پھونکنا۔ ہر ایک نئی ترکیب بتاتا اور سب سلیمانی قصے سنا کر ان کی جستجو کو اور بھڑکا دیتے، لیکن کوئی فقیر پتے کی بات نہ بتا سکا۔ کبھی کیمیا پھونکتے" وقت میر نہال کو خیال آتا کہ اگر سونا بن گیا تو معجزہ ہوگا۔ مگر ایسے بھی فقیر تھے جو کہتے تھے یہ معجزہ نہیں ہے، بالکل سچ ہے ہم نے اپنی آنکھوں سے خود سونا بنتے دیکھا ہے۔ لیکن میر صاحب کے لیے یہ اعجاز ہی رہا۔ نہ تو کسی نے بنا کر دکھایا نہ وہ بوٹی فراہم کی جس سے میر نہال خود سونا بنا لینے میں کامیاب ہو جاتے۔ مگر پے در پے شکستوں کے باوجود بھی وہ ایک ناکامیاب تجربے کے بعد دوسرا تجربہ بڑے تحمل و استقلال اور امید سے کرتے چلے گئے۔ اور یہ امر مسلّم ہے کہ اگر اس جہاں میں اُمید نہ ہوتی تو انسان خودکشی کر لیتا اور یہ دنیا ایک ایسے بنجر و ویران ریگستان کے مصداق ہو جاتی جہاں پر کہیں کوئی نخلستان نہ ہو۔ پیچ در پیچ فریب کار راہِ حیات پر چلنے والا انسان ہر آنے والے موڑ پر یہی سمجھتا ہے کہ اس موڑ کے بعد اس کی منزل ہوگی اور جب موڑ پر پہونچ جاتا ہے تو وہاں معدومیٔ منزل اور ایک ناکامی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن پھر وہ اپنے دل کو ڈھارس دے کر چل نکلتا ہے اور راستہ اس امید میں طے کرتا جاتا ہے کہ اگلا مقام اس کی منتہائے منزل ہوگا۔ یہ سلسلہ ہائے گردش یوں ہی چلتے رہتے ہیں۔ انسان ہر ہر مقام پر دھوکا کھاتا ہے۔ ہر ہر گام پر نامُرادی حاصل ہوتی ہے لیکن

اس کے باوجود حوصلے ٹوٹ ٹوٹ کر از سرِ نو بنتے ہیں۔ اسی کا نام امید ہے جو نفس بہ نفس قدم بہ قدم انسان کے ساتھ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ اور میر نہال بھی حقیقتوں پر سراب و وہم کا نقاب ڈالے ہوئے جی رہے تھے۔ ماہ و سال اسی طرح گزرتے رہے۔ زندگی اسی طرح اپنے محور پر گھومتی رہی جیسے وہ قدیم الایام سے دنیا کی سلطنت پر حکومت کرتی رہی ہے۔

۶

پھر رمضان آگئے۔ لوگ روزے رکھنے لگے۔ گرمی میں خالی پیٹ لمبا دن گزارنا قیامت معلوم ہوتا مگر دو چار روزوں کے بعد بارشیں شروع ہوگئیں اور روزے سہل ہو گئے۔ سحری کے وقت گداگر چیخ چیخ کر سر سونے والے کو جگا دیتے۔ اشعار گاتے، کنڈیاں کھٹکھٹاتے، رمضان المبارک کے فضائل بیان کرتے، روزہ داروں کو فردوس النعیم کی خوش خبریاں سناتے اور خوابِ غفلت میں رہنے والوں کو روزِ محشر کا خوف دلاتے۔ دو بجے جامع مسجد پر نقارہ بجنے لگتا اور لوگ بیدار ہوکر دودھ میں بھیگی ہوئی پھینیاں اور کھجلے کھاتے۔ مائیں اٹھ کر تازے تازے پراٹھے پکاتیں اور قیمہ گرم ہونے کی خوشبو آتی۔ بچے بھی اٹھ کر بڑوں کے ساتھ سحری کھانے میں شریک ہو جاتے۔ اور سحری ختم کرتے کرتے نثار احمد فجر کی اذان کہتے۔ گولہ دن سے چل کر سحری ختم ہو جانے کا اعلان کرتا۔ لوگ وضو سے فارغ ہوکر خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھتے اور کلام مجید کی تلاوت میں مشغول ہو جاتے۔

دن کو فقیروں کا تانتا بندھا رہتا۔ ایک جاتا تا دوسرا آتا۔ کوئی ٹولیوں میں

آتے۔ کوئی سارنگی یا اک تارا بجاتا۔ کسی کو نعتیں یاد تھیں کسی کو غزلیں۔ پیشہ ور فقیر اور زیادہ دل دوز صدائیں لگاتے۔ بھیک ملنے سے پہلے ہی مائی کی خیر مناتے۔ بال بچوں اور ولی وارثوں کو دعائیں دیتے۔ میر نہال اور ان کی بیوی مسرور کے ہاتھ پیسہ دو پیسے بھجوا دیتے یا دلچین تڑاتی ہوئی دروازے پر جاتی اور پیالہ بھر آٹا یا بچی کھچی روٹی ان کے کشکولوں میں ڈال آتی۔ دونوں وقت ملتے ہی فقیروں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا کیونکہ روزہ کھولنے کے وقت افطاری کی تیاری ہوتی اور ان فقیروں کی جھولیاں مزے دار چیزوں سے بھر جاتیں۔ ایسے فقرا کا رمضان میں کاروبار زیادہ چمکتا۔ خوب پھلتے پھولتے اور آنند کی بین بجاتے۔ تنگ دستی کے بجائے ان کی انٹیاں اتنی گرم ہو جاتیں کہ اپنے گھروں کو بال بچوں کے نام روپیے بذریعہ ڈاک روانہ کرتے۔

اگرچہ ان گداگروں میں بڑی خامیاں تھیں مگر وقت کے وہ سب پابند تھے اور اپنے مقررہ وقت کے علاوہ کبھی پھیری نہ لگاتے۔ اس لیے ان کا آنا لوگوں کو شاید بار بھی گزرتا تھا، بلکہ لوگ ان کی آوازوں سے مانوس اور ان کی صداؤں کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ اگر کبھی کوئی مانگنے والا معمول کے مطابق نہ آتا تو سب کو اس کے نہ آنے کی چنتک ہو جاتی۔ ایک تھے جو ٹھیک رات کے کھانے کے وقت آیا کرتے تھے۔ ادھر دسترخوان بچھا ادھر انھوں نے دروازے پر صدا لگائی اور جس دن وہ نہ آتے بیگم نہال بار بار کہتیں:

"ہے ہے نہ جانے بچارے سائیں پر کیا بپتا پڑی۔ کہیں بیمار تو نہیں پڑ گیا۔ نگوڑا آج نہیں آیا۔"

کچھ ایسے بھی تھے جو مختلف وقتوں پر آتے جاتے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک لوہن شاہ تھے جن کے ہاتھوں میں لوہے کے موٹے کڑے اور چوڑیاں ہوتیں پاؤں

ہیں سیروں وزنی لوہے کی بیڑیاں اور بھاری بھاری لوہے کی زنجیریں گلے کا ہار ہوتیں۔ کوئی بیس سیر لوہا ان کے تن بدن پر ہوتا۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ بچپن میں کسی کامل کے مرید ہو گئے تھے جن کا حکم تھا کہ لوہا پہنا کرنا۔ وہ دن اور آج کا دن وہ پیر کا حکم حرف بہ حرف پورا کر رہے تھے۔ لمبے تڑنگے تاڑ کے تاڑ تھے۔ کسرت کا شوق تھا اور بھنگ گھونٹنے کی لت۔ دنیا میں بس ان کا ایک ہی یار تھا اور وہ ان کی بکری۔ اپنے مالک کی طرح وہ بھی موٹی تازی تھی اور بڑے ٹھسے سے اُن کے ساتھ قدم بہ قدم چلا کرتی۔ سدھی بھی خوب گئی تھی۔ یہ جہاں ٹھہرتے وہ بھی رُک کر کھڑی ہو جاتی۔ ان کی نہ کوئی صدا تھی نہ مانگنے کی کوئی ادا۔ بس نور نامہ جس میں ساتوں افلاک کا ذکر ہے پڑھا کرتے۔ لوحدار آواز میں بلا کی کشش تھی اور طرز میں سوز و گداز جو سونے پر سہاگے کا کام کرتی۔ ان کی آواز جوں جوں قریب ہوتی جاتی اس کی گونج میں تیزی آتی جاتی۔ دور سے ان کی آواز سنائی دیتی:

سو ہے آسماں پانچواں خاص سیم
چھٹا لعل یاقوت سے ہے نئی یم
جو ہے آسماں ساتواں جانچ کا
ہے یک رنگ سارا ہیری کانچ کا

اُن کا پھیرا رات کو دس بجے کے بعد مقرر تھا، اور اُن کے چلے جانے کے بعد بڑی دیر تک فضا میں گونج سنائی دیتی رہتی اور دنیا اور بھی سونی معلوم ہوتی......

سائلوں کی ایک وہ بھی قسم تھی جو سال میں عید بقرعید یا کسی ایسے تیج تہوار اور عرس کے موقعوں پر مختلف مہینوں میں آتے رہتے۔ برس میں ایک بار آئے، چکر لگا یا جو نصیبے کا ہوا بٹورا اور رفو چکر ہو گئے۔ پھر ان کی صورت اگلے سال ہی نظر آتی۔ زیادہ تر وہ گنوار اور دیہاتی ہوتے تھے جو فصل کٹنے کے بعد

زمین جوتنے سے پہلے شہر کا رُخ کرتے تھے۔ وہ یا تو حضرت بابا کانی کرنے کے خیال سے یا جمع جکڑ اختم ہوجانے ہی پر آتے تھے۔

اس گروہ کے ایک شاہ مقبول تھے جو رمضان شروع ہوتے ہی آن دھمکتے اور عید کی ٹر منانے کے بعد غائب ہوجاتے۔ ان کا یہ قاعدہ تھا کہ سویرے سویرے اپنی پھیری شروع کرتے اور اپنی ان گھڑت صدا لگاتے جو نہ گیت معلوم ہوتی اور نہ اس میں نظم کا اتار چڑھاؤ ہی ہوتا:

آئے شاہ مقبول
ایک لیں گے پیسہ اور گز بھر لیں گے لٹھ
آج دے کل دے
عید کے روز مقبول شاہ کا سوال پورا کردے

وہ کسی ڈیوڑھی یا دروازے پر کبھی نہ ٹھہرتے، آواز لگاتے ہوئے گزر جاتے۔ جب تک کوئی بندۂ خدا خود ہی بڑھ کر نہ روک لیتا وہ ہرگز نہ رُکتے۔ ایک پیسہ اور گز بھر لٹھ کے علاوہ کچھ اور لینا ان کو قسم تھا۔ اگر کسی نے آٹا یا روٹی پیش کی تو صاف انکار کر دیتے۔ ان کی اس بے نیازی میں بھی ایک وقار تھا اور ان کی شخصیت جھلکتی تھی۔

مقبول شاہ کی آمد جہاں بچوں کے لیے پیامِ عید ہوتی وہاں بڑوں کے واسطے بھی مژدۂ خوشی۔ ان کے آنے کے بعد تو کیا بچے کیا بوڑھے سب کو عید کا بڑا انتظار رہنے لگتا۔ اب عید قریب آگئی تھی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اصغر کی شادی بھی دور نہ تھی۔ شادی کی تاریخ پہلے تو عید کے چاند ہی قرار پائی تھی لیکن میر نہال کے بڑے بیٹوں کو جو سرکاری ملازمت میں تھے طویل رخصت نہ مل سکی کیونکہ شہنشاہ جارج پنجم کی تاجپوشی کے انتظامات ملک کے اضلاع کے سپرد کر دیے گئے تھے۔ لہٰذا کسی افسر کو چھٹی نہ مل سکتی تھی اور ان کا عملہ بھی اس کی تیاریوں میں

لگا ہوا تھا۔ اس واسطے شادی کی تاریخ آگے بڑھادی گئی اور بات دسمبر پر جا پڑی۔ دسمبر ہی میں جشن بھی ہونے والا تھا۔

بہر نوع میر نہال کے گھر میں اصغر کی شادی کی تیاریاں تو چپکے چپکے مدتوں پہلے سے ہو رہی تھیں۔ اب گھر کے ہر فرد کے ذمہ کوئی نہ کوئی چھوٹا بڑا کام سونپ دیا گیا۔ مسرور بازار سے گوٹا کناری ٹھپا لا لا کر دکھاتا یا بزازوں کے ہاں سے تار بانے، بنارسی اور کمخواب کے تھان لا کر پسند کرواتا۔ سعید حسن زیور بنوانے میں سادے کاروں اور سناروں سے نبٹتے۔ انجم زمانی کے ہاتھ میں سوئی شپا شپ چلتی نظر آتی اور وہ چڑھاوے کے جوڑے کھڑے کرنے یا چھپا پیمک ٹانکنے میں مصروف رہتیں۔ جمال بیگم کی عمر خاصی تھی۔ اٹھک بیٹھک کے کام تو ان کے بس کے نہ تھے، ایک جگہ دھیا دے کر گوٹے کے واسطے کھوپرا اور چھالیہ سیروں کے حساب سے کتر ڈالتیں اور خربوزے کے بیج چھیل کر رنگ دیتیں اور پھر بیٹھی بیٹھی ہدایتیں کرتیں اور نصیحتوں کے پشتارے کھل جاتے:۔

" مہرو، اے مہرو چل تو آ کر ادھر بیٹھ کل کو پرائے گھر جانا ہے۔ ذرا تو دیدہ ٹیکا۔ کل سے جو دوپٹہ سے ہاتھ اٹھایا ہے دھرا ہی نہیں مسل وسل کر آپ ختم کر دیجو پھر بیل لگائیو۔ توبہ ہے آج کل کی لڑکیاں بن سری گھوڑیاں ہو گئی ہیں۔ سینے پرونے میں جی لگتا ہی نہیں۔ اے میری بات سات برس کی عمر میں ہی پکی ہو گئی تھی۔ بوا جب سے اللہ بخشے اماں اور نانی کچھ کہ دیتی تھیں۔ مجال تھی کہ جگہ سے ہل تو جائیں۔ مہرو کی طرح تھوڑی کہ یا تو پڑی سنایا کریں یا ہڈر ہڈر پھرا کریں .....!"

بیگم نہال نے اپنی دونوں بڑی بہوؤں کو پہلے ہی سے بلوا بھیجا تھا کہ ذرا ہاتھ بٹ جائے۔ بڑی دلہن کی تو کچی بال اتنی ڈھیر ساری تھی کہ ان کا پائنچہ بھاری تھا، بھلا اتنی جلدی کیسے آجاتیں البتہ منجھلی دلہن اپنے تین برس کے بچے کو لے کر پہنچ گئیں۔ ان کے ساتھ ان کی اماں بھی تھیں۔ بیگم نہال سے ان کا دوہرا تہرا رشتہ تھا۔ بھاوج بھی تھیں،

سمدھن بھی اور پھوپی زاد بہن بھی۔ ادھر بھوپال سے وحیدہ بیگم معہ اصغر کے آ پہونچیں۔ سب کے آجانے سے بہار سی آ گئی اور ایسی چہل پہل ہوئی کہ میر نہال کا گھر تقریب سے مہینوں پہلے ہی شادی کا گھر معلوم ہونے لگا۔ ہر ایک خوش خوش نظر آتا تھا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ان ہی ہنگاموں میں عید بھی قریب آ گئی۔ بچے اِٹھلا اِٹھلا کر پھرتے۔ ہر ایک کو عید کے لیے نئے کپڑے پہننے کی جلدی تھی۔ اپنی فرمائشیں کر کر کے ماؤں کا دم ضیق میں کر رکھا تھا۔ کوئی کہتا میری نئی لال ٹوپی آ گئی؟ ایک کا تقاضا ہوتا میں نئی جوتی پہنوں گا۔ دوسری بچی مچلتی میں ابھی چوڑیاں پہنوں گی۔ کسی کو اوڑھنی کسی کو مہندی چاہیے تھی۔ غرض ہر بچہ اپنی اپنی دھن میں تھا۔ کپڑوں کے شوق اور عید کے انتظار نے بچوں کو زیادہ چلبلا کر دیا تھا۔ رات کو بھی وہ ان خیالوں کی وجہ سے غافل نہ سوتے تھے اور پھر دن کو چڑچڑاتے رہتے اور ان سب کو قابو میں رکھنا گرُ اور ہنرمندی کا کام تھا۔

شادی کی تیاری دیکھ دیکھ کر اصغر بھی چونچال تھا اور اندر سے باہر تک ایک پیر سے دوڑ دوڑ کر پھیرے لگاتا اور اُسے اپنی ذات بڑی اہم اور ضروری معلوم ہوتی۔ اپنی تنخواہ میں سے بچا کر ہزار روپے جوڑے تھے جو اُس نے باپ کو لے جا کر پیش کیے۔ اُسے پہلی بار دیکھ کر تو میر نہال غیر شعوری طور پر بکھر گئے تھے، لیکن اصغر کی اس سعادتمندی سے دل پسیج گیا اور انھوں نے آج سے اس کو معاف کر دیا۔

آخری روزے کے دن سب نے سرِ شام ہی سے چھت پہ جا جا کر عید کا چاند گھور گھور کر دیکھنا شروع کر دیا لیکن آسمان پر ابر چھایا ہوا تھا اور چاند نظر نہ آیا۔ رات کے کھانے کے بعد توپیں سر ہوئیں اور اس کے ساتھ ہی سب کے چہرے خوشی سے دمک اُٹھے۔ ہر طرف عید کی مبارک سلامت کا غلغلہ ہوا اور رات صبح کی تیاریوں میں گزر گئی۔ بچیاں چوڑیاں پہن اور مہندی ہاتھ پاؤں میں رچا کر بیٹھ گئیں۔

عین عید کی صبح میر نہال کے منجھلے بیٹے حبیب الدین بھی آ گئے۔ یہ نہ صرف والدین کے چہیتے تھے بلکہ پورے خاندان میں ہر دل عزیز۔ چھوٹے بڑے آئے گئے، سب ان کے گرویدہ تھے۔ ان کے آنے کا سنتے ہی سارے کنبے والے اور رشتہ دار شہد کی مکھیوں کی طرح آ کر ان کے گرد جمع ہو گئے۔ ان کی شکل و شباہت باپ سے ملتی جلتی تھی بیضوی ڈاڑھی سے اور وجیہہ اور باوقار نظر آتے تھے۔ آنکھوں کی نرمی میں ذہانت تھی جوان کی رحمدلی اور روح کی پاکیزگی کی ترجمانی کرتی تھی۔ دوستی کے معاملے میں وفا اور ایثار کے پتلے تھے۔ یہ ان کی عالی ظرفی اور وضعداری تھی، جس نے اپنے پرائے کا دل جیت لیا تھا۔ اپنی زندگی کا اصول انھوں نے سعدی کے ان اشعار پر مبنی کر لیا تھا۔

کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما

فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

اور اس نظریہ حیات نے ان کی زندگی بہت خوش گوار بلکہ مہر و الفت کی چاشنی سے پُر کر دی تھی۔

عید کی صبح کو چار بجے ہی سے گھر کے لوگ اُٹھ کر نہانے دھونے میں مصروف ہو گئے تھے۔ دلچین باورچی خانے میں جلدی جلدی شیر خرما پکا رہی تھی۔ دن نکلتے ہی عید گاہ جانے کی مارا مار ہو گئی۔

بیٹوں پوتوں اور نواسوں کے جھرمٹ میں میر نہال کھلے پڑتے تھے۔ آج ان کے صافے کی کساوٹ میں وہ نفاست اور اہتمام تھا کہ اس کے پیچ میں ان کے ابرو کا ذرا سا حصہ بھی چھپ گیا تھا۔ ان کی ڈاڑھی ہمیشہ کی طرح بنی سنوری شاہانہ انداز میں اوپر چڑھی ہوئی تھی۔ وہ جامہ زیب تو تھے ہی اور اس عمر میں بھی ان میں غضب کی پھبن تھی۔ بچے ان کو جب گھیر کر کھڑے ہو جاتے تو فرطِ انبساط سے ان کے کلّوں کی جلد پھڑکنے لگتی اور آنکھوں میں مسرت کی چمک آ جاتی۔

غفور نے سب کو سلام کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ عید کی خوشی میں تیل کی پوری کپی اس نے سر میں انڈیل لی ہے۔ الغاروں تیل کنپٹیوں تک بہہ رہا تھا اور گُدی سے بہتا ہوا اچکن کے کالر تک آگیا تھا، اور اس پر چلکتّا ڈال دیا تھا۔ اس نے حبیب الدین کے بیٹے کو گود میں اٹھالیا اور سب مل کر نماز پڑھنے چلے۔

عید گاہ میں آدمی پر آدمی ٹوٹا پڑتا تھا۔ راستوں پر تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ دلّی والے تو دلّی والے، بلّب گڑھ اور قطب مہرولی سے بھی دُھنیے، جولاہے، کسان، کھٹ بنے جمعۃ الوداع ہی سے عید منانے پورے پورے کنبے لے کر آ گئے تھے۔ ان کی عورتوں کے لہریے دار لوگڑے، ان کے پیجامے اور ڈھیلے ڈھالے کرتوں کے گہرے بسنتی، عباسی اور فیروزی رنگ دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ عید کے ہمراہ پھاگن کی رُت بھی رنگا رنگ پھول کھلاتی آ گئی ہے۔

باپ بھائیوں کے کندھوں پر ہنستے کھیلتے بچے سوار تھے۔ نواسوں پوتوں کی انگلیاں پکڑے ہوئے نانا دادا خوشی سے عید گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ لوگوں کی باتوں کا غل غپاڑا، چیزیں بیچنے والوں کی صدائیں، کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ سڑکوں، پٹریوں اور میدانوں میں سودے والوں کا اژدھام عید گاہ تک چلا گیا تھا۔ ہر طرف کھلونے والے نظر آتے تھے۔ وہ کونسی دنیا جہان کی چیز تھی، جو ان کھلونوں میں نہ تھی، مٹی کے جانور، گھرداری کا سامان، گڑیا کا جہیز، ایک مٹی کی سبزی پھل پھلواری لیے بیٹھا ہے تو ایک کے پاس چھپر کھٹ، مسہریاں، پالکی نالکی ہوادار ہیں۔ ایک بیچ راستے میں جھانجھ بجاتی گڑیا دکھا رہا ہے اور ساتھ ساتھ کہتا بھی جا رہا ہے: "تنتو بجے بارہ ہوگا، اڈھی کی دال میں کیا ہوگا" دوسرا ربڑ اور چینی کی گڑیا دکھا کر بچوں کا من للچا رہا ہے۔ اور بچوں کا یہ حال کہ کوئی تار کی سارنگی پہ روں روں کر رہا ہے تو کوئی تاشے باجے والی گاڑی کھڑ کھڑ کرتا لیے جا رہا ہے، کوئی

ابا کی گود میں مچل مچل کر کاغذ کی گیند اور طوطے کے واسطے رو رو کر زمین و آسمان سر پر اٹھائے ہوئے ہے۔

آدمیوں کا ریلا دھکم پیل کرتا ہوا چلا آرہا تھا۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ میر نہال اور حبیب الدین بھیڑ بھڑکا چیر کر بڑی مشکل سے راستہ بناتے ہوئے جب عیدگاہ پہنچے تو جماعت کی تیاری کے گولے چھوٹ رہے تھے اور صفیں کھڑی ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ اور جیسے ہی تکبیر کی آواز آئی اچانک وہ شور اور غلغلہ بند ہو گیا۔ زمین و آسمان دم بخود ہو گئے۔ ہر چیز پر سکوت طاری ہو گیا اور ہر شخص سرنگوں اور فضا اتنی خاموش ہو گئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی زندہ آدمی موجود نہیں ہے۔ یک لخطہ تکبیر دں کی تکبیر کہنے کی آواز صفوں کو عبور کرتی ہوئی رکوع و سجود میں دور دور تک آتی اور پھر وہی خاموشی چھا جاتی اور سوائے محبتِ الٰہی سے دھڑکتے ہوئے دلوں کی دھک دھک کے کوئی آواز نہ ہوتی۔ کبھی کبھار کسی بچے کے رونے کی آواز یکبارگی ابھرتی جو اتنے عظیم مجمع میں یکہ و تنہا رہ جانے کے خوف سے رو دیتا، یا پھر کہیں کوئی گھوڑا ہنہناتا یا کوئی چیل زور سے چلچلاتی ہوئی آسمان پر منڈلا کر فضا کے سکوت کو برباد کر دیتی۔

نماز ختم ہوتے ہی دوست احباب محبت اور گرم جوشی سے گلے ملنے لگے۔ برس کے برس دن عاشقوں کی تمنا بر آئی اور اپنے محبوبوں کو سینے سے چمٹانے لگے۔ رسم دنیا بھی تھی اور عید کا دن بھی۔ میر نہال کا خاندان بھی عید ملنے کے بعد ایک طرف کھڑے ہو کر بھیڑ چھٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر میر نہال نے خستہ کچوریاں، سیخ کے کباب، قطبی پراٹھے اور مٹھائی خریدی۔ حبیب الدین بچوں کی انگلیاں پکڑے ان کی پسند کے کھلونے دلوا رہے تھے۔

گھر پہونچ کر چھوٹوں نے بڑوں کو سلام کیا اور بڑوں نے عیدی دے دیکر

گلے لگایا۔ حد تو یہ ہے کہ آج کے دن جمال بیگم نے بھی سب بچوں کو دو دو آنے دیئے۔ عیدیاں وصولتے وصولتے بچوں کو ایک لمحہ خالی نہ ملتا تھا کہ وہ اپنی خوشی پر خوش ہو سکیں۔ عید کا دن تھا اور فرحت و راحت کا دور دورہ۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ ہنس رہا تھا۔

مرد رشتہ داروں سے ملنے چلے گئے اور بیویاں مہمان داری میں لگ گئیں۔ بیگم نہال کو تو آج دم لینے کی فرصت نہ ملی۔ سقّہ، دھوبی حلال خوری، محلّے والیاں سب ہی عیدی کے منتظر سلام کرنے کھڑے تھے۔ اصغر کی سسرال میں حصہ اور بلقیس کے واسطے عیدی بھیجدی گئی تھی۔ حصّے آرہے تھے اور جا رہے تھے۔

حبیب الدین واپس آئے تو مسرور پتنگ اُڑا رہا تھا۔ انھوں نے بھی پانچ روپیہ کا ڈور مانجھا اور پتنگ منگوا کر اصغر کو دیں۔ وہ ایک چرخی سے کم پینچ لڑانے کا قائل نہ تھا۔ پتنگ جتنی دور اور اونچی ہوتی اتنا ہی اس کو مزا آتا۔ اصغر نے کانپ ٹھڈا ٹھیک کیا اور پتنگ بڑھائی۔ حبیب الدین اور شمس بیٹھ کر پتنگ بازی کا تماشا دیکھنے لگے۔ اصغر کی پہلی گڈی نے بڑھتے ہی تو پینچ کاٹے۔ پھر اس نے گڈی کو اتار کر اس پہ "نوشیرواں" لکھا اور دوبارہ بڑھایا مگر اب کے وہ پہلے ہی پینچ میں کٹ گئی۔

ظہر کے وقت منوّر قلفی والا آگیا اور حبیب الدین نے گھر بھر کو ملائی کی برف کھلوائی۔ مرد بیٹھک میں شرط لگا لگا کر قلفیاں کھانے لگے اور بچّے عورتوں کو قلفیاں دینے زنان خانے میں دوڑ بھاگ کرتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر میں منوّر کا سارا مٹکا خالی ہو گیا۔ اس نے مٹکے کو الٹ کر پانی گلی میں بہا دیا۔ بچوں نے نمکین برف کے ٹکڑے اس سے مانگ کر لیے اور مزے لے لے کر نیت سیر ہو کر کھائے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

دن ہوا کی طرح صرصر کر کے ہوا گئے اور رم جھم کرتا ساون آ گیا۔ ساون من بھاون کہلاتا ہے۔ اپنے ساتھ جو بہار اور حسن لے کر آتا ہے وہ دِلّی کے دل والے ہی جانتے ہیں۔ جب کالے کالے بادل آتے ہیں اور گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں، ارض و سما پر شباب آ جاتا ہے۔ ذرّہ ذرہ انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتا ہے۔ خوابیدہ کلیاں چیکے سے آنکھیں کھول دیتی ہیں، دھرتی مسکراتی ہے، ہوائیں گنگناتی ہیں، جل تھل بھر کر ندی نالے دھوم مچاتے ہیں۔ کاجل کی طرح کالی کالی ساون کی بھیگی راتوں میں جب تھم تھم کر بادل گرجتے ہیں تو ایک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے۔ پپیہے کی پی ہو پی ہو تڑپ اور بڑھاتی ہے۔ بچھڑے ساجن یاد آتے ہیں۔ سہاگنیں اور کنواریاں برہا کے گیت گا گا کر اپنے شوقِ وصل کی داستانیں کہتی ہیں اور محلوں میں ملہار گائے جانے کی آوازیں، بوندوں کی چھما چھم کے ساتھ آنے لگتی ہیں:

سکھی آون آون کہہ گئے

آئے نہ بارہ ماس . . . . . .

لوگ برسات منانے قطب اور ہمایوں کی مقبرے کی سیر کو نکل جاتے۔ ہر طرف ہریالی تھی۔ درختوں کے تنوں سے خودرو بیلیں لپٹ کر لہلہا رہی تھیں۔ نظام الدین اور مہرولی کے جنگلوں میں منگل ہو گیا تھا، جن میں مور دُم لکتی ہوئی دُموں کا چھتر پھیلائے ناچ رہے تھے۔ نیم اور شیشم کے درختوں پر بندر اِدھر سے اُدھر چھلانگیں مارتے لٹو متے۔ کنجوں میں شامائیں اور ڈومنیاں پھدک پھدک کر چہچہاتیں۔

ساون کی جھڑی لگتے ہی گلی اور کوچوں میں پانی کھڑا ہو گیا۔ چھتیں ٹپکنے لگیں اور شہر کی عمارتوں میں سیل اتر آئی۔ ہر طرف نمی اور سیلن ہو گئی۔ جگہ جگہ سے دیواریں کائی سے سبز ہو گئیں۔ رات کو اکثر موسلا دھار بارش ہوتی۔ پرنالے دھائیں دھائیں

کر کے شور کرتے۔ رہ رہ کر بجلی چمکتی اور زور کا کڑاکا ہوتا۔ جب مینہ ختم جاتا، تو اولتیاں ٹپ ٹپ گرتیں، مینڈک ٹرّاتے اور دیواروں کے کسی سوراخ میں ایک جھینگر کی جھنکار، دُور بجتے ہوئے مجیروں کی طرح سنائی دیتی۔ مہندی کا درخت جو گرمی سے مرجھا کر ٹنڈ منڈ ہوگیا تھا ہرا ابھرا ہو کر پھولوں سے لدگیا اور اس کی پتیوں پر بارش کی بوندیں موتی کی طرح ٹکی رہتیں اور حنا کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سارے گھر میں پھیلی رہتی، آموں پر کوئلیں کوکتی رہتیں اور ہر طرف ساون کے دردانگیز گیت سنائی دیتے:

چھا رہی کالی گھٹا جیا را مورا لہرائے ہے

آم پر کیوں جم رہا ہے اے پپیہا آ ادھر — تو سراپا درد ہے میں بھی تو ویسی زرد ہوں

فرق اتنا ہے کہ تجھ میں رس ہے تجھ میں ہائے ہے — چھا رہی کالی گھٹا جیا را مورا گھبرائے ہے

اور ہجر و فراق کے پس منظر میں اودی اودی بدلیوں کی طرح اصغر کی شادی کی تیاریاں آگے بڑھتی رہیں اور اصغر کی محبت کی امنگ بھی نکھر کے سبزے کی طرح لہلہانے لگی۔ وہ اکثر چھت پر لیٹ کے شام کی گلابی گلابی فضاؤں میں فیروزی، بادامی اور اودے بادلوں کا تماشا دیکھتا رہتا جو شفاف اور نکھرے ہوئے نیلے نیلے آسمان پر کسی خبطی مصوّر کی طرح ہر لحظہ ایک نئی صورت بناتے اور بگاڑتے رہتے۔ اور بادلوں کے نارنجی پہاڑوں پر کبھی آفتاب کی شعائیں جگمگا کر قوس و قزح کا حسین پُل بنا دیتیں اور زمین اور آسمان ایک دوسرے سے مل جاتے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ساون بھادوں گلے مل کر برسے اور برکھا رُت چلی گئی۔ جاتے جاتے اپنے ساتھ وہ حسین سماں بھی سمیٹ کر لے گئی۔ جاڑے شروع ہو گئے۔ دن چھوٹے اور راتیں لمبی ہو گئیں۔ آفتاب کا طنطنہ ختم ہوا اور دھوپ کی تیزی مِٹ گئی۔ روئی بھرے دگلے، شلوکے اور فرغل نکل آئے۔ دن پلک مارتے ڈھل جاتا۔ پیلی پیلی دھوپ

کوٹھوں اور چھجوں پر ذرا کی ذرا ٹھہرتی اور شام دھواں دھواں ہو جاتی۔ دستر خوان بچھتا اور انگیٹھی پر تانبے کی رکابیاں گرم کر کے کھانا کھایا جاتا۔ ہر ایک انگیٹھی پر اپنی روٹی بار بار سینکتا۔ کھانے سے فراغت پا کر عورتیں چھوٹے بچوں کو گودوں میں لے کر اپنی رضائیوں میں دبکا لیتیں اور ان کے پھٹے ہوئے کلّوں پر موم روغن ملتیں۔ کانگڑیاں کلیجوں سے لگ جاتیں۔ ابا دان میں آگ سلگا کر ہاتھ تاپے جاتے اور ساتھ ساتھ خوشی اور غم کی باتیں ہوتیں جن میں ماضی کے ملال، حال کا دکھڑا اور مستقبل کی امید اور اندیشے ہوتے۔ یا کبھی پہیلیاں بوجھی جاتیں اور بیت بازی ہوتی۔ نہیں تو بچوں کے اصرار پر انجم زمانی پریوں اور جناتوں کے عجیب و غریب قصّے سناتیں۔ جب کسی کے پاس کچھ اور کہنے سننے اور کہنے کو نہ رہ جاتا تو سب ٹھنڈے برف بچھونوں میں گھس کر لحافوں میں دونوں ٹانگیں سکیڑ کر دبک جاتے۔

رات خاموش ہوتی اور باہر جگہ کے پار ہونے والی ہوائیں چلتیں۔ گلی کے نکڑ کی کپّی کے چاروں طرف روشنی کا پیلا ہالا کہ ہیں اور دھندلا پڑ جاتا۔ اس تیرگی و تنہائی میں اندھے فقیر کی دل دوز صدا آتی:

چند تہمت اپنے ذمّے دھر چلے
کس لیے آئے تھے ہم کیا کر چلے

اور سردیوں کی لمبی لمبی ویران راتیں اور پہاڑ معلوم ہوتیں۔

کبھی کبھی بہادر شاہ نامی فقیر رات کے سناٹے میں مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کی غزلیں گاتا ہوا آتا۔ وہ نہایت تنگی اور دھان پان تھا، اور اس کی ہیئت اس قدر حقیر کہ اسے دیکھ کر یہی معلوم ہوتا کہ کسی مردہ بلّی کے ڈھانچے پر مکھیوں کے غول کے غول بھنک رہے ہیں مگر اس کی ذات کتنی ہی بے معنی رہی ہو۔ اس کی آواز میں اس قدر سوز تھا کہ معلوم ہوتا تھا جیسے سارے جہاں کا درد کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ جب وہ

ظفر کے اشعار گاتا تو عہدِ رفتہ کا وہ زرّیں دَور یاد دلا دیتا جب دلّی موجودہ دردوالم سے واقف نہ تھی۔ اس فقیر کی آواز میں فقط شاہ ظفر کے ہی مصائب و آلام نہ سُنائی دیتے تھے بلکہ پورے ملک کی غلامی اور زبوں حالی کا شکوہ و فریاد بھی؛

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں
کوئی میری قبر پہ آئے کیوں کوئی پھول چار چڑھائے کیوں
کوئی شب کو شمع جلائے کیوں میں تو بیکسی کا مزار ہوں
میں نہیں ہوں نغمۂ جاں فزا کوئی مجھ کو سُن کے کریگا کیا
میں بڑے بروگی کی ہوں صدا کسی دل جلے کی پکار ہوں .....

زندگی کی طرح وقت بھی گزرتے گزر گیا اور دسمبر آن پہونچا۔ دِلّی جو کبھی سُورما اور زورآور سلاطین کی راجدھانی تھی آج اس میں غیر ملکی فرنگی بادشاہ کی تاج پوشی کی دھوم تھی۔ اور سارے شہر میں ہل چل مچی ہوئی تھی۔ اہلِ دِلّی اس ہماہمی کے بیک وقت مشتاق بھی تھے اور مغموم بھی۔ انھیں حیرت بھی تھی اور نفرت بھی؛ وہ ہزاروں ابن الوقت جو غیروں کے خیرخواہ بن گئے تھے عہدوں کے لالچ اور اعزاز و خطاب کی آرزو میں خوش و خرّم تھے، لیکن لاکھوں وہ غیرت اور وفا کے بندے بھی تھے جنہیں اپنے وطن سے سچّی محبت تھی۔ غیر قوم کی حکمرانی سے ان کے غیوّر دل مجروح اور سینے فگار تھے، جو اندر ہی اندر بے بسی اور غصّے سے پھُنک رہے تھے۔

۷

تاج پوشی سے کئی مہینے پہلے دِلّی میں چاروں کھونٹ سے آدمی آکر جمع ہوگئے تھے۔ قرب وجوار کے ملکوں سے بادشاہ وزیر اور ہندوستان کے نواب، راجا اور والیانِ ریاست سب ہی مدعو تھے۔ اور تاجپوشی سے دو تین دن پہلے تک بستی بستی قریے قریے سے لوگ اُمڈے چلے آرہے تھے۔ کروفر کا یہ عالم تھا کہ شہر بھر کی سڑکیں بلاناغہ دھوئی جاتیں، خاک دبانے کے لیے تیل کا چھڑکاؤ ہوتا اور شہر کا چپہ چپہ نہا دھوکر آئینہ کی طرح چمک اٹھا۔

کہانیوں میں اُڑن کھٹولے ضرور سنے تھے لیکن زمین پر اُڑتے پھرتے اُڑن کھٹولے دِلّی والوں نے آج تلک دیکھے نہ سُنے تھے۔ اور جب موٹر گاڑیاں فرفر کرتی اِدھر سے اُدھر زناٹے بھر کر نکلتیں تو ان کی عجوبہ بناوٹ اور ساخت کو دیکھ کر لوگوں کے منہ فرطِ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ جاتے اور اس وقت اُن کو وہی کہانیوں کا سامنا آتا۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ عماریاں بندھے ہوئے ہاتھی کھم کھم کرتے اور دربار کے منتظمین گھوڑوں پر سوار شہر کا جائزہ لیتے پھرتے۔ ہر طرف غیر صورتیں اور اجنبی چہرے دکھائی

دیتے۔ چاندنی چوک اور چاوڑی بازار کے درودیواران ناآشنا صورتوں کو خاموشی سے تکتے۔ دلّی کے کوچہ وبازار میں انوکھے لباسوں کے دامن سرسراتے۔ نئے نئے لوگوں کے کپڑے بھی نئی نئی وضع وقطع کے تھے۔ کہیں رنگ برنگ کی جاکٹیں اور صدریاں نگاہوں کو ورغلاتیں اور صدہا قسم کے کوٹ اور برجس، لکھوکھا قسم کی ٹوپیاں نئی تراش کے رنگ دکھاتیں۔ عام انگریز سیاہ اور گہرے نیلے سوٹ میں نظر آتے اور ٹامی بچے اپنی خاکی وردیوں میں سینے تانے لینڈ تے پھرتے۔

لال قلعے کے پاس پشتے ہموار کردیے گئے اور شاہراہ سے لے کر پتھر والے کنویں تک دورویہ چبوترے اور جامعہ مسجد کے چاروں طرف بیٹھنے کے لیے لکڑی کی سیڑھی دار نشستیں تیار ہوچکی تھیں۔ اسی طرح موری دروازے سے فتحپوری تک چھتر دار چبوترے اور سائبان بنادیے گئے تھے۔ فوارہ پر ملکہ کے بت کے سامنے ایک عالی شان پشتے پر شامیانہ نصب کردیا گیا تھا۔ گھنٹا گھر کی سیم بندی کرکے کاغذی باغ سے اس کی بدنمائی چھپادی گئی۔

دلّی جو کبھی اپنے حسن میں یکتا اور ہندوستان کے تمام شہروں میں ممتاز و اعلیٰ تھی اس ساری چھوٹی سجاوٹ سے ایک تماشا گاہ بن کر رہ گئی تھی اور رات کو جب روشنیاں جلتیں تو نمایش کا دھوکہ ہوتا۔

قلبِ شہر میں نئی حکومت کی یہ نئی آن بان تھی اور میر نہال کا گھر ایک سرائے بن گیا تھا۔ کچھ تو اصغر کی شادی میں شریک ہونے والے عزیز واقارب تھے اور کچھ وہ مہمان جو دربار کا جشن دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ گھر کی بیٹھنے والیاں دربار کی تیاریوں کا حال آئے گئے سے سنتیں، تیوریاں چڑھاتیں، کڑوے کسیلے منہ بناتیں اور پھر جلے کٹے اعتراضات کرتیں۔ جمال بیگم کہتیں:

"جھاڑو پھرے موئے فرنگی کی صورتوں پر آوئی لوا یہ لال منہ کے بندر بادشاہت

کرنی کیا جانیں۔ اب تو وہی مثل ہے مور کے پر لگا کر کوّا بھی بولا میں بھی موروں کا بادشاہ ہوں۔"

بیگم نہال جواب دیتیں:

"ارے بی اس کا ذکر کیا۔ وہ زمانے تو خواب ہو گئے۔ جب ہمارے بادشاہوں کی تخت نشینی ہوا کرتی تھی۔ دلّی سج دھج کر چوتھی کی دلہن معلوم ہوتی تھی اور جس روز سواری نکلتی تھی، اس وقت کا تو پوچھنا ہی کیا خزانے کا منہ کھل جاتا تھا۔ سونے چاندی کے پھول لٹائے جاتے تھے، طلائی مہریں نچھاور کی جاتی تھیں۔"

جمال بیگم اس زمانے کی فراغتیں سن کر کہتیں:

"دیکھ لینا یہ خدائی خوار تو بس اینٹ پتھر ہی دیں گے اور ڈنکے یہ پیٹ رہے ہیں کہ جو میرے سو را جا کے نہیں۔"

بچے البتہ خوش تھے۔ انھیں یہ خبر کیا تھی کہ دلّی کیا تھی اور کیا ہو گئی۔ انھوں نے اپنی عمر میں ایسا بڑا میلہ نہ دیکھا تھا۔ جشن اور اس کی حقیقت ان کے لیے ایک دلچسپ تماشا تھی۔ محلّے میں مرزا دودھ والے کی دوکان رات کو معمول سے زیادہ دیر تک کھلی رہنے لگی جہاں حجام، کلّن کبابی، صدیق بنیا اور بڑھئی بیٹھ کر شہر کے حالاتِ حاضرہ پر تنقید و تبصرہ کرتے۔ بڑھئی خلیفہ سے کہتا،

"میں نے کیا پیارے تیرے اِن دِناں لوبارے ہو رہے ہیں۔ رات تلک سارے جنوں کی چاند مونڈا کرتا ہے میار، دل کو نہ بھول جائیو۔ قسم ہے قلا اُڑدو کی۔ نہیں تو یاد رکھیو دن کو تارے دکھا دیں گے یار خاں۔"

خلیفہ مسکرا کر کہتا:

"اپنا تو بنا پیارے۔ یہ جو تختوں پہ تخت بنائے چلا جا رہا ہے۔ کیا تیری اماں مرحومہ کا جنازا نہائے گا؟ اب تیری بھی تو گانٹھ گرم ہو گی۔"

اور بڑھئی اللہ کی غیر متوقع مہربانیوں سے مشکور ہو کر کہتا:
"بس وِس نیلی چھتری والے کا شکر گزرا اپنا ہوں۔ دھیلی روپیے روز کی دھیانگی ہو جاتی ہے۔ میں گنتے گار اس قابل کہاں" اور حقّہ کا دم لگانے لگتا۔ اس پر کلن کبابی کہتا:
"سوئی گوری چمڑی والوں کو دعا دو پیارے، وِنی کے صدقے میں یہ وارے نیارے ہو رہیے ہیں۔"
اس پر مرزا دودھ والا منطقی پہلو سے اعتراض کرتا:
"وِئی ہمارے عقل کے بیچ کے اندر یہ بات نہیں آئی۔ ابے ہمیں بھی تو بتلا کہ گوری چمڑی والوں کا اس میں کیا دخل ہے۔ اپنا رب دیتا ہے۔ وِسی کا دیا کھاتے ہیں۔"
اس پر کلن کبابی بولا:
"وئی مولوی کے پوتے اللہ کو ہم بھی مانتے ہیں۔ پر تو مجھے یہ بتا کبھی آسمان سے بھی تیرے گھر میں طباخ اُترا ہے؟ وئی اللہ کے دینے کے راستے ہیں۔ جو بادشا ہمارے شہر دِلّی میں دربار نہ کرتا تو یہ ترلوالے کہاں سے کھاتے پیارے۔ وِس کی جان کو دعا دو۔ اللہ نے وِس کے دل میں ہمارے شہر کی محبت ڈال دی۔ میرا ارشاد سن۔ جو دربار یاں نہ ہوتا تو قسم ہے اُڑان جھنڈے کی دودو دانوں کو ترستے۔"
اور اس نے اپنی بات منوانے کو اپنے خم ٹھونک کر خوشی سے کہا: "دن رات راد ھا ناچے گی۔ گھی کے چراغ جلیں گے۔ نہال ہو جاؤ گے پیارے۔ ہو کس کی ہوا ئیں مزے آجائیں گے یاروں۔"
اس پر خلیفہ سے بھی چپ کے بغیر نہ رہا گیا،
"تیری بات کچھ دل کو یاروں کے بھی لگتی ہے۔ دئی میں تو صبح سے شام تو رہی

یہی دیکھ رہا ہوں۔ لبے آنکھیں پھٹی جا رہی ہیں۔ ہُن برس رہا ہے ہُن۔ محمد شاہ رنگیلے کا تو نام ہی نام سُنا تھا۔ اِس وَخت تو یہ حالت ہے کہ چاریوں طرف سے مانس اُمڈا اچلا آ رہا ہے۔ شہر میں جیسے بکرا عید پر ریوڑ آتے ہیں۔"

اتنے میں بڑھئی نے بات کاٹ دی اور اور کہا:

"تیری بات ہے تو ٹھیک پیارے پر یہ تو سوچ میں اسی مسئلے کے بیچ حریان ہوں کہ چڑیا چُگ کے چلی جائے گی یا یہیں بسیرا لے گی؟"

صدیق بنیے نے بڑھئی کی ران پر تڑسے ہاتھ مار کے کہا:

"وئی لکشمی آن کے ذلدی نہیں جاتی پیارے۔ نکاح کر کے بٹھا لیں گے۔ جان تو اس غم میں نہ گھُل۔"

"سب کو اس بات پر ہنسی آگئی اور مرزا نے کہا:

"وئی وہ تو ہندنی ہے۔ وِس سے کیسے نکاح کرے گا؟"

صدیق بنیے نے برجستہ جواب دیا۔

"وئی تو فکر نہ کر میری جان! فرما تو رہا ہوں پکڑ کر پھیرے کر لوں گا۔ اور یار تو سمجھ گونا تو ہو ہی چکا۔"

مرزا دودھ والے سے نہ رہا گیا۔ وہ بولا:

"اماں چار دن کی چاندنی اور پھر وہی اندھیری رات۔ یہ بڑے کہہ گئے، نہ بھولنا یہ تھوڑے دِناں کا سبز باغ دِکھا رہے ہیں۔ پھر جڑوں سے اکھاڑ کر لے جائیں گے سارے دَرَخت۔ اور کیا کہوں وِن دَرَختوں کی یادیں اب تلک دل روتا ہے۔ قسم ہے پاک پروردگار کی ذات کی ایسا ہرا بالا دَرَخت اُکھیڑا جس کے سایے میں سبھی پل رہے تھے۔ کس کس کو روؤ۔ ایسے ایسے کڑیل خب صورت شہزادے ذبح کیے جن کے نمونے اب توڑی نہ آسمان نے دیکھے نہ زمین نے۔ یا رو تم کچھ ہی کہو میرا

تو ماتھا ٹھنک رہا ہے۔" وہ اس وقت خاصا اُداس معلوم ہوتا تھا۔

صدیق بنیا اُکتا کر بولا:

"وئی پیارے تجھ کو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا دِکھتا ہے۔ ذرا میاں سے جل کے تو پوچھ کہیں محرم میں تو پیدا نہیں ہوا تھا۔ آج تو اڑی تیرے منہ سے کوئی خیر کا کلمہ کبھی نہیں سنا۔ قسم ہے بی دُو دُئی جان کی سات دسمبر کو دیکھیو پریاں ناچیں گی پریاں، راندر کا اکھاڑا ہو گا۔ تو اُلّو کی انسل اپنے ٹھنٹھ پر بیٹھا گھگّو گھگّو بولتا رہیو۔"

مرزا نے کڑھاؤ میں کھینچا چلایا اور دودھ کی سطح پر جمی ہوئی بالائی کو ہٹا کر کڑھاؤ کے ایک کنارے لگا دیا اور لنگی سے ہاتھ پونچھتے ہوئے یہ مصرع پڑھا:

"دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے"

اور تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا:

"ابے الّو کی دم فاختہ وہ زمانہ بھول گئے جب شہ عالم پر ظلم توڑے تھے۔ گمسر والیوں کی بے حرمتی کی تھی ـــــ تمہاری کھال کھنچوا کر منڈھے پہنے گا وِس وَخت بچّو مرزا کو یاد کرو گے۔"

"ابے بے فضول کی ٹیں ٹیں لگا رکھی ہے۔ تیرا کیا بگاڑا ہے۔ جو ابھی سے وِن سے دشمنا گی مول لے لی؟" صدیق اس طرح بگڑ کر بولا جیسے سرکارِ انگریزی کی پول کھول کر مرزا دودھ والے نے اسی کو گالی دیدی ہو......

مرزا دودھ والا تو ٹھنڈا سانس کھینچ کر چپ ہو گیا، لیکن کلّن کبابی، صدیق بنیا اور خلیفہ اور بڑھئی رات گئے بیٹھے ہوئے دربار اور بادشاہ سلامت کی باتیں کرتے اور مزے لیتے رہے۔ انھوں نے کبھی اصل بادشاہ تو اپنی آنکھوں سے دیکھا نہ تھا فقط بڑے بوڑھوں سے ان کے کرّ و فر اور دھوم دھام کی کہانیاں سنتے چلے آئے تھے۔ اب ان کا مشتاق اور منتظر ہونا تعجب خیز نہ تھا۔ دِلّی والے بھی عجب زندہ دل اور

سیلانی لوگ ہیں۔ ہر ہنگام میں اپنی دل بستگی کا سامان ڈھونڈ لیتے ہیں۔ یہ ان کی فطرت ہے۔ میلوں ٹھیلوں میں جانا ان کو ورثے میں ملا ہے۔ تماش بینی میں ان کا مقابلہ ہندوستان کے کوئی اہلِ شہر آج تک نہ کر سکے ہیں۔ سنہ ستاون کے اس قیامت خیز غدر میں بھی وہ اپنی جولانیٔ طبع سے باز نہ آئے تھے۔ جب ہر طرف گولیاں جھڑ رہی تھیں، توپیں شعلوں کی طرح گولے اُگل رہی تھیں یہ کوٹھوں اور چھتوں پر چڑھ کر تماشا دیکھنے اور شب برات کی آتش بازی کا مزہ لیتے۔

لیکن دلّی کے وہ ساکنانِ قدیم بھی تھے جنہوں نے اپنی آنکھوں شاہانِ مغلیہ کی آب و تاب اور ان کا رعب و دبدبہ دیکھا تھا۔ ان کو وہ رنگ آرائیاں یاد تھیں، ان کے سامنے اس دربار کے سارے تکلفات و اہتمام ہیچ تھے اور وہ ان سرگرمیوں سے نہ صرف بے تعلق تھے بلکہ ان پر ایک سکتے کا عالم تھا۔ اور کچھ وہ بھی دل جلے تھے جن کے عزیز و اقربا غدر کی آفتوں سے لُٹ پٹ کر نیست و نابود ہو چکے تھے۔ جشن کی تیاریاں دیکھ کر ان کے دلوں میں نفرت کا آتش فشاں کھول رہا تھا اور وہ گھروں میں بیٹھے ہوئے فرنگیوں کو کوس کاٹ کر جی کی بھڑاس نکال رہے تھے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

شمس کے سپرد دربار کے انتظامات تھے اور وہ لال قلعہ میں تعینات تھا۔ دربار سے دو روز پہلے گھر میں آ کر سب کو یہ خبر سنائی کہ رات کو قلعہ میں اچانک آگ لگ گئی اور بادشاہ سلامت کے واسطے جو مخصوص شہ نشین کثیر صرفے کی لاگت سے تعمیر کیا گیا تھا جل کر راکھ ہو گیا۔ اس شہ نشین کے واسطے نہ صرف بڑے بڑے راجہ مہاراجاؤں نے بیش بہا قالین اور انمول آرائشی سامان بھیجا تھا بلکہ پنجاب کے لاٹھ بہادر نے بھی اپنی جیب خاص سے ذاتی عطیے دے کر آراستہ و پیراستہ کروایا تھا۔ نقصان بہت ہوا تعجب کی بات یہ ہے کہ اب تک یہ پتہ نہ چل سکا کہ آگ کیوں کر لگی اور کس کی

کارستانی تھی۔

میر نہال اور حبیب الدین جی ہی جی میں سن کر بہت خوش ہوئے۔ شمس البتہ منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھا رہا۔ وہ سرکار انگریزی کا نمک خوار تھا اور تقاضائے وفاداری بھی یہی تھا۔ بیگم نہال اس وقت بیٹھی ہوئی کرتی پر کٹاؤ کا پھول بنا رہی تھیں۔ شمس سے جو آگ لگنے کی خبر سنی تو سینا پرونا چھوڑ کر کپڑے تہہ کرکے بقچی میں لپیٹ دیئے۔ اس خبر سے ان کو خاص مسرت ہوئی اور وہ زور زور سے کہنے لگیں:

"دیکھا اللہ کا قہر نازل ہو رہا ہے موئے فرنگیوں پر۔ کہتے ہیں خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ ہندوستان میں جو غضب ڈھائے اور بے گناہوں کا خون بہایا تو شہیدوں کا خون رنگ لائے بغیر نہیں رہے گا۔"

پھر وہ دور دیکھنے لگیں۔ ان کے چہرے پر تلخی کی شکنیں پڑ گئی تھیں۔ ان کو غدر کے ہولناک دن یاد آ گئے۔ اور جیسے بھوبل میں دبی ہوئی چنگاری کو کسی نے کرید کر ہوا دیدی ہو۔ وہ غدر کے حالات سنانے لگیں:

"ان لال منہ کے بندروں نے کونسا ظلم اٹھا رکھا تھا جو نہ توڑا ہو۔ دِلّی کو لوٹ کھسوٹ کر تہس نہس کر دیا تھا۔ معصوم مسلمانوں کو گھروں میں گھس گھس کر نکالا، شہر بدر کیا، اُن کی جائدادیں اور اثاثے قرق کر لیے اور مکانوں کو آگ دیدی۔ آن کی آن میں لاکھ کے گھر خاک تھے۔ اور کمپنی بہادر نے تو وہ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی کہ خدا کی پناہ۔ پھول سی صورتیں جو ہاتھ لگائے سے میلی ہوں اور ان شہزادے شہزادیوں کو کھوتھے تیروں اُڑا دیا۔ امیر غریب فقیر موئے چڑیا کے بچے پر بھی مسلمان ہونے کا گمان گزرتا تو تہہ تیغ کروا دیا جاتا۔ دِلّی میں خون کے دریا بہہ گئے۔ جنگل، بن، کہیں امان نہ تھی۔ خود اپنی آہٹ سے دل ہولتا تھا اور ہماری ہنستی کھیلتی دِلّی جس کے دن عید اور رات شب برات تھی پلک جھپکتے گورستان کی طرح اُجاڑ و ویران ہو گئی۔ نصیبوں جلی کا

ایسا قلع قمع کر دیا کہ ہُو کا عالم تھا اور دن کو اُلّو بولتے تھے۔ ڈھنڈار مکان اپنے مکینوں کو یاد کرتے تھے۔ گلی کوچوں میں حسرت برستی تھی۔ جدھر دیکھو گدھ منڈلاتے نظر آتے۔ جب بھی وہ مصیبت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے کلیجہ دہل جاتا ہے اور سینے پر سانپ سا لوٹنے لگتا ہے۔ ان قزّاقوں سے تو اللہ ہی ہمارا بدلہ لے گا.....“
اتنا کہہ کر ان کی آنکھوں میں اشکِ غم جھلک آئے۔

جمال بیگم نے ایک آہ بھر کے کہا:

”بُوا بائیس خواجہ کی چوکھٹ اجاڑی ہے۔ جیتے جی ان کے منہ سوّر کے سے ہو جائیں گے.....“

سینوں میں جوشِ انتقام اور جذبۂ غیظ و غضب سر اٹھاتا، لیکن وہ سب بے بس اور لاچار تھے۔ ان کے بنائے کچھ نہ بن سکتی تھی.....

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

دلّی میں آج بھی سینکڑوں غدر کی ماری شہزادیاں اور آفت رسیدہ شہزادے، بہادر شاہ کے پوتے پڑپوتے، در بدر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ نہ ان کا کوئی ولی ہے نہ وارث، نہ ٹھور ہے نہ ٹھکانہ۔ سراسیمگی اور کس مپرسی کا ایسا شکار ہوئے کہ کسی شہزادی کو جاٹ اٹھا کر لے گئے تو کوئی کہاروں اور گوجروں کے ہتّے چڑھی۔ جو قبضۂ ناجائز سے بچیں، وہ ماماگیری کرنے لگیں۔ پیٹ کی دوزخ کو ٹھنڈا کرنے کو شہزادوں کو ہر ذلیل سے ذلیل اور ادنیٰ سے ادنیٰ پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ کوئی بیل گاڑی اور تانگا ہانکنے لگا اور کوئی گھسیارا بن گیا۔ معدودے چند تھے جنہوں نے اپنے حق اور وراثت کے لیے عرضیاں گزاریں اور پانچ دس روپے ماہانہ کے وثیقہ دار بن گئے۔ اور کچھ وہ بے نصیب بھی تھے جو ہمیشہ کو گم کردۂ عزّت و ناموس ہو گئے اور جن کے حصّے میں ہمیشہ کو گداگری مقرر ہوئی۔

ان ہی میں بی گل بانو تھیں جو بہادر شاہ کی پرنواسی تھیں۔ غدر میں ان کی عمر سات برس کی تھی جب اپنے رشتہ داروں اور والدین کے ہمراہ قلعہ معلی کو چھوڑ کر بھاگیں۔ ان کے سب عزیز تو غدر کے زمانے ہی میں بھینٹ کی نذر ہو گئے تھے اور کم سن بیبی یہ بکہ و تنہا اور بے یار و مددگار رہ گئیں۔ جب غدر کا جاں فرسا طوفان اور طوائف الملوکی کی یورش ختم ہوئی اور زندگی کی حالت قدرے سنبھلی اور امان ہوئی تو یہ بھی کسی طرح دلی واپس آ گئیں، مگر کایا پلٹ ہو چکی تھی۔ اب ان کو یہاں پہچاننے والا کوئی نہ تھا، اور ان کو روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ بھری دلی میں ان کا پرسانِ حال ایک چوہے کا بچہ بھی نہ نکلا۔ سرکار انگریزی کے خوف سے لوگ شہزادے اور شہزادیوں کو نوکریاں بھی نہ دیتے تھے کہ کہیں وہ خود گرفت میں نہ آ جائیں۔ ناچار مجبور ہو کر انھوں نے اپنے ہی نانا ظفر شاہ کے طباخی سے نکاح کر لیا۔ وہ جب تک زندہ رہا ان کو طرح طرح دق کر کے اذیتیں پہونچاتا رہا اس کے مرنے کے بعد وہ پھر بے سہارا ہو گئیں اور ایسی بپتا پڑی کہ مانگ کھانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

دربار سے ایک دن پہلے وہ میر نہال کے ہاں آ نکلیں۔ وہ اکثر آتی رہتی تھیں۔ ان کی پیشانی کشادہ، رنگ میدہ و شہاب اور بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں۔ گو وقت کے ناروا سلوک اور گردشِ جہاں نے سینکڑوں شکنیں ان کے چہرے پر ڈال دی تھیں مگر خط و خال کے نقشے اب بھی کہہ رہے تھے کہ اپنے زمانے میں حسینوں کی حسین رہی ہوں گی۔ بہادر شاہ کا کلام پڑھنا ممنوع تھا مگر دلوں پر پہرے نہ بٹھائے جا سکتے تھے، اور منادی کے باوجود دلی والوں کو پوری غزلیں حفظ تھیں۔ گل بانو بھی آ کر بیٹھ جاتیں اور اپنے نانا کا کلام انتہائی سوگوارے میں گاتیں اور اس طرح جو کوئی کچھ دے دیتا لے لیتیں۔ خود منہ سے کبھی نہ مانگتیں اور نہ کسی کے سامنے ہاتھ ہی دراز کرتیں۔

میر ولی نے ان سے پوچھا:۔

"بوا تم نے بھی دربار کی روشنیاں دیکھیں، کیسی ہیں؟ تمہارے وقت میں بھی دلّی ایسی ہی سجا کرتی تھی؟"

مہرو نے ویسے ہی سادا سوال کیا تھا مگر گُل بانو کا دل تو داغ داغ تھا سمجھیں مہرو ان کی تحقیر کر رہی ہے۔ بولیں:

"بچی ہم سے ٹھٹھول کر کے تم کو کیا ملے گا؟ ہم تو پہلے ہی ستائے ہوئے ہیں۔"

مہرو کہنے لگی:

"اچھی بوا میں نے تمہارا دل توڑنے کو تھوڑی ہی کہا تھا۔ میں تو پوچھ رہی تھی۔"

"بیٹی پوچھنے کو اب ہمارے پاس کیا رہا ہے۔ کبھی ہمارا بھی وقت تھا ہم بھی شاہوں کے شاہ تھے۔ ہمارے جاہ و جلال کے سامنے بڑے بڑے تاجدار مات کھاتے تھے۔ ہمارا دور ختم ہوا۔ نہ وہ زمین ہے نہ وہ آسمان۔ مقدر نے کیا آنکھیں پھیریں زمانہ ہی بدل گیا۔ اب کارکنانِ قضا و قدر وہی ہیں۔ چمن اُن کا ہے بہاراں کی۔ ہم کس گنتی شمار میں؟ ہم تو خارِ ہستی ہیں اور ننگِ جہاں......" پھر تلخ اور طنزیہ ہنسی ہنس کر خاموش ہو گئیں۔

مہرو اپنے کہے پر نادم ہو کر بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی گُل بانو کو دیکھ رہی تھی۔ اس وقت ان کے چہرے پر حزن و ملال تھا۔ روشن زمانے کی یاد نے آ کر ان کی آنکھوں میں آنسوؤں سے چراغاں کر دیا اور وہ پھر کہنے لگیں:

"کبھی ہمارے دروازے پر ہاتھی جھومتے تھے، نوبت بجتی تھی، لونڈی غلام حکم کے منتظر کھڑے رہتے تھے۔ مگر وہ بساط ہی اُلٹ گئی، وہ نقشے ہی مٹ گئے۔ خدا جسے چاہے عزّت دے جسے چاہے ذِلّت۔ آج ہم ذلیل و خوار ہیں۔ کل کی بات ہے ہم بھی تاج و تخت والے تھے۔ وہ آئے اور ہمیں تاراج کر دیا۔ اِن نامراد آنکھوں نے اپنے سامنے شہزادوں کو شہید ہوتے دیکھا۔ ان کے نازوں سے پالے

پھول سے جسم سنگینوں اور بھالوں سے چھلنی چھلنی ہو کر خاک و خون میں تڑپتے دیکھے۔ ظالموں نے معصوموں کا جیتا جیتا خون پیا۔ ہم نے یہ سب دیکھا اور یہ سب دیکھ کر بھی ان بدنصیب آنکھوں کا نور نہ گیا۔ ہائے یہ دیکھنے سے پہلے ہی اندھی کیوں نہ ہو گئیں؟ جانے والے چلے گئے اور نیرنگیٔ زمانہ کی بیداد سے محفوظ ہو کر چین کی نیند سو رہے ہیں اور ہم وقت کی کاری ضربیں کھانے اور تلخیٔ حیات پینے کو زندہ رہ گئے۔ مگر بیٹی نہ وہ رہا نہ یہ رہے گا۔ دنیا چند روزہ ہے۔ رنج و الم، عیش و عشرت ماضی، حال، مستقبل سب کو زوال ہے۔ کون رہا ہے کون رہ جائے گا۔ سب وقت کے چہرے پر گزرتی ہوئی نشاط و الم کی پرچھائیاں ہیں۔ ماسوا اس کے کچھ نہیں ....''

ان کا پوپلا منہ شدتِ جذبات سے کپکپا رہا تھا اور آنسوؤں کا تار بندھ کر جھریوں زار چہرہ بھیگ گیا اور رنج و کرب سے صورت بگڑ گئی، بیگم نہال اور جمال بیگم ان کے قریب بیٹھی پتھر کے جگر سے یہ داستان سن رہی تھیں۔ دونوں نے ایک لمبی آہ بھری اور گل بانو کی حالتِ زار پر تاسف کرنے لگیں۔ بیگم نہال اٹھیں اور کٹورے میں پانی لے آئیں۔ جمال بیگم نے ان کو پانی دیا مگر وہ حسرت کا مرقع بنی ہوئی یادوں میں گم بیٹھی تھیں اور ان کی نگاہیں موجودہ منظر سے کہیں دور خلا کی بے پایاں وسعتوں میں ایک حسین و سہانی دنیا کا وجود تلاش کر رہی تھیں جہاں کارزارِ حیات کے یہ آزار اور کلفتیں نہ ہوں ...... پھر وہ خود ہی ایک وجدانی کیفیت میں یہ غزل گانے لگیں؛

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں میرا غم سے سینہ فگار ہے
نہ تھا شہر دہلی یہ تھا چمن کہوں کس طرح کا تھا یاں امن
جو خطاب تھا سو مٹا دیا فقط اب تو اُجڑا دیار ہے

یہ رعایا ہند تباہ ہوئی کہوں ان پہ کیسی جفا ہوئی

جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ تو قابلِ دار ہے

وحیدہ بیگم اور کلیم بیگم بھی آکر بیٹھ گئی تھیں۔ سب زار و قطار رو رہے تھے۔ اور جب اس شعر پر پہنچیں:

نہ دیا کسی نے کفن انھیں نہ دبایا زیرِ زمیں انھیں

نہ ہوا نصیب وطن انھیں نہ کہیں نشانِ مزار ہے

تو گل بانو کی آواز بھرا گئی اور لفظ نکلنے بند ہو گئے۔ انھوں نے اپنا منہ دوپٹے میں چھپالیا۔ سب کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ یہ روداد غم گل بانو کی آپ بیتی نہ تھی بلکہ ان سب کی داستانِ رنج والم تھی۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

میر نہال اور حبیب الدین کے پاس مردانے میں کمبل شاہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اور مغلوں کے زوال پر تبادلہ خیال ہو رہا تھا۔ میر نہال کہنے لگے:

"بہادر شاہ کی دوسری بیگم خاص زینت محل اگر اپنے بیٹے جواں بخت کو ولیعہد بنا کر تخت و تاج کا وارث بنانے کا شاخسانہ نہ اٹھاتیں تو آج ہم غیروں کے اسیر نہ ہوتے۔ انھوں نے بیٹے کو بادشاہ بنوانے کی ہوس میں اپنے ہم وطنوں سے غداری کی۔ فرنگیوں سے سازباز کرنے میں صریحاً ان ہی کا ہاتھ تھا۔ فرنگی سیاست میں گرو گھنٹال ہے چنانچہ زینت محل سے وعدہ کر لیا کہ جواں بخت کو ہی تخت نشین کریں گے۔ یہ بھی ان کی شاطرانہ چال تھی۔"

اس پر حبیب الدین کہنے لگے:

اگر مرزا خضر بیگ اور مرزا مغل، بخت خاں کی تجویز مان لیتے تو انگریزوں کو قطعی شکست فاش ہوتی۔ انھوں نے بخت خاں کی باتوں

پر سرے سے کان ہی نہ دھرا۔ رہے صاحب عالم اور شہزادہ عالم تو وہ فنِ لشکر کشی سے کورے تھے اور اسالیبِ جنگ سے نابلد اور لشکری ان کا حکم ماننے سے انکار کر دیتے تھے۔ بخت خاں نے بہتیری التجا کی کہ عنانِ افواج اس کو سونپ دی جائے لیکن شہزادے اس پر بھی راضی نہ ہوئے اور نتیجہ یہی ہونا تھا۔ مگر میں تو بخت خاں کی شجاعت پر آفریں کہوں گا کہ آخری دم تک انگریزوں کے حملے پہ حملے کا مقابلہ کرتا رہا، یہاں تک کہ جب دلی کا بھی محاصرہ ہو گیا اس نے بہادر شاہ سے عرض کی کہ جہاں پناہ میری مانیے ابھی وقت ہے۔ قلعہ کو چھوڑ کر میرے ہمراہ چلیے اور پہاڑوں میں چھپ کر نئے سرے سے فوج کی تنظیم کیجیے۔ چوہے دان میں بند ہو کر چوہے کی سی ذلیل موت مرنے سے جرائتِ مردانہ سے مقابلہ کر کے شہید ہونا بہتر ہے۔ اس کا اثر یہ بھی ہو گا کہ تمام راجہ مہاراجہ اور والیانِ ریاست آپ کی مدد کو کمک بھیج دیں گے اور سب متحد ہو کر ایک ساتھ غنیم پر ہلہ بول دیں گے۔ انگریزوں کی فتح کا سبب یہ ہے کہ ان کا مورچہ پہاڑی پر ہے اور دلی نشیب میں، اور جب ہم پہاڑوں سے لڑیں گے تو ہمارا پلہ بھاری رہے گا۔

"ایسٹ انڈیا کمپنی کی سازشوں کا بھانڈا تو پہلے ہی پھوٹ چکا تھا اور ساری ریاستیں اس سے متنفر ہو کر اس کی دشمن ہو چکی تھیں۔ اور جنگی نقطۂ نظر سے یہ بات دور رس اور فہم و ادراک کی تھی اور جب سارے ہندوستان کی قوت جمع کر ایک طرف ہو جاتی تو انگریز تو کیا رستم زماں کو بھی ملک کے باہر پھینک دیا جاتا۔ مگر کیا کیا جائے۔ اس میں بہادر شاہ خود بدولت سراسر قصوروار تھے۔ حکومت اور سیاسی معاملے میں نہ تو دور اندیشی سے کام لیا اور نہ کوئی تکان ہی گوارا کی، اور شہزادوں کے ہاتھوں میں کھیلتے رہے۔ فرماں روا سے زیادہ ان کی حیثیت ایک کھلونے کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ سب کے سامنے اپنے کو مظلوم بنا کر پیش کرنے میں انہیں مزہ آتا تھا۔

ان کے اس فعل میں ان کی فطرتِ صوفیانہ کو بھی بہ درجۂ اتم دخل تھا۔ وہ درویشانہ زندگی گزارنے کے قائل تھے۔ مشکلات سے ہمیشہ گریز کیا۔ یہی وجہ تھی کہ مرزا الٰہی بخش نے جو انگریزوں کا وفادار جاسوس اور بن داؤد کا غلام بن چکا تھا عالم پناہ پر اپنی چرب زبانی سے ڈورے ڈال کر وہ رنگ چڑھایا اور وعدوں کے ایسے سبز باغ دکھائے کہ بہادر شاہ رشتہ خطمی ہو گئے۔ لیکن فرنگیوں کے سب وعدے وعید کا حشر کیا ہوا کہ خود قید ہوئے، غدر پڑا اور لوگ شہید ہوئے۔ ایک معمولی غلطی نے مغلوں کی قدیم پُرشکوہ سلطنت کو ملیامیٹ کر دیا۔"

اتنا کہہ کر حبیب الدین چپ ہو گئے۔ اُن کے چہرے پر تلخی جھلک آئی تھی اور پرانی یادوں سے وہ آزردہ نظر آرہے تھے۔ میر نہالی نے بیٹے کی پُرحقائق باتیں سُن کر اطمینان و سکون کا سانس لیا۔ کمبل شاہ نے جو ابھی تک بڑی خاموشی سے باتیں سُن رہے تھے اپنے گرد کمبل کو اچھی طرح لپیٹا اور اس طرح سے بولے کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ کہنے والے ہیں اس کو سننے کے بعد کسی کو ایک حرف کہنے کی گنجایش نہ ہوگی۔

"بیٹا تم بچے ہو۔ تم نے ظاہری اسباب و علل دیکھے ہیں۔ لیکن مغلوں کا زوال کیوں ہوا؟ یہ نازک مسئلہ ہے۔ یوں کہو کہ قادرِ مطلق کا منشا ہی یہی تھا۔ بہادر شاہ تو کیا اگر ہفت اقلیم کے بادشاہ بھی آکر انگریزوں کو نکالنا چاہتے تو ظفریاب نہ ہوتے۔ کیونکہ ان کے بزرگوں سے کچھ ایسی غلطیاں سرزد ہوئی تھیں جن کی سزا ملنی لازمی تھی۔ بھلا محب و محبوب کو جدا کرنے کا انھیں کیا حق تھا؟ مگر انھوں نے زعمِ حکومت میں کیا۔ محمد شاہ کو حضرت محبوب الٰہیؒ اور امیر خسروؒ کے درمیان دفنا کر انھوں نے وہ گناہِ عظیم کیا جو ناقابلِ معافی ہے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ اور امیر خسروؒ ایک دوسرے کے عاشق زار تھے۔ محبوب الٰہی کا فرمانا تھا کہ اگر اسلام اس بات کی

اجازت دیتا کہ دو آدمی ایک قبر میں دفن کر دیے جائیں تو میری اور خسرو کی قبر ایک ہی ہوتی
جس درجہ محبوب الٰہی کو حضرت امیر خسرو سے عشق تھا یہ حرکت ناجائز تھی کہ تیسرے
شخص کو درمیان میں لاکر عاشق و معشوق میں پردہ حائل کر دیا جائے۔ چنانچہ مغل اور
ان کی سلطنت صفحۂ دنیا سے مٹ گئی۔ کاملین اور اللہ کے محبوبوں سے ضد باندھنی
تباہی کا پیش خیمہ ہے اور ان کے معاملات میں دخل اندازی کا یہی انجام ہے۔“

کمبل شاہ سے وضاحت سن کر میر نہال کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی، اور
حبیب الدین کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے جوش عقیدت سے اپنے
سر جھکا لیے۔ دونوں کو یقین تھا کہ کمبل شاہ محض درویش ہی نہیں بلکہ ان کا درجہ قطب
کا ہے اور ان کی بات حرف بہ حرف صحیح ہے اور رازِ خداوندی کا انکشاف کرتی ہے۔
مگر اس کے باوجود جو تنزل کی گھٹائیں ادبار کی برق گرا چکی تھیں وہاں تمنائے گل و
لالہ عبث اور سعیٔ بے سود تھی۔

۸

۱۹۱۱ء دسمبر کی سات تاریخ تھی اور دربار کی ہونے والی صبح۔ آج دلّی تاروں کی چھاؤں میں بیدار ہو گئی تھی اور دلّی والے تیار ہو ہو کر جامع مسجد کو روانہ ہونے لگے۔

غفور تو آج العارز تیل بہاکر تہجّد کے وقت ہی سے تیار بیٹھا تھا اور اس نے منہ اندھیرے سے سب کو جگا دیا تھا۔ میر نہال کی طبیعت جانے کو مطلق نہ چاہتی تھی مگر ان کے سب بیٹے سر ہو گئے، اور بچوں کی خوشی کرنے کو بادلِ ناخواستہ آمادہ ہو گئے لڑکوں بالوں نے جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر بڑھیا بڑھیا کپڑے پہنے اور اپنی جیبوں میں خشک میوہ بھر لیا۔ سردی زیادہ تھی۔ میر نہال نے بھی اپنا جامہ دار کا کشمشی چغہ جس پر اودی کیریوں کی ترنج بنی ہوئی تھی پہن لیا۔ حبیب الدین کا چار سالہ لڑکا نسیم اپنے بڑے بھائیوں کو جاتا دیکھ کر چلنے کے لیے مچل رہا تھا۔ آخر میر نہال نے اس کو بھی تیار کرواکے غفور کے کاندھوں پر سوار کروا دیا۔ بچّوں سمیت جب یہ گھر سے چلے ہیں تو رات بھیگ چکی تھی اور آسمان پر ڈوبے ہوئے ستاروں کا ہلکا ہلکا غبار باقی تھا۔

اصغر اور سرور کے حوالے سب چھوٹے بچے کر دیئے گئے اور وہاں ان سب پر نظر رکھنے کو میر نہال خود موجود تھے۔ اس وقت بے حد سردی تھی۔ دسمبر کی یخ بستہ ہوائیں جسم کو کاٹتی ہوئی جگر کے پار ہوئی جاتی تھیں۔ ٹھنڈک سے خون منجمد ہو کر ناک اور کان سُن ہو گئے تھے اور انگلیاں ٹھنڈ سے گلی جاتیں۔ دانت سردی سے کٹ کٹا بجے جاتے اور بدن میں ہر سرد جھونکے کے ساتھ تھرتھریاں چھوٹ جاتی تھیں۔ لوگ بہت پھرتی سے چل رہے تھے تاکہ کچھ تو گرما جائیں۔

میر نہال جس وقت جامع مسجد پہنچے تو صبح کا ستارہ افق کے آخری سرے پر اب تک روشن تھا اور کہر کی وجہ سے اس کی روشنی نیلگوں ہو گئی تھی۔ لوگ ان سے کہیں پہلے آن آن کر لکڑی کے چبوتروں پر جگہ گھیر چکے تھے۔ میر نہال آگے بڑھے مگر سیڑھیوں پر بھی مخلوق آ کر بیٹھ چکی تھی۔ میر نہال بیٹوں پوتوں اور نواسوں کے لاؤ لشکر کے ساتھ اِدھر اُدھر پھرے اور بر وقت تمام ایک آرام دہ جگہ تلاش کر کے سیڑھیوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی سلوں پر بیٹھ گئے جو شبنم سے گیلی ہو رہی تھیں۔ نسیم غفور کے کندھے لگے لگے راستہ ہی میں سو گیا تھا۔ بیٹھنے کے بعد اس نے نسیم کو اپنی گود میں لٹا لیا۔ صبح کا ستارہ کچھ دیر ٹمٹمایا اور پھر ڈوب گیا۔ ہلکی فیروزی روشنی کی تحریر مشرقی کناروں میں پھیل گئی۔ چمگادڑوں اور بڑا گڑوں نے سمروں پر چکر کاٹے اور میناروں کے اندر اٹک گئیں۔

محافظ دستے کے سپاہی جابجا گشت کر رہے تھے اور گورے قواعد کرتے ہوئے سڑک پر دور تک چلے جاتے۔ کپتان حکم دیتا۔ یہ دیسی زبان کا کٹرا کا اُبھرتا اور وہ اسی طرح واپس آ جاتے۔ لوگوں کے ہنسی ٹھٹھے کا شور اور بات چیت کا غل غپاڑا ہوا میں گونج رہا تھا جس میں سپاہیوں کی گاہ بہ گاہ بجتی ہوئی سیٹیوں کی آواز اور فوجیوں کے قدموں کی منظم چاپ بھی سنائی دیتی۔

کہر بہت گہری تھی اور آنکھوں میں گھسی جاتی تھی۔ بیٹھنے والوں کو سردی سے چھینکیں آرہی تھیں۔ لوگوں نے ملیدے کے تکوں نے رومالوں سے کان ڈھک رکھے تھے۔ بعضے بعضے بڈھے بڑے روئی کے کنٹوپ اور اونی ٹوپیاں اوڑھ کر آئے تھے۔ اور وہ سب سُو سُو کر کے اپنے ہاتھ رگڑ رگڑ کر گرم کر رہے تھے اور ساری خلقت سُکڑی سکڑائی بیٹھی ہوئی سویرا ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ زمین سے آسمان تک کہر کا دُھواں ہی دھواں پھیلا ہوا تھا۔

خدا خدا کر کے صبحِ کاذب کا دودھیا اندھیرا گھٹا اور صبح کی نقرئی روشنی دھیرے دھیرے بڑھی۔ کچھ دیر بعد بامِ مشرق پر آفتاب کی پہلی شوخ و شنگ کرن مسکرائی اور جھالک جھلک کر دامنِ کہر سے جھانکا۔ روشنی کے ہلکے عکس میں ہر چیز بالکل سرمئی نظر آنے لگی۔ فضا خنک تھی اور سماں سہانا۔ درختوں پر سے کوے پر پھڑ پھڑا کر مختلف سمتوں میں اُڑنے لگے اور چڑیوں نے چوں چوں شروع کر دی تھوڑی دیر بعد اپنی قرمزی اور ارغوانی شعاعوں کی جلو میں سردی سے کانپتا ہوا خورشید نکل آیا۔ لال قلعہ کے کنگورے سُرخ شعاعوں میں نہا کر یاقوتی ہو گئے۔

گوری پلٹنوں کے دستے سڑکوں پر قطار در قطار استادہ ہو چکے تھے اور اس طرح چوکس کھڑے تھے کہ انکو دیکھ کر شبہ ہوتا تھا کہ مبادا ہجوم میں سے کوئی دل جلا بادشاہ کی سواری آنے پر ان کے بادشاہ پر حملہ نہ کر دے۔ جب آفتاب اور بلند ہوا تو کہر کے سرمئی بادل چھٹ گئے۔ چاروں طرف روشنی ہی روشنی پھیل گئی اور شعاعوں کی حدت سے ٹھٹرے ہوئے جسموں میں حرارت کی لہر دوڑ کر جانوں میں جان آگئی۔ اوس کے قطرے الماس کی طرح جھل مل جھل مل جگمگا اُٹھے۔ لکھوکھا انسان بے مثال اور زرق برق کپڑوں میں منتظرِ دید نظر آرہے تھے۔

آخر کار سلامی کی توپیں داغی جانے لگیں اور بادشاہ سلامت کی آمد کا

غلغلہ بلند ہوا۔ کروڑوں پُرشوق نگاہیں لال قلعہ کے دروازے پر جم گئیں۔ گولوں کے دھما کے ساتھ ہی ہجوم میں ایک نعرہ بے ساختہ بلند ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بادشاہ سیدھا ان ہی کے پاس آ گیا ہے۔

بہت دیر اور بڑے انتظار وں کے بعد لال قلعے کے وہ دروازے کھلے جن میں سے کبھی مغل شہنشاہ بڑے تزک واحتشام سے جلوہ گر ہوتے تھے۔ جلوس نکلنا شروع ہوا۔ پہلے پیدل سپاہی نیلی، سرخ اور سبز چارخانے کی وردیوں میں فوجی طبل وعلم کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے گزرے پھر ان کے پیچھے فوجوں کے دستے آنے لگے۔ ان کی وردیوں کے چمکتے ہوئے بٹن اور پیٹیاں اور ان کے کاندھوں پر رکھی ہوئی بھاری بھرکم سنگینوں کی انیاں جن پر سورج کی کرنیں پڑ کر تر بہ بناتیں اور آنکھوں میں چکاچوند پیدا کرتی تھیں۔ اس کے بعد گھوڑ سواروں کے جرار لشکر عسکری قوت کا زبردست مظاہرہ کرتے ہوئے آئے۔ عوام الناس حیرت واستعجاب سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بادشاہ سلامت کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگے۔ ان سواروں میں بادشاہ کو نہ دیکھ کر بہت سوں کو سخت مایوسی ہوئی۔ گھورتے گھورتے ان کی آنکھیں بھی دُکھنے لگیں اور وہ بے دلی سے ایک دوسرے سے کہنے لگے: اجی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں سبھوں کے منہ لال چقندر، اور صاحب کپڑے بھی ایک سے۔ دوسرا جواب دیتا۔ حضت ایک ہی سانچے کی ڈھلائی ہے۔ عجب مخلوق ہے نا معلوم کون سے ملک کا جناور ہے نہ بادشاہ میں فرق نہ سپاہی ہیں۔

جنہوں نے مغلوں کا ساتھ دیا تھا یا اپنا حق آزادی قائم رکھنا چاہا تھا، انھیں تو سرکش اور مفسد قرار دے کر غدر کے بعد ہی انگریزوں نے تلف کر دیا تھا۔ دوسرے دل کہ یہ حشر ہوتا دیکھ کر سب کو اپنی اپنی پڑ گئی تھی اور بہت سے والیانِ ریاست کو اپنی جاگیروں اور گدیوں کی فکر جب

لاحق ہوئی تو انھوں نے اپنے منصب برقرار رکھنے کو انگریزوں کی اطاعت قبول کرکے ان کے وفادار رہنے کا بیڑا اٹھالیا۔ اپنے وطن اور اپنے لوگوں سے یہ ایک طرح کی غداری تھی مگر ان کو نہ اس کا کچھ افسوس تھا نہ ملال، اور آج وہ سارے نواب رئیس بہ نفسِ نفیس خود دربار کے شاہی جلوس میں شامل تھے اور اس وقت ان ہی رجواڑوں اور جاگیرداروں کی سواریاں آرہی تھیں جو بیش بہا زروجواہر سے مرصع اطلس اور کمخواب کی پوشاکیں پہنے اپنے صافوں میں قیمتی سرپیچ لگائے ہوئے بڑی شان اور بڑے فخر سے اکڑے ہوئے بیٹھے تھے۔ میر نہال کی نگاہ جس دم ان پر پڑی تو حب الوطنی نے جوش مارا اور وہ غیرت سے زمین میں گڑ گئے۔ ان کا دل اندر ہی اندر اپنے ہم وطنوں کی دغا بازی و فریب کاری پر غصہّ و نفرت سے کٹا جاتا تھا۔ ان کے نزدیک ان گدّی نشینوں کی وقعت ایک رہزن سے زیادہ نہ تھی۔ اور انھوں نے طنزیہ اپنے سے کہا، بڑے طرم خاں بن کر ہمارے غنیموں کے خیر خواہ بنے ہیں، اور پھر اپنے جوتے کی نوک کی طرف دیکھنے لگے۔ سواریاں گزرتی رہیں اور میر نہال گردن جھکائے ہوئے بے تعلق ہو کر سوچتے رہے۔

یہ وہی دِلّی ہے۔ یہ وہی راستے جن پر کبھی وہ بادشاہ گزرا کرتے تھے جن کی حکومت کا سکّہ سب کے دلوں پر تھا۔ وہ شہرۂ آفاق تاجدار گزر گئے۔ گو وہ خود صفحۂ ہستی سے مٹ چکے، ان کی سلطنت روئے زمین سے ختم ہوئی، مگر ان کا نام آج بھی باقی ہے حالانکہ وہ شاہ سطوت رہے نہ ان کا وہ طمطراق۔ اور یہ انگریز ایسے سبز قدم آئے کہ ملک ہی کا تیہ پانچہ کرکے اس کو تاراج کر دیا۔ ایک حاکم کو دوسرے حاکم کے خلاف اُبھارا، بھائی کو بھائی سے بدظن کیا۔ بیٹے کو باپ کا بدخواہ بنایا۔ جھوٹ اور نفاق کا بیج بوکر خود بیچ کے بچولیے بن گئے۔ جس کا پلّہ جھکتا دیکھا چمگادڑ کی طرح اسی کی طرف ہو کر ایک کو شاباش تو دوسرے کو بدھائی دی۔ دغا و فریب کا ایسا کھیل

کھیلے کہ مہرہ سے مہرہ لڑ گیا۔ ہم بازی ہار بیٹھے اور ان کے پانسے سیدھے آئے اور انھوں نے بڑھ کر ہم کو زنجیریں پہنا دیں۔

آفتاب اونچا ہو کر سروں پہ آ گیا تھا۔ کرنیں لوگوں کے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔ گرمی سے پیشانیوں پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اور گال تمتما اٹھے تھے۔ مہاراجگان کی گاڑیاں کبھی کی جا چکی تھیں۔ اور اب کھلی چوکڑیوں میں اور گھوڑوں پر لاٹھ بہادر گورنر، کرنیل، جرنیل اور کپتان اور دیگر بڑے بڑے عہدیداروں کا تانتا بندھ گیا تھا، جن کے ہمراہ بکتر بند سوار اور مسلح ٹامی، انگریزی سپاہ کے دستے جن میں دیسی جوان بھی تھے جو ہاتھوں میں برچھیاں اور نیچے سنبھالے شانوں پر بندوقیں رکھے چلے آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ دائیں بائیں آگے پیچھے بدیسی اسلحہ کی گاڑیاں اور اجنبی ساخت کی بھاری بھاری توپیں تھیں۔ ان کی نالیاں اور دہانے ان بیچارے عوام کی سمت جو اب محکوم اور غلام تھے اس طرح اٹھے ہوئے تھے گویا آج بھی وہ یہ دھمکیاں دے رہی تھیں کہ ہندوستان کو ہم ہی نے فتح کیا اور ہمارے ہی بل بوتے پر تم قابو میں بھی آئے ہو۔ اور میر نہال کو معاً یہ خیال آیا کہ کب تک یہ ہمیں اپنی دھاک بٹھا کر قبضہ میں رکھ سکیں گی۔ کیا یوں ہی ہم ہمیشہ غلام رہیں گے؟

میر نہال نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ پھر ڈالی اور انگریزوں کے لال بھبوکا چہرے دیکھ کر پھر ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ انھوں نے حقارت سے اپنا منھ پھیر لیا اور پھر ان کے خیالات کی کڑی سے کڑی مل گئی ہوں یہ وہی تو فرنگی ہیں جو سات سمندر پار سے تجارت کے بہانے یہاں آئے اور جپہ بھر زمین مانگی اور اور حکومت کی ہوس میں کنکھجورے کی طرح پنجے گاڑ دیے۔ اور یہ تاجر آج ہمارے آقا بنے بیٹھے ہیں۔ میر نہال کا اس وقت جی چاہتا تھا یا تو زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں یا آسمان ان کو نگل جائے۔ فرنگی افواج ہنوز گزر رہی تھیں اور چیونٹیوں

کی قطار کی مانند سپاہیوں کی لمبی لکیر سڑک پر اس قدر آہستہ روی سے جا رہی تھی جیسے ان کا سلسلہ تا درِم حشر اسی طرح قایم رہے گا۔

میر نہال کے واسطے یوں تو سارا نقشہ غیر مانوس اور اجنبی تھا جس سے ان کو قطعی دلچسپی نہ تھی مگر ہتھیاروں کی چمک دمک جن کی وجہ سے ہندوستان پر انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی تھی اور فرنگیوں کی بے دردصورتیں نشتر کا کام کر رہی تھیں اور ان کے لیے یہ دیکھنا ناقابلِ برداشت ہو چکا تھا۔ یہ سب منظر بھلانے کو انھوں نے اپنی آنکھیں زور سے بند کر لیں مگر تلخ یادوں نے ان پر یلغار کر دی۔ اور ان کے ذہن میں تاریخ کا وہ باب کھل گیا جس کا ہر لفظ آنسوؤں سے رقم تھا اور ہر سطر خوں چکاں، انھوں نے اپنا دھیان ہٹانے کو آنکھیں کھول دیں۔ ان کے سامنے شاہجہاں کا بنایا ہوا وہ لال قلعہ چپ چاپ کھڑا تھا جو آج تک ایک عالم میں سنگ تراشی اور صناعی کا بے مثال شاہکار ہے۔ اس میں شاہ جہاں کے جذباتِ حسن و جمال اور نزاکت اور لطافت کے دوش بدوش تیموری ارادوں کی بلندی جرارت اور اولوالعزمی بلکہ اس کے خوابِ حسن اور فکر و خیال کی پرواز بھی جلوہ گر نظر آ رہی تھی۔ اس حسن کے پجاری نے کہیں سنگ و خشت کو جامع مسجد جیسی حسین و جمیل شکل عطا کی اور کہیں پُر شکوہ اور عظیم الشان لال قلعہ کو تشکیل دیا جسے اب ایک غیر قوم اس بے دردی سے روند رہی تھی۔ میر نہال کے داہنے ہاتھ پر شہر پناہ کی فصیلیں تھیں جن سے کوس بھر کے فاصلے پر خونی دروازہ دکھائی دے رہا تھا اور اس دروازے کے بیچ سے شیر شاہ کی بنائی ہوئی لمبی چوڑی سڑک عمرِ خضر کی طرح چلی جا رہی تھی جس کے شرق میں پرانا قلعہ تھا جس کو فیروز شاہ تغلق نے چھ سو برس پہلے تعمیر کیا تھا اور اسی سنہرے ماضی کی یاد وہ سیم تن و مرمریں ہمایوں کا مقبرہ تھا اور قطب مینار جن کا سلسلہ جگ جگ پرانے ہستنا پور تک جا پہونچا تھا اور یہیں سے ہندوستان کے اس عہدِ قدیم کا سراغ ملتا ہے جب ہندوؤں کی عظیم الشان تہذیب پھل پھول

رہی تھی۔ کبھی اس خطے کو انھوں نے اپنی راجدھانی کے لیے منتخب کیا تھا اور اس کا سنگِ بنیاد رکھنے سے پہلے نجومیوں اور جیوتشیوں نے رمل و نجوم سے نحس و سعد ساعتیں دیکھیں تھیں، پھر مہورت لے کر دلّی کی اساس یہاں رکھی گئی تھی۔ اور ان قدیم دِلّیوں کے بچے بچائے کھنڈرات ہستنا پور میں اب بھی موجود ہیں جو کبھی ہندوستان کا مایۂ ناز تھیں، اور جن کی شان و شوکت سے اس کی عظمت کا پتہ چلتا تھا، جب ان کے تمدن کا بول بالا تھا۔ تب دلّی کی شہرت کے چرچے جہاں گیر تھے اور سیاح اس کی آن بان کے قصیدے پڑھتے تھے اور شاعر اس کی زیب و زینت کے گیت گاتے تھے۔ راجہ اشوک کے زمانے میں یہ اپنے منتہائے عروج و کمال پر تھی۔ مہرولی میں اشوک کی لاٹھ اب تک کھڑی ہے جو اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ کبھی یہاں بھی زرّیں زمانے آئے تھے۔ یہاں کے زمان و مکاں بھی کبھی رفعت مآب تھے۔

اس سرزمین کو اپنے پر یہ غرور تھا کہ وہ اورنگ زماں ہستیاں، وہ شہریار اور کجکلاہ اس میں رستے بستے تھے جن کا جواب آفاق میں نہ تھا۔ کبھی اس میں وہ جید سلاطین، وہ قیصر و کسریٰ، وہ علوم و فنون والے حکومت کرتے تھے جن کی یکتائی اور جلالت کی نظیر تاریخ بھی نہ دے سکی اور آج اسی دلّی پر ایک نامہربان قوم نے آ کر زبردستی اپنا تسلط جما لیا تھا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ ان فرنگیوں کو نہ ملک سے محبت تھی اور نہ اس کی قدر۔ پھر وہ اس کے سپوتوں کے رفیق و ہمدرد کیسے ہو سکتے تھے؟ وہ سر جو کبھی خم ہونا نہ جانتے تھے آج ان کی گردنوں میں غلامی کے طوق جھول رہے تھے۔

اب جلوس جامع مسجد کی طرف بڑھ رہا تھا اور گوروں کے رسالے اور ہندوستان کے ہراول کے سپاہی جو نئے نئے سرکار انگریزی کے نمک خوار بنے تھے اپنی نئی نئی وردیوں اور نئے نئے جنگی ہتھیاروں سے مزین سینہ تانے قدم اٹھا رہے تھے۔ جلوس اب

جامع مسجد کے عین مقابل آچکا تھا۔ مُشکی گھوڑوں کے سُم سُرخ پتھر کی سلوں پر پڑتے تو نعلوں میں سے چنگاریاں نکلتیں۔ ٹاپوں سے سڑک کے پتھر بجتے اور بڑی دیر تک فضا میں آواز گونجتی رہتی۔ خلقت دیدے پھاڑ پھاڑ کر حیرت، تعجب اور رشک سے انھیں دیکھ رہی تھی۔ نئی بناوٹ کے ہتھیار، نئی قسم کے فوجی اور ولایتی بندوق طمنچے ان کی کشش کا باعث بنی ہوئی تھیں۔

مذہب اکثر ایسے ہاتھوں میں رہا ہے جنھیں اس سے تو کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ مردہ دوزخ میں جائے گا یا جنت میں؟ انھیں محض اپنے حلوے مانڈے سے غرض ہوتی ہے چنانچہ اسلام کے کرتا دھرتا کٹھ ملاؤں نے عام مسلمانوں کے اصلی جذبات سے بالکل بیگانہ ہو کر محض اپنی طمع اور مطلب براری کے واسطے بادشاہ سلامت کی خدمت میں تمام مسلمانانِ دِلّی کی جانب سے ہدیۂ تہنیت پیش کیے تھے جو جامع مسجد کے عمدہ دروازے پر لٹکائے گئے تھے اور مزید خلوص ووفا اور اپنی نیک نیتی انگریزوں کو جتانے کے لیے ان پر پھولوں اور گوٹے کے ہار آویزاں کیے تھے۔ اور آج یہ بات خصوصاً اچھی طرح آشکارہ ہو چکی تھی کہ بعض لوگ مذہب کی اوٹ میں بدعنوانیاں کرتے ہیں اور محض اپنی عزت خواہی کے لیے ان کا مذہب میں عمل دخل شقاوت اور چیرہ دستیوں کا سبب ہوتا ہے۔ جب کچھ علما شاہی جلوس میں ہاتھیوں پر بیٹھ کر نکلے تو دلّی والے تماشائیوں نے انھیں علمائے فیل کے خطاب سے سرفراز کیا۔

میر نہال سخت پشیمان ہو رہے تھے کہ ناحق سب کے کہنے سننے سے یہاں آ گئے ان کا دماغ پراگندہ تھا اور ایک خیال کے بعد دوسرا خیال ماضی اور شعور کے کونوں کھدروں میں سے نکل نکل کر انھیں اور زیادہ افسردہ کر دیتا۔

جامع مسجد میں لٹکے ہوئے ہاروں کو دیکھ کر انھوں نے پھر سوچا یہ وہی جامع مسجد ہے جس کو ڈھانے کے لیے کمپنی بہادر نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا اور کس قیامت کی

گرا ہ باری کی تھی ۔مگر جس کو خدا رکھے اسے کون چکھے ۔ اس کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ سے نہ کھسکی، اور جب اس طرح بھی ان کو اپنے ارادوں میں کامیابی نصیب نہ ہوئی تو وہ اس کو گرجا گھر بنا دینے کے درپے ہو گئے ۔لیکن ان کا یہ حربہ بھی بروئے کار نہ آ سکا۔

اس خیال کے آتے ہی میر نہال کے مندمل زخم جیسے پھر سے ہرے ہو گئے۔ جگر کی تراش لہو دینے لگی ۔ ان کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

سن اٹھارہ سو ستاون دلّی کو راس نہ آیا لیکن چودہ ستمبر کا منحوس دن تو اس کے واسطے ہنگام مرگ تھا اور اس کا ابدی زوال۔ اس کی قسمت کا ستارہ ڈوب گیا اور وہ غارت و تاراج ہو کر غیروں کی دست برد میں چلی گئی ۔

اس جامع مسجد نے شاہی جلوس کے علاوہ بھی ایک اور منظر دیکھا تھا اور ان کو وہ المناک واقعہ اپنی پوری تباہیوں کے ساتھ یاد آ گیا۔ میر نہال اس وقت دس برس کے تھے اور انھوں نے وہ جاں گداز حقیقت اپنی ان ہی آنکھوں سے دیکھی تھی جن سے وہ آج تاج پوشی کا جلوس دیکھ رہے تھے ۔

اس دن جمعہ کا روز تھا۔ ہمیشہ کی طرح ہزاروں مسلمان جمعہ کی نماز کو جامع مسجد میں جمع ہوئے تھے ۔شومئ تقدیر کہیے یا ہونے والی بات ۔ اس دن ٹامس میٹکاف جو فرنگی مہم کی پیش قدمی کر رہا تھا، چار ماہ کی لگا تار منہ توڑ ناکامیوں کے بعد آخر شہر کی فصیلوں میں شگاف ڈالنے میں کامیاب ہو گیا اور بڑھتا ہوا اسپلینڈ سڑک پر دارا لشفاء خیراتی شفا خانے کی آڑ لے کر اُسنے جامع مسجد کو مسمار کرنے کے لیے پے درپے حملے شروع کر دیے۔ جب توپوں کی گھن گرج ہوئی تو سجدوں میں سرنگوں مسلمانوں کو یہ ہونی شدنی خبر ملی ۔ اس وقت ان کے سان و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وقت شہادت اتنا قریب ہے۔ بارگاہِ خدا میں آنے والے بالکل نہتے تھے ۔ دستور کے مطابق ان کی کمر دوں میں ایک ایک کٹاری یا خنجر لٹکا ہوا تھا۔ کچھ دیر تو اس خبر کو سننے

ہی سب پر سناٹا چھا گیا مگر مسلمان کبھی ایسے نازک موقعوں پر ہراساں نہیں ہوئے۔
اسی مجمع میں سے ایک مردِ میداں اٹھا اور تمام مسلمانوں کو ایک عجیب سرفروشانہ جذبہ و
جوش میں گرج کر للکارا میر نہال کے کانوں میں وہ آواز اور وہ الفاظ آج بھی اسی طرح
گونج رہے تھے: "اے مومنو موت برحق ہے، اور ایک مسلمان کے لیے شہادت سے
بہتر کوئی موت نہیں ہو سکتی۔ اپنی ابدی حیات کے طلبگار ہو تو میرے ساتھ آؤ۔
آج ناموسِ اسلام خطرے میں ہے۔ ملت پر برا وقت آن پڑا ہے۔ اٹھو اخوتِ حسین
تم کو پکار رہی ہے۔ نام خدا و رسول مٹانے والے کافروں کو مزہ چکھا دو۔ اور برادرانِ
اسلام تم میں سے جس کو اپنی جان و دنیا عزیز ہے وہ شمالی دروازہ پر چلا جائے،
کیونکہ اس طرف نہ دشمن ہے اور نہ موت۔" آخری جملہ کا ردِ عمل یہ ہوا کہ سارے
مسلمانوں نے مل کر ایک ساتھ اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ لگایا۔ جامع مسجد کے
در و دیوار، بام و گنبد نعرہ کے جلال سے ہل گئے۔ اگر اس وقت کوئی سپری سے جری
فاتحِ اعظم بھی ہوتا تو اس نعرہ کی گونج سے اس کا زہرا پھٹکر پانی پانی ہو جاتا۔ لیکن
یہ جنگ توپ و تفنگ کی جنگ تھی۔

میر نہال اس لمحہ کو یاد کر کے ایک خاص فخر و سرور محسوس کر رہے تھے۔ ان
مسلمانوں میں اسلام کی سچی وحدت اور حریت تھی۔ اور ملت میں سے ایک بچہ بھی
ایسا نہ تھا جو موت سے ڈر کر شمالی دروازہ پر چلا گیا ہو۔ تسبیح کے دانوں کی طرح وہ ایک
ہی تاگے میں گندھ گئے تھے، اور ان کے عزم اتنے راسخ تھے کہ بڑی سے بڑی طاقت
بھی ان کے قدم ڈگمگا نہ سکتی تھی۔

وہ مجاہدِ اسلام متحد ہو کر بڑی شان سے جنوبی دروازے پر آ گئے۔ آج ہر ایک
خود اپنا سپہ سالار تھا۔ وہ کون تھا جو آج ان کے حوصلے پست کر دیتا۔ موت کے سامنے
مسلمان کبھی سرنگوں نہیں ہوا۔ موت خود اس کی محافظ ہے۔ یہ ان کی ازلی شان تھی کہ

وہ مٹھی بھر مسلمان جو محض عبادت کے لیے مسجد میں آئے تھے سر پر کفن باندھ کر سر دھڑ کی بازی لگا بیٹھے۔ یہ قلیل تعداد اللہ اکبر کے نعرے لگاتی ہوئی سیلِ رواں کی طرح بڑھی اور حملہ آوروں کے سامنے ننگے سینے تان کر ڈٹ گئی۔ جامِ شہادت کے متوالوں میں سیماب کی تڑپ اور برق کی سرعت آ گئی۔ ان کے جگر پتھر کے ہو گئے اور خالی ہاتھ فولاد کے ہو کر ذوالفقار بن گئے۔ مٹیکاف اپنے ہمراہیوں کے ساتھ سرغنہ بنا ہوا انتظار میں کھڑا تھا اور اس کے چاروں طرف ان جانبازوں کے کشتوں کے پشتے لگے ہوئے تھے جو پہلے ہی مذہب کے نام پر اپنی گردنیں کٹا چکے تھے۔ ان کی بے گور و کفن لاشوں کے ڈھیروں پر گدھ اور چیلوں کے جمگھٹ بیٹھے ہوئے چونچوں سے گوشت نوچ رہے تھے اور کتے ہڈیاں الگ کرنے میں مشغول تھے۔ مٹیکاف نے ہجوم کو دیکھتے ہی توپوں کو شتابے لگوا دیے۔ دھوئیں اور شعلوں کے بادل اٹھے اور گولوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ صفِ اول کے مجاہد اور اللہ کے گھر کی رفاقت میں بڑھنے والے اس کی سیڑھیوں کے پتھروں کو اپنے خونِ وفا سے رنگتے ہوئے عظمتِ خدا پر فدا ہو گئے۔ یہ دیکھ کر باقی مسلمانوں کے حوصلوں میں اور تازگی آ گئی اور یکبارگی ایک غیر فانی ولولۂ شہادت ان کے دلوں میں تڑپا۔ ایک غیبی قوت کی برقی رَو تھی جو ان کو چھوتی ہوئی گزر گئی اور وہ یا علی کہہ کر زخمی عقاب کی طرح اندھا دھند جھپٹے اور مخالف کی سپاہ پر ٹوٹ پڑے۔ فرنگیوں کو یہ قطعاً امید نہ تھی اور مسلمانوں کے اس ناگہانی اور بھرپور حملے سے ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بہت سے اپنی جان بچانے کو میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے مگر یہ چند مجاہد ان کا پیچھا کرتے اور ان کے سر آنِ واحد میں تن سے جدا کر دیتے۔ دلی کے مسلمانوں نے اس روز ایسا جی توڑ مقابلہ کیا کہ انگریز سپاہیوں کی ہمت ٹوٹ گئی اور ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ فرار ہو ہو کر گڑھ گنج پر پہنچنے لگے جہاں ان کا پڑاؤ تھا اور گولہ بارود خانہ تھے۔ مسلمان بھی بے تحاشا ان کے تعاقب میں بھاگ رہے تھے

مگران کے پاس نہ تیر و کمان تھے اور نہ شمشیریں، صرف ایک جان تھی اور ہتھیلی پر سر، دل میں مادرِ وطن کی محبت کا پاک جذبہ، یا پھر ان کی شجاعت۔ میٹکاف نے گراہج پر دم لیتے ہی بیدردی سے توپوں کے دہانے ان کی طرف کھول دیئے۔ گولیاں تڑاتڑ اولوں کی طرح برسنے لگیں اور یہ مجاہد دلوں میں گرمیٔ آزادی کی تمنّا لے کر خاک پر ٹھنڈے ہو کر وطن اور مذہب پر قربان ہو گئے۔

آسمان پر خاک کے آتشیں بگولے اُڑ رہے تھے۔ پوری دلّی توپوں کی گرج سے سہم رہی تھی اور زمین پر خونِ شہیداں کے دریا بہہ رہے تھے۔ ایک آدھ جو گولہ بارود سے بچ رہا وہ شکستہ پا ہو کر لوٹ گیا مگر شہید نہ ہونے کا افسوس اس کی رُوح کو تلملاتا رہا۔

میر نہال کی نگاہوں کے سامنے یہ سارے مناظرِ موت و حیات کی وادیوں میں سے نکل کر ایک ایک کر کے آ گئے۔ انھوں نے ٹھنڈا سانس لیا، اور ان کے دل نے کہا، اب نہ وہ دلّی رہی نہ وہ دل والے۔ ایک وہ ۱۸۵۷ء کے شجاع و جواں ہمت مسلمان تھے اور ایک یہ تماشائی۔ انھوں نے بیٹھے ہوئے مسلمانوں کے جمِ غفیر پر ایک حقارت بھری نظر ڈالی۔ یہ ۱۹۱۱ء کے بے غیرت مسلمان ہیں جو سینوں میں چڑیا کا دل لیے بیٹھے ہیں اور بے دردِ صیاد کی عطا کی ہوئی ذلت و خواری پر مطمئن اور خوش ہیں میر نہال کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ کثرتِ غم سے ان کی آنکھوں کے دو آبے گو خشک ہو چکے تھے مگر ان کا دل لہو کے آنسو بہا رہا تھا۔ جہاں کبھی وہ ہنگامۂ قیامت اٹھا تھا۔ آج وہ جامع مسجد کی ان ہی سیڑھیوں پر گم سُم بیٹھے ہوئے اپنی دُنیا کو تباہ و برباد ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اس دلّی پر جوان کو اپنے سے زیادہ عزیز تھی نزع کا عالم طاری ہو چکا تھا اور وہ مجبور و بے کس تھے۔

وقت کو قید نہیں کیا جا سکتا اور نہ گردشِ ایام پیچھے پلٹ کر آتی ہے میر نہال کا

وہ زمانہ جو در اصل ان کا اپنا تھا کبھی کا گزر کر قعرِ ماضی میں گر چکا تھا اور ان کی دنیا جب ہی تہہ و بالا ہو چکی تھی اور حال بے مروتی سے بے گانہ وار ان کے قریب سے آگے بڑھتا جا رہا تھا اور یہ ساعتیں سوگوار تھیں۔ پھر جب امید ہی بے سود تھی تو مستقبل کے پاس ان کے لیے کیا ہو سکتا تھا؟ اس خیال سے کہ ان کا دور ختم ہو چکا تھا، میر نہال کو ایسا محسوس ہوا گویا آغوشِ جہاں میں وہ بالکل تنہا ہیں۔ اور یہ حقیقت کہ ان کی دنیا منہدم ہو چکی تھی، بہت اذیت دہ تھی۔ ان کی آنکھوں کے خشک سوتے اُبل پڑے۔ بے بسی کے آنسو ان کے زانوؤں پر گر گر کے اسی طرح معدوم ہو گئے جیسے ان کا وہ پیارا زمانہ اور ان کی اپنی وہ شاد و آباد دنیا ــــــ اب ان کی زندگی کتنی بے مایہ تھی۔

خلقت جلوس دیکھنے میں محو تھی ــــــ لوگ بعض اوقات تالیاں پیٹتے یا خوش ہو کر سیٹیاں بجاتے بچے ہمک ہمک کر تجسس میں چیخ چلا اور ہنس رہے تھے۔ مگر میر نہال اپنے ہی خیالوں میں غرق تھے۔ اس عرصہ میں ان پر کتنے عالم گزر گئے اور دِلّی کیا سے کیا ہو گئی یہ کسی کو خبر نہ تھی۔ لوگوں کے لیے تو دربار ایک خوشی کا بہانہ تھا اور ایک تماشا اور وہ سب تماشائی بچوں کو محظوظ دیکھ کر میر نہال نے اپنے دل میں کہا: کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔ چاہے انھیں اس وقت خبر نہ ہو مگر ایک دن آئے گا جب بڑے ہوں گے اور ان کو معلوم ہو جائے گا غلامی کیا ہوتی ہے اور آزادی جیسی پیاری شے کھو کر کیسے رنج و محن سے سابقہ پڑتا ہے۔ لیکن یہ راز کیا ہے اور یہ رموزِ حیات کیسے ہیں کہ خوشیاں بھی ان ہی کے حصے میں آئی ہیں جو آنکھیں موند کر اس جہاں میں جیتے ہیں ــــــ بے حسی اور خوشی کا یہ کیسا نباہ ہے؟ کیا بے حسی کا دوسرا نام ہی خوشی ہے؟ یہ ہوش و خرد والے، یہ حساس دلوں کے مالک جن کے دیدہ و دل وا ہیں، ان ہی کے سینے فگار ہو کر ان کے دلوں کے اندر ہی اندر آگ سلگتی رہتی ہے جب ہی

روح تپ تپ کر بھسم ہو جاتی ہے۔ حس اگر نہ ہوتی تو غموں کے انبار کہاں سے آتے؟ اور میر نہال کو آج جو دکھ درد سنا رہے تھے وہ ان کی نزاکتِ حس کا نتیجہ تھے۔

جلوس جامع مسجد کے سامنے سے ہوتا ہوا اس کے پیچھے والی سڑک پر مُڑ چکا تھا۔ لوگ باگ زور شور سے خیال آرائیاں کر رہے تھے کہ کون ان میں بادشاہ تھا اور کون بادشاہ نہ تھا۔ کسی تماشائی کی آواز آئی: "وئی مجھے تو وہ سبز گھوڑے والا باشّا لگ ریا ہے۔ وئی کیسا سینہ تان کے بیٹھا ہے؟ قسم ہے قُلا اُڈّو کی۔"

اس کے دوست نے کہا: "باولا ہوا ہے، ابے چیڑی تن کے غلام۔ تیرے باپ دادا نے بھی کدی باشّا دیکھے ہیں؟ باشّا وردی پہن کے بیٹھے گا؟ تو بھی ٹکڑ گدا ہے، دن کا اندھا۔ اوئے وہ تو اس کی فوج فرا کا کوئی سپاہی ہے۔ خا ما خا باشّا بنا دیا وِسے۔"

ان ہی کا ساتھی بولا: "باشّا ہوتے ہیں زرخ برخ پوشاکوں میں۔ اماں دور سے چماچم کرتے ہیں۔ نگہ نہیں ٹھہرتی پیارے وِن پہ۔" اور پھر افسوس سے کہنے لگا: "وئی ان زرخ برخ والوں کے تو جنازے لد گئے یہ تو ولایتی بندر ہیں۔ وردیاں پہن کے ناچتے ہیں۔ تو نے دیکھے ہی نہیں پیارے اصل بادشّا۔"

نسیم کچھ تو کھو کا تھا اور کچھ ماں کی یاد آکر ہڑ کا کر رہا تھا۔ دوسرے بچے بھی ہاؤں ہاؤں اور روں روں کر رہے تھے۔ کوئی گھر جانا چاہتا تھا کسی کو بھوک لگ رہی تھی اور کسی کو پیشاب آ رہا تھا۔ لوگ اپنے اپنے ساتھ حاشتیاں اور تولیں اسی واسطے لے کر چلے تھے کیوں کہ وہاں سے نہ اُٹھ سکتے تھے اور نہ کہیں حاجتوں سے فارغ ہونے کی جگہ ہی تھی۔ چنانچہ انھوں نے بچوں کو تولوں میں پیشاب کروا دیا۔

لیکن نسیم ابھی تک بسورے جا رہا تھا۔ ماں کے پاس جانے کی ضد چڑھ گئی تھی۔ میر نہال نے اس کو غفور سے لے کر اپنی گود میں بٹھا لیا اور گھٹنے ہلا ہلا کر بہلانے لگے۔

"ہاں بیٹے نہ رو، دیکھو ابھی چلتے ہیں۔ اہا یہ گھوڑے کیسے ٹھمک ٹھمک جا رہے ہیں"۔ انھوں نے سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گھوڑے سوار دکھائے۔ "اخاہ بھئی یہ گورے ایسے اچھے اچھے کپڑے پہنے جا رہے ہیں۔ کیسے ہنس رہے ہیں، دیکھو بیٹے ہنسو۔" پھر انھیں کچھ خیال آگیا اور کہنے لگے "یہ ہمیں مٹا چکے اور تمہیں بھی مٹا دیں گے۔" نسیم بڑی معصومیت سے اپنا انگوٹھا منہ میں لیے ہوئے گھوڑے سواروں کو دیکھتا رہا۔ اس کے دادا خدا جانے کیا بکواس کر رہے تھے۔ یہ بے محل باتیں اور ان کی یہ منطق اس کی سمجھ میں مطلق نہ آئی اور اس نے پھر ٹھنکنا شروع کر دیا اور میر نہال پھر بہلانے لگے: ـــ "ہمارا بیٹا روتا تھوڑی ہے۔ بہت بہادر ہے ان گھوڑے سواروں سے بھی زیادہ بہادر۔ ایک دن ان سب کو مار کر یہاں سے دور بہت دور بھگا دے گا۔" نسیم نے جلوس سے نگاہیں ہٹا کر منہ اونچا کر کے دادا کو دیکھا۔ اس کی پلکوں پر دو آنسوؤں کے ٹھہرے ہوئے قطرے آفتاب کی شعاعوں میں جھم جھم جھمک رہے تھے۔ دادا نے ہاتھ بڑھا کر اپنے ہاتھ سے اس کے معصوم آنسو پونچھ دیئے اور اور پھر نا معلوم وہ کون سی امنگ تھی جس کے تحت وہ پوتے کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "ہیں نا نسیم تم بڑے ہو کر بہت بہادر بنو گے نا؟" ان کا لہجہ بیحد پُر امید تھا اور ان کی آنکھیں ماضی اور مستقبل کے سہانے خوابوں سے دمک اٹھی تھیں۔

خاص خاص لوگ گزر ہی چکے تھے۔ میر نہال کو اب بیٹھنا دو بھر ہو رہا تھا۔ دوسرے نسیم نے از سر نو قیل مچانا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے غفور سے کہا: "چلو گھر چلیں"، حالانکہ پورا تماشا ابھی ختم نہ ہوا تھا۔ ان کو جاتا دیکھ کر لوگوں نے ملیٹ کر ان کو دیکھا۔ ضرور انھوں نے سوچا ہو گا یہ بھی عجب آدمی ہے۔

جب وہ بڑی سڑک پر آئے تو سڑکیں ابھی تک بند تھیں۔ اور سر نگر ناکے

پر پہرہ تھا۔ شامی اب تک اپنے فرائض اسی طرح انجام دے رہے تھے، اور ٹین کے سپاہیوں کی طرح ساکت وجامد کھڑے تھے۔ محض ان کے لال چقندر چہروں پر ہری ہری آنکھیں کنچوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ میر نہال کو چاوڑی جانے کی اجازت نہ ملی۔ انھوں نے سوچا چلو چوڑی والوں سے گھر کو ہولیں۔

آج سارا شہر جشن دیکھنے گیا ہوا تھا۔ گلیاں سونی تھیں اور کوچے خاموش، کہیں کہیں کوئی ایک آدھ بنیئے بقال کی دوکان کھلی ملتی تھی۔ جس پر کوئی گاہک نہ تھا اور دوکان دار اس طرح بیزاری سے بیٹھا ہوا تھا گویا مکھیاں مار رہا ہو۔ اور کتے بے تکلفی سے نالیوں میں منہ ڈال کر سڑی گلی الّم غلّم چیزیں نکال رہے تھے۔ قصائیوں کی دوکانوں پر کنڈیاں چڑھی ہوئی تھیں اور سامنے ملبے کی ڈھیری پر دو کتے لال لال زبانیں باہر نکالے مقابلے میں آمنے سامنے ڈٹے ہوئے تھے اور لمبے لمبے نوکیلے دانت نکال کر بری بری آوازوں میں فوں فاں اور ہوں ہوں کرکے دھمکیاں دے رہے تھے۔ کبھی کبھی غصّہ میں پچھلی ٹانگوں سے خاک اڑا کر زور زور سے ہاؤ ہاؤ کرتے تھے۔ لیکن کہیں سے ایک چیل منڈلاتی ہوئی آئی اور جھپٹّا مارتی ہوئی ہڈی کو پنجوں میں دبا کر لے گئی۔ جس ہڈی پر آپس میں جنگ ہو رہی تھی چیل نے آکر اس کا پاپ ہی کاٹ دیا اور وہ منہ دیکھتے دیکھتے رہ گئے اور جھونجھل اُتارنے کو دونوں حریف ایک دوسرے پر پل پڑے اور پھر جہاں ہڈی پڑی ہوئی تھی اس جگہ کو ناک دے دے کر سونگھنے لگے۔

ہوا کے ساتھ کبھی کبھی گزرتے ہوئے جلوس کا غل شور آجاتا یا کبھی بندوق توپ کے سر ہونے کی آواز اُبھرتی۔ ورنہ شہر میں مکمل سناٹا تھا جیسے پوری دلّی موت کی نیند سوگئی ہو۔ اور ان خموش گلیوں اور چوراہوں پر گزرتے ہوئے آج میر نہال کو وہی غدر کا سماں دکھائی دے رہا تھا جب دور سے دندناتی ہوئی گولیوں کی ٹھائیں ٹھائیں

آتی تھی اور لوگوں کے دل دہل جاتے تھے۔ دلّی قبروں کی طرح تاریک اور ہولناک تھی، چاروں جیداروں کی ناشاد لاشیں بے کسی سے پڑی ہوئی تھیں جن کو رونے والے بھی مر چکے تھے۔ دیواریں گری ہوئی، ڈیوڑھیوں کے پھاٹک کچھ جلے ہوئے کچھ ٹوٹے ہوئے، کھڑکیوں کے کواڑ چوپٹ جو ہوا کے ساتھ دھڑ دھڑ کرتے اور یہی معلوم ہوتا کہ ان حسرت زدوں کی نعشوں پر ماتم کر رہے ہیں اور موت ہر کونے میں سے آتی ہوئی دکھائی دیتی، بے کسی اور مردنی ہر چار سمت چھائی ہوئی تھی۔ گدھ اور چیلوں کے لاشیں کھاتے کھاتے پوٹے پھول پھول کر ڈھول ہو گئے تھے۔ یہی خیال ہوتا تھا کہ اجل نے بھی فرنگیوں سے ساز باز کر لی ہے۔

میر نہال سونی گلیوں ہی سے گزر رہے تھے۔ ان کی لکڑی گلی کے پتھروں پر لگتی تو کھٹ کھٹ کی آواز ہو جاتی یا پھر ان کے اپنے قدموں کی چاپ کانوں میں گونجتی۔ جب میر نہال اپنے گھر سے کچھ فاصلہ پر رہ گئے تو ان کو ایسا محسوس ہوا کہ ان کے پیچھے کوئی چیز سڑھ سڑھ گھسٹتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ انھوں نے مڑ کر دیکھا تو ایک پتلی گلی میں سے ہاتھوں کے بل اپنی ٹانگوں کو زمین پر معذوری سے گھسیٹتا ہوا ایک اپاہج فقیر چلا آ رہا ہے اور گلے میں بھیک کی ایک چیتھڑا جھولی لٹک رہی ہے جب فقیر ان کے قریب آیا تو میر نہال نے قدم روک لیے اور ہمدردی اور ترس سے اس کو غور سے دیکھا۔ اور انھیں یقین تھا کہ ان کی نگاہ غلطی ہرگز نہیں کر سکتی۔ اس کا چہرہ مہرہ یقیناً چنگیزی تھا۔ بے ڈھنگی ڈاڑھی اور بانکے دہاڑوں کے باوجود اس کی صورت رعب دار تھی۔ ذلت اور خواری میں بھی خاندانی وقار ٹپک رہا تھا گو آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ستایا ہوا ہے۔ اس عبرت کے مرقع کو دیکھ کر میر نہال کا اپنا چہرہ حسرت انگیز ہو گیا۔ انھوں نے جلدی سے ایک روپیہ جیب سے نکال کر بڑی تمیز سے فقیر کی جھولی میں ڈال دیا، اور پھر پوچھنے لگے: "کیوں صاحبزادے

صاحب کیا آپ بھی فرنگی بادشاہ کا جشن دیکھنے تشریف لے جائیے گا؟"
فقیر کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ضبط کرنے سے گالوں کی رگیں تن گئیں اور وہ ٹھنڈی آہ بھر کر کہنے لگا :

"نہیں بھائی نہ وقت ہمارا ہے نہ اس کے اہتمام۔ ہاں ایک زمانہ تھا کہ ہمارا بھی وقت تھا۔ کبھی ہمارے بھی جشن منائے جاتے تھے۔ ایک جہاں ہماری جھلک دیکھنے کو سرِ راہ منتظر ہوتا تھا۔ لیکن صاحب وہ آئینہ ہی ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا۔ نہ اپنی ہی صورت دیکھ سکتے ہیں اور نہ دوسروں کو دکھا سکتے ہیں۔ کبھی دلاؔوروں کے سر ہمارے قدموں میں جھکتے تھے۔ ہم پالن ہار تھے کوئی ہمارے در سے بے نیل و مرام نہ لوٹتا تھا۔ مگر آج ہم خاکِ پا سے بھی زیادہ ذلیل و خوار ہو کر گلی در گلی کوچہ بہ کوچہ دَربدر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں، وہ بزم کیا اُجڑی کہ راہ گزار بھی جگہ نہیں دیتی اور گردشِ ایام اُڑائے لیے پھرتی ہے"۔۔۔۔۔۔ وہ تھوڑی دیر خاموش ہو گیا اور ٹھہر کر بولا :

"یہ کہتے ہوئے جی چاہتا ہے کہ زبان پر فالج گر جائے کہ چنگیز ہمارا مورثِ اعلیٰ ہے، وہ چنگیز اور ہلاکو جن کے نام سے بھی لوگ تھرا جاتے تھے اور ہم اسی تیمور کی اولاد ہیں جو تاجوروں کا سلطان تھا اس شاہجہاں کا خون ہماری رگ میں دوڑ رہا ہے جس نے ایک مقبرے پر لاکھوں جیرہ شاہی لٹا دیے تھے۔ اب ہم دو دو دانے کو محتاج ہیں۔ ہماری عزت دیکھ کر حضرت عزرائیل کو بھی ہمارے پاس آتے ہوئے عار آتی ہے"۔

آج جو نیرنگیٔ دوراں کے ہاتھوں فقیر تھا اس کو دنیا کبھی میرزا نصیر الملک کہہ کر خطاب کرتی تھی۔ وہ بہادر شاہ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے اور یہ کہتے ہوئے ان کی آواز فرطِ رنج و مایوسی سے ڈوبتی جا رہی تھی۔ انھوں نے گردن جھکا لی۔ آنسوؤں

کے انمول موتی ان کی بھیک کی جھولی پر گرنے لگے۔ میر نہال غم سے چور چور ہو رہے تھے کہ شہزادے نے اجازت چاہی۔ "اب میں چلتا ہوں۔" اور وہ اسی طرح گھسٹ گھسٹ کر گلیوں میں غائب ہو گئے۔

میر نہال تھوڑی دیر وہیں کھڑے رہے۔ انھیں اس عرصہ میں ایسا معلوم ہوا گویا آلِ تیمور کا آخری چراغ، وہ ضعیف العمر شہنشاہ، آج بھی ان کے سامنے مظلوم و مغموم کھڑا ہے۔ پھر خالی ہاتھ اور محزوں دل وہ گھر لوٹ آئے جیسے کوئی تمام اثاثہ اثنائے سفر میں قزاقوں سے لٹوا آئے۔ پرانے اور تلخ واقعات نے انھیں بھی ایک عمارت کی طرح کھوکھلا کر دیا تھا۔ ان کے چہرے پر حقارت آمیز تبسم تھا جیسے گل نے وہ ہمازِ بے ثباتی پا لیا ہو جو بربادی و تباہیٔ گلشن کا سبب تھا۔ اس وقت کائنات ان کے سامنے ہیچ تھی اور انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ دنیا باطل ہے اور زمانہ بے قرار۔ یہ قومیں غیر متزلزل ہیں۔ کون ان سے برسرِ پیکار ہو سکتا ہے؟ شہنشاہ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ خاندان بن کر بگڑ جاتے ہیں۔ لحظہ بہ لحظہ یہ تصویر بدلتی رہتی ہے۔ رات کے بعد دن آتا ہے اور دن کے بعد پھر رات۔ پل پل کر کے جگ بیت جاتے ہیں۔ ہمیشہ سے کارگہِ جہاں کا یہی دستور ہے اور فنا و بقا کی یہی چشمک، اور لبِ حیات مسکراہٹوں سے محروم رہتے ہیں مگر زندگی یونہی سسک سسک کر کسی نو بہ نو جستجو میں آگے بڑھتی رہتی ہے۔ یوں ہی زمانہ دنیا کو بنا بنا کر مٹاتا ہے اور مٹا مٹا کر بناتا ہے بناتا رہے گا۔ گویا یہ مٹی اور بچوں کا کھیل ہے۔ زمین کبھی ہموار نظر آتی ہے اور کبھی نشیب و فراز دکھائی دیتے ہیں۔ فنا و زیست میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

حصّہ سوم

تمام عالم عشق و محبّت دُنیا دُنیا تہمت ہے

دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

—— میر تقی میرؔ

۱

اِدھر شہر میں دربار کی دھوم دھام ٹھنڈی پڑی اُدھر میر نہال کے گھر میں اصغر کی شادی کی چہل پہل دونی ہوگئی۔ اب محض بیس ایک دن باقی رہ گئے تھے کہ مہمان آنے لگے۔ صبح سے شام تک کہار "اماں جی سواری اتروالو" کی آوازیں لگاتے رہتے اور رشتہ کنبہ کے علاوہ سمدھیانے والیاں، منہ بولی چچی پھوپیاں اپنے کُٹم کے کُٹم لیکر ڈولیوں سے اُترتیں۔

جمال بیگم کے کوٹھے سے لے کر مردانے تک سارا مکان کھچا کھچ بھر گیا اور جب اس میں سمانے کی جگہ نہ رہی تو پڑوس کا گھر بھی مانگے کو لے لیا اور دونوں گھروں میں اوپر تلے مہمان بھر گئے، اور یہ حالت ہوئی کہ تیرے اوپر میں، اور میرے اوپر تو۔ رات کو زمین پر پڑاؤ لگتا تو کسی کا سر اور کسی کی پائینتی ہوتی۔ کھانے دانے کا انتظام شرف اللہ کے سپرد ہوگیا جو کلیم بیگم کے ماموں زاد بھائی تھے۔ چنانچہ باہر کے باہر ہی کھانا پکتا۔ جنس کا تولنا تلوانا اور باورچیوں کو دینا دلانا سب وہی نمٹتے۔ اِدھر دیگیں تیار ہوئیں اُدھر وہ پیڑھی بچھا کر آستینیں چڑھا بیٹھ جاتے اور تارا الگ اُتار کے رکھ دیتے

اور کفگیر سے سالن نکال نکال کے لاکھی پیالوں میں دو دو بوٹی دو دو آلو کے قتلے دھر
اوپر سے تار ڈال خوانوں میں لگوا دیتے۔ پہلے مردانے میں کھانا کھلوا دیا جاتا، پھر
زنانے میں۔ صدر دالان میں یہاں سے وہاں تک اشعار لکھے ہوئے لال دسترخوان
بچھ جاتے اور سالن کے پیالے اور خمیری روٹیاں چن دی جاتیں، اور سب بیویاں
کھانے پر بیٹھ جاتیں۔ آپس میں ہنسی ٹھٹھا چھیڑ چھاڑ اور فقرے بازی ہوتی بچے
دوڑتے پھرتے۔ مردانے ڈیوڑھی میں سے ایک ایک کر آوازیں دیتے مگر ان کی کوئی سنوائی
نہ ہوتی۔ اگر کسی بچے کو پکڑ دھکڑ قاصد بنا کر بھیجا تو وہ بھی غائب۔ اب حشر تک باہر
کھڑے گلے پھاڑا کرو، ڈھول بھی پیٹ ڈالو تو خبر نہ ہو۔ بھلا عورتوں کو باہر کی آوازوں
پر کان دھرنے کا ہوش کہاں باقی تھا۔

کھانے سے فراغت پا کر وہ اپنی اپنی دلچسپ مصروفیتوں میں مشغول
ہو جاتیں۔ کوئی بچوں کے کپڑے سجل کر رہی ہے تو کوئی زیور کی الٹ پلٹ میں لگی
ہوئی ہے۔ اور پھر باتیں کرنے کا یہی موقع بھی تھا۔ اب شادی بیاہ کے دنوں میں
بھی فر فر زبان نہ چلے گی تو اور کونسا دن آئے گا؟ ساس بہویں، ماں بیٹیاں، سب
یکجا تھیں۔ اور سب کو اپنی اپنی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ سہاگنیں اپنی شادی کے دن یاد
کر کے جو کچھ بیاہ کے جوڑوں کی باتیں کرتیں۔ مائیں اپنے بیٹوں کے لیے لڑکیوں کو
بہو بنانے کی نظر سے تاڑتیں اور آپس میں کانا پھوسی ہوتی۔ باتوں باتوں میں یہ بھی
بتا دیا جاتا کہ بیٹیوں کا جہیز کتنا مکمل ہو چکا اور کیا کیا بنانا باقی تھا۔ وہ بڑھیاں
جو کھوسٹ ہو گئی تھیں ان کو بھی اپنی جوانی یاد آتی اور وہ بھی اپنے جہیز اور چڑھاوے کی
ایک ایک سوئی اور تلے دانی سے لے کر زیور اور چھپر کھٹ کے ذکر اسی جوش و کیفیت
سے کرتیں حالانکہ وہ سب عزیز اثاثے بیٹیوں کے جہیز اور بہوؤں کے چڑھاوے
میں کب کے نیگ لگ چکے تھے۔ نہیں تو پھر اوروں کے زیور کپڑوں پر نکتہ چینی ہوتی۔

اپنے کپڑے ایک دوسرے کو دکھائے جاتے، پسند کیے اور کروائے جاتے۔ اور پھر آپس میں صلاح مشورے کرتیں کہ اصغر کی برات والے روز کونسا جوڑا پہنیں اور کونسا چوتھی والے دن۔ اور بچے تھے کہ چیاؤں میاؤں کرتے اور آکے اودھم مچائے جاتے رہتے۔ مگر اسی ہائے توبہ میں ان کے کام پورے ہوتے جاتے۔ رنگوں کے میل ملانے، چھپکے بانے، چوہے دنتیوں اور بری بندگی باتوں میں وقت گزرتا معلوم ہی نہ ہوتا۔

آخر جس نیک گھڑی کے لیے بیویوں نے یہ ساری تیاریاں کی تھیں وہ بھی آپہنچی۔ نکاح سے تین روز پہلے ظہر کے وقت سے ساچق کی ہا بڑ تا بڑ پڑ گئی۔ وحیدہ بیگم نے کوٹھڑی کھول کر رنگین کاٹھ کے صندوق میں سے چڑھاوے کے سارے جوڑے نکالے۔ کہنے کو تھے تو کل گیارہ مگر سب کے سب بھاری اور تلواں۔ زربفت اور کمخواب کے پیجامے، گلبدن کے کرتے اور دوپٹے، کسی پر مقیش کے ماہی پشت کا جال اور کسی پر گوکھرو کی دیکھت بھولی کی بیل، کسی پر دھنک کی چھڑیاں اور کسی پہ کیری کی ترنج۔ زیور بھی دوہرا تہرا تھا، سادہ کاری اور کندن، نورتن اور سنا ری الگ۔ گلے میں گلوبند اور چمپا کلی اور چندن ہار، ہاتھوں میں نوگریاں اور جوشن، بازوبند اور پہونچیاں، کانوں میں مگر چودانیاں، کرن پھول اور بالی پتے، پیروں میں جھانجن اور پازیب، ناک کی نتھ اور سر کا جڑاؤ جھومر اور سیس پٹی۔ وحیدہ بیگم نے سب کو چڑھاوا دکھا دکھا کر لکڑی کے ہشت پہل خوانوں میں سجوا دیا، اور اوپر سے کھیلیں اور مرمرے ڈال جھمک جھمک کرتے ہوئے پٹاپٹی کے خوان پوشوں سے ڈھنک کر شرف اللہ کے حوالے کر دیے۔ بیگم جمال حسبِ معمول ہدایتیں دینے لگیں:

"اے منجھلی دلہن بی چھوڑو نئے کو۔ وقت ہوا جا رہا ہے، اور ابھی تک کسی نے سہاگ پڑے کی خبر بھی نہیں لی۔" اور وہ خود سہاگ پڑا اپنے سامنے چاندی کی سینی میں سنگوانے لگیں۔

باہر گلی میں ڈولیاں کبھی کی آئی کھڑی تھیں۔ ڈیوڑھی میں سے شرف اللہ کی آواز آرہی تھی؛ "ارے بھئی جلدی کرو۔" بچے بالوں کو سنبھالتی ہوئی بیویاں سوار ہونی شروع ہوگئیں۔

"ارے بی دولہا کی اماں کہاں ہیں؟ انھیں تو بلاؤ!"

بیگم نہال جلدی جلدی نیگ کے روپے کوٹھڑی میں سے نکال کر لال تھیلی میں باندھ رہی تھیں۔ جب ڈھونڈیا پڑی تو نکل کے آئیں۔ ماوا مار کرتے کرتے بھی مغرب کے بعد گھر سے روانگی ہوئی۔

دولہا والیوں نے بلقیس کا منہ مصری سے میٹھا کیا۔ بیگم نہال نے بسم اللہ کر کے پہلے جھومر لگایا پھر سہاگنوں نے مل کر باقی کا زیور بھی دلہن کو پہنا دیا۔ اور ڈومنیاں گلے پھاڑ پھاڑ کے سہاگ گھوڑیاں گاتی رہیں۔ رات کے ساڑھے نو بجے دلہن کے ہاں سے واپسی ہوئی اور ڈولیوں سے قدم ڈیوڑھی میں رکھتے ہی باتوں کے وہی طومار شروع ہوگئے۔ اونچی اونچی آوازیں آنے لگیں اور نئے سمدھیانے پر نکتہ چینیاں ہونے لگیں یا تعریفوں کے پل باندھے جانے لگے۔ ابھی دسترخوان بچھا ہی تھا کہ دلہن کے ہاں سے دولہا کے واسطے مایوں کا سامان آگیا اور بیویاں کھانا چھوڑ چھاڑ ایک ایک چیز ہاتھوں میں لے لے کر دیکھنے لگیں۔ بڑھیاں جن کی بینائی کم تھی مگر دیکھنے کا شوق زیادہ تھا ہر چیز کو آنکھوں کے قریب لا لا کر ٹٹول ٹٹول کر گھور رہی تھیں۔ جب صابن دانی پر نظر پڑی تو ایک بولیں؛

"اوئی بوا یہ کیا بلا ہے؟"

"اے بی ذرا مجھے بھی تو دکھاؤ۔"

"اے ہے کیا ہے بی؟ یہ عمر ہونے آئی میں نے تو کبھی دیکھی نہیں۔"

وحیدہ بیگم نے کہا؛

"خالہ جان، صابن اور صابن دانی ہے۔"

"بوا یہ کیا ہوتی ہے؟ آج ہی نام سنا ہے؟"

"بازار میں ہاتھ منہ دھونے کی ولایتی ٹکیاں بکنے لگی ہیں۔ یہ وہ ہیں۔"

"ہے ہے بی پرے رکھو۔ موئے بد جانور کی چربی ہوگی۔ غارت کرے ان فرنگیوں کو دین دھرم سب اکارت کر دیا۔ ایسے شیطانی کام ہیں کہ شیطان بھی ان کے آگے کان پکڑ لے۔"

"نہیں آپا جان! ہے تو بہت پیاری۔ میں بھی اپنی رشو کے لیے ایسی ہی خریدوں گی۔"

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ان ہی باتوں اور کھانے پینے میں ساڑھے گیارہ بھی بج گئے۔ ابھی تک دلہن والے نشان لے کر نہ آئے تھے اور ڈیڑھ دو سے پہلے آتے ہوئے نظر بھی نہ آتے تھے۔ احمد وزیر، اصغر کو نہلا دھلا کر فارغ ہو چکا تھا اور اس وقت غفور کے پاس بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ احمد وزیر جدی نائی تھا اور اس کی پیڑھیاں میر نہال کی ڈیوڑھی پر گزر گئی تھیں، غفور بھی اپنے جامے میں نہ سماتا تھا۔ شیخ محمد صادق نے رشتہ طے کر لیا تھا اور بہت سارا جہیز دینے کا وعدہ کر کے بھرے پر چڑھا دیا تھا۔

حقہ کا دھواں چھوڑ کر احمد وزیر اپنی چھدری ڈاڑھی کی لمبی نوک کو بل دیتے ہوئے غفور سے بولا:

"کیوں، کب ہو رہی ہے؟ ہم سے نہ چھپا ظالم۔ ہم یار ہیں یاروں کے۔ ایسی چھانٹی چودہ برس کی، خدا کی قسم قسمت کا سکندر نکلا۔ میری گھر والی کہہ رہی تھی بڑی خبصورت ہے۔ یہ سن کے رال تو میری بھی ٹپکنے لگی۔"

غفور مزا لیتے ہوئے کہنے لگا:

"میری جو نیا کا سن کے اپنی بڑھیا یاد آ رہی ہے؟"

"ابے کھوسٹ نہ کہہ۔ دوسری کی ہے۔ ایک کو تو کھا بیٹھا۔ ابھی تو تھوڑی ہے۔ بڑی جان ہے دس ہڈیاں زرجن کھر بچے اور دیدے پر یار اب تو اپنی ہی کمر جواب دے گئی کل رات کو جب میں گھر پہنچا تو سولہ سنگھار کیے بارہ ابرن سے درست چکنی چپڑی جوبن بنائے بیٹھی تھی۔ میں نے جو مکھڑا دیکھا تو رہا نہیں گیا اور میں بولا: "ادا مار ڈالیگی جانی تمہاری تو" ایسا مڑک کے بولی: "آگ لگے جو بیس گھڑی تم یہی باتیں کرتے رہتے ہو۔ ذری اتنا نہ ہوا کہ دو کوڑی کا تیل لے کے کبھی گھر میں گھسو۔ ہمسائی کا میاں روز شام کو گجرے لے کے گھر میں آتا ہے۔ مہک ہماری چھت تک آتی ہے۔ مگر ہمارا مقدر کہاں؟" یہ کہہ کر احمد زبیر ہنسا اور اس کے بدنما دانت نمایاں طور پر زرد نظر آنے لگے: "بس یار میں وہیں کا داؤں سمجھ گیا۔ خدا کی قسم وہیں توڑ کیا۔ پٹ دینا اپنا تہمت سمیٹ دروازے کے باہر۔ مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ جانو مڑا اور فتر کا ہوا۔"

اس پر غفور بولا:

"پھر یار کس دن کام آئیں گے؟ جان توڑی حاضر ہے۔ بچے تیرے ہی کہلائیں گے میں حق نہیں جتاؤں گا۔"

احمد زبیر نے کہا: "جو تڑ تڑا جھٹکا دے گا؟" غفور آنکھ مار کے بڑے فخر سے بولا:

"تو نے ہمارے کس بل دیکھے ہی نہیں یار۔ ہم تو جو کڑی ہکانے والوں میں سے ہیں۔ بھیج کے تو دیکھ۔ انجر پنجر ڈھیلے نہ کر دوں تو بات نہیں۔"

"استاد اپنی اپنی گھوڑی اپنی اپنی ران تلے ٹھیک ہے۔ میں وس کی منہ زوریاں خوب جانتا ہوں۔ جو تو دو دو لے کے چلا اور کہیں ٹکرا گیا اور گاڑی الٹ گئی پیارے تو میں اکیلا جنا ایک وخت میں دو دو کو کیسے سنبھالوں گا؟"

یہ کہہ کر احمد زبیر نے غفور کے کہنی ماری اور دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

* * * *

دلچین بھی خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی۔ نہ وہ ایسا ساٹھے سے اوپر ہو گئی تھی۔ اس کا پوپلا منہ ہر وقت ہنسی سے کھلا رہتا۔ دانت جھڑ گئے تھے اور ستوا سی ناک اور ٹھوڑی میں کوئی فاصلہ نہ رہا تھا۔ اس وقت وہ خوشی سے بے قابو ہوئی جا رہی تھی اور مسرور کے سر پر سے ٹوپی چھین کر اتار لی اور کسی کی اچکن پہن توے کی سیاہی سے مونچھیں بنا پوری مرد بن گئی اور طرح طرح کی نقلیں اتارنے لگی۔ سب اس کی حرکتوں کو دیکھ دیکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے اور بیچ بیچ میں اسے چھیڑتے جاتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد دلچین کولھے مٹکا مٹکا کر ناچنے لگی۔ عجیب عجیب مضحکہ خیز صورتیں بناتی۔ سارے گھر میں ایک ایک کے پاس جاتی اور کمر پر دونوں ہاتھ رکھ بیویوں کو شہدوں کی طرح ایک آنکھ بھینچتی اور دوسری آنکھ مارتی۔ گانے میں اس کی آواز کہیں جاتی اور نظر کہیں ہوتی اور ہاتھ کسی اور طرف اٹھتے۔ آج اس نے بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ مذاقیہ حرکتیں کیں کہ دیکھنے والوں کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ ان کی پسلیاں دکھنے لگیں اور سانس پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ ناچنے گانے کی وحشت ایسی سوار تھی گویا نشے میں ہے اور وہ پاگلوں کی طرح ادھر سے ادھر منہ بناتی تھرکتی اور ناچتی ہوئی جاتی اور آخر میں سب کے ساتھ مل کر خود بھی ہنسنے لگی اور ایسا ہنسی کہ ہنستے ہنستے تھک کر اس کی چندی آنکھوں میں آنسو ابھر کر بہنے لگے۔

* * * * * *

ادھر ڈومنیاں اپنی پوری قوت سے گا رہی تھیں۔ ان کے گلوں کی رگیں پھول پھول کر گل پھکنے کی طرح پھولتیں اور پچکتیں۔ آوازیں مشرق کو جاتیں تو گت مغرب کو۔ ڈھول کی ڈھمک ڈھمیا نے گھر کو آسمان پر اٹھا رکھا تھا۔ نہ کوئی سُر تھا نہ تال۔ اس پر عورتوں کے فلک شگاف قہقہے اور بچوں کی چیخ پکار۔ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ مگر خوشی کا موقع تھا اور شادی پھر شادی کس طرح کہلاتی۔

ڈیڑھ بج چکا تھا۔ دلہن والے نشان لے کر آن پہنچے۔ بیویاں سب ہنسی ٹھٹھا چھوڑ چھاڑ دروازوں کی اوٹ اور چھت پر سے دلہن والوں کو جھانکنے لگیں۔ مرزا شہباز بیگ خود تو نہ آئے تھے، دلہن والوں کی طرف سے بندو، اشفاق اور میر اعجاز حسین اشفاق کے بڑے بھائی آئے تھے۔ میر اعجاز حسین بہت سنجیدہ اور دیندار قسم کے بزرگ تھے۔ ہاتھ میں موٹے موٹے دانوں کی تسبیح کٹا کٹ پھیر رہے تھے۔ وہ بار بار کھنکھارتے اور اٹھتے بیٹھتے وقت بہ آواز بلند یا رسول اللہ کہتے۔

اصغر کو بدّھی اور انگوٹھی پہنانے کے بعد میر اعجاز حسین نے دولہا کو اکیس گیارہ روپیہ سلامی دی۔ پھر بندو نے اصغر کے منہ میں پان اور مصری کی ڈلیاں رکھنی شروع کیں۔ ایک پان منہ میں نہ جاتا کہ وہ دوسرا منہ میں رکھ دیتا۔ اس رسم میں میر اعجاز حسین کا بیٹا چنو اور دوسرے نوجوان بھی شامل تھے۔ اصغر چپکے چپکے پان اور مصری رومال میں چھپا لیتا۔ جب اس مذاق کو بہت دیر ہو گئی اور اصغر والوں کی طرف سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا تو حبیب الدین نے چپکے سے شرف اللہ کے کان میں کہا:

"تم لوگ خاموش کیوں بیٹھے ہو؟ دلہن والے آسانی سے بچ کے نکل جائیں۔"

جب دلہن والوں کے لیے شربت آیا اور میر اعجاز حسین ختم کر چکے تو منہ پچھائی شروع ہوئی، شرف اللہ نے اٹھ کر ان کا منہ زور زور سے پونچھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر تو وہ چپ رہے کہ وہ رسم پوری کر کے چھوڑ دیں گے مگر شرف اللہ شد و مد سے پونچھنے لگے۔ میر اعجاز حسین ایک دو دفعہ زور سے کھنکھارے اور اپنے کو چھڑانے کی کوشش کی، مگر شرف اللہ کہاں سننے والے تھے۔ میر اعجاز کا سر ایک ہاتھ سے پکڑ اپنی پوری طاقت سے ان کے ہونٹ رگڑنے لگے۔ میر صاحب کی ڈاڑھی بکھر گئی۔ تسبیح ہاتھ سے چھوٹ کر الگ گر ی اور ٹوپی اتر کر دور جا پڑی۔ میر اعجاز معذوری سے اپنے کو چھڑانے کی

کوشش کر رہے تھے اور گھٹی ہوئی آواز میں چلائے: "یا رسول اللہ حق اللہ!"

لیکن کشتم کشتا میں ان کے ہونٹ اور جھل گئے۔ یہ منظر کچھ ایسا عجیب تھا کہ سب قہقہہ لگانے لگے۔ باپ کی یہ درگت بنتے ہوئے دیکھ کر چنو کا پارہ گرم ہو گیا اور دلہن والے سمجھے کہ یہ ان کی توہین ہو رہی ہے۔ حبیب الدین کو خیال آیا کہ مذاق حد سے بڑھ گیا ہے اور کہنے لگے:

"چھوڑو شرف اللہ اتنا مذاق اچھا نہیں کوئی تمہاری عمر کے ہیں؟"

شرف اللہ نے ان کو چھوڑ دیا اور میر اعجاز حسین یا رسول اللہ کہتے ہوئے اٹھ بیٹھے اور اپنی تسبیح اور ٹوپی اٹھانے لگے۔ ان کے ہونٹ چھل گئے تھے اور ان کی آنکھوں میں تکلیف، غصّے اور خفت سے آنسو آ گئے۔

بھائی کی یہ حالت دیکھ کر اشفاق غصّے سے بولے:

"واہ جناب یہ بھی کوئی شرافت ہے؟ آپ ہیں کس ہوا میں۔ میرے خسر آپ سب کو خرید سکتے ہیں۔"

اس پر شمس کو بھی تاؤ آ گیا اور بگڑ کر کہنے لگے:

"آپ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں؟ دولت کا گھمنڈ کسی اور کو دکھائیے گا۔ ہم دولت کو ٹھوکروں میں اُڑاتے ہیں۔ ہوں گے رئیس تو اپنے گھر کے۔"

اصغر دل ہی دل میں کٹا جا رہا تھا۔ بلقیس کی وجہ سے دلہن والوں کی ذلت کا خیال اذیت دہ تھا لیکن خون کے جوش سے اپنوں کی طرفداری کا جذبہ تھا۔ ان کو بھی اوچھے جملے کہنے کا کوئی حق نہ تھا۔ لیکن حبیب الدین عقلمند تھے اور انھوں نے معاملہ کو آگے نہ بڑھنے دیا۔

جب دلہن والے رخصت ہو گئے تو اصغر کو مایوں بٹھایا گیا۔ دالان مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہنڈوں کی روشنی میں عورتوں کے کپڑے سورج کی

کرنوں کی طرح چمک رہے تھے۔ غل غپاڑے میں کچھ سنائی نہ دیتا تھا جب میر نہال نے پہلی پینڈی اصغر کے ہاتھوں میں رکھی تو خوشی سے ان کا چہرہ چمک اٹھا، لبوں پر آئی ہوئی مسکراہٹ کو روکنا چاہا لیکن ان کے ہونٹ نیم وا ہو ہی گئے۔ شادی کے ہنگاموں کا اثر لازمی تھا اور وہ بھی اس سے بری نہ رہ سکے۔ عورتوں کے چہرے فرطِ مسرت سے دمک رہے تھے۔ آخر کیسے جان لیوا مرحلوں سے گزر کر تو یہ بیاہ ہو رہا تھا۔ بیٹے کا منہ میٹھا کر کے میر نہال بیٹھک میں چلے گئے تاکہ اور سب لطف اندوز ہو سکیں۔

پھر کیا تھا سب لڑکیاں بالیاں مل کر اصغر کو پینڈیوں کے ٹکڑے کھلانے لگیں کہ دولہا دلہن میں ہمیشہ بنی رہے۔ اصغر سردی سے سکڑ رہا تھا، لیکن اس کا چہرہ کھلا پڑتا تھا۔ اس کی شادی اس ہی لڑکی سے تو ہو رہی تھی جس سے اُس کو والہانہ محبت تھی۔ ساری لڑکیاں اس کے منہ میں زبردستی پینڈیوں کے ڈلے ٹھونس ٹھونس کر سو روپیے نیگ کے مانگنے لگیں اور اصغر دینے سے انکار کرتا رہا۔ میر نصیر الدین کی بیٹی ثریا نے پوری پاؤ بھر کی پینڈی اس کے منہ کی طرف بڑھا کے اپنی بے سُری اور تیز آواز سے چیخ کر کہا:

" اچھا اگر اس کو ایک دفعہ میں کھالیں تو ہم دس روپیے چھوڑ دیں گے "

اصغر بولا:

" کیا رکھوا کر بھول گئی ہو؟ بس پچاس سے زیادہ نہیں ملیں گے "

سب ایک زبان ہو کر بولیں:

" پورے سَو لیں گے "

مہرو بھی کہنے لگی:

" آج تو کنجوسی نہ کیجیئے۔ چاند سی دلہن کیا مفت مل جائے گی؟ "

سب نے مل کر اصغر کا ناطقہ بند کر دیا۔ اتنے میں جمال بیگم کی آواز آئی:

"اُوئی لڑکیوں فقیروں کی طرح للک للک کے ہاتھ دھو کر بچے کے پیچھے پڑ گئیں۔ چلو ہٹو۔"

مگر وہ بھی ضد کیے اڑی رہیں اور اصغر نے کچھ روپے دے کر اپنا پیچھا چھڑایا پھر خالہ پھوپیوں نے اصغر کے ہاتھوں میں چاندی کے روپے اور اشرفیاں رکھنی شروع کیں۔ دلہن نے بھی چٹ چٹ بلائیں لے کر مٹھی میں چھپائے ہوئے روپے اصغر کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

اتنے میں اُبٹنے کی دھما چوکڑی شروع ہو گئی اور وہ طوفان بے تمیزی ہوا کہ نہ پوچھو جس کے ہاتھ جو لگا اُبٹنے میں سن گیا۔ جیسے ہی بے خیالی میں کوئی لڑکا کسی لڑکی کے منہ پر ٹھنڈا ابٹنا مل دیتا وہ جھلاتی ہوئی بدلہ لینے اس کے پیچھے دوڑتی۔ پھر تو لڑکے لڑکیوں کے پیچھے اور لڑکیاں لڑکوں کے تعاقب میں اس طرح دوڑنے لگیں کہ سارا گھر اوئی اللہ اور چیخ پکار سے گونج اٹھا۔

"خدا کے لیے چھوڑ دیجئے۔ تو بہ ہے سارے کپڑے ستیاناس کر دیئے۔"

"کیا ہوا بدل لینا زیادہ پیاری لگو گی۔"

"ہائے میرے اللہ۔ آخر آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ چھوڑیے نا مجھے۔ اتنی سردی ہے۔" اور وہ اپنے کو چھڑانے کے لیے ہاتھ پیر مارتی مگر ابٹنا ملنے والا کہیں باز آتا ہے؟ اور لڑکی بیچاری چیخنے چلانے کے باوجود کسمسا کر رہ جاتی اور لڑکا ابٹنا گردن اور منہ اور پیٹھ پر دل کھول کے مل دیتا۔ لڑکی کو مزہ تو ضرور آتا لیکن جھوٹ موٹ ہائے واویلا کرتی رہتی ....

جوانوں کو دیکھ کر بوڑھیاں بھی ترنگ میں آ گئیں اور ابٹنا کھیلنے لگیں ــــ جمال بیگم ابٹنا لے بیگم نہال کی طرف لپکیں:

" اے بھابی تو تمہیں بھی ہل ہلا سوجھا ہے؟ بوڑھی گھوڑی لال لگام۔ سینگ کٹا کر بچھڑوں میں مل گئیں۔ اے بی بس مجھے تو بخشو۔"

"کیوں کیا بڈھوں کے دل نہیں ہوتے؟ بیٹے کی شادی روز روز تھوڑی ہوتی ہے؟"۔

جمال بیگم نے یہ کہہ کر بیگم نہال کے ابٹنا مل ہی دیا۔ مردانے میں بھی یہی بھاگ دوڑ اور آنکھ مچولی ہو رہی تھی۔ لڑکوں نے لڑکیوں کے گال مسل مسل کر لال کر دیے، لڑکیوں نے بھی خوب مُکّے بھرے۔ کسی نے کاٹا، کسی نے دھپا رسید کیے۔ بال بکھر گئے، کپڑے بکس گئے اور دوپٹّے ڈھلک کر سینوں سے نیچے آگئے ایسے موقعے بار بار نہیں آتے۔

۲

نکاح والے روز صبح احمد وزیر نے اصغر کو نہلا دھلا کر تیار کیا اور دلہن کے ہاں سے آیا ہوا جوڑا پہنایا۔ پھر حبیب الدین نے سہرا اور سر پر پیچ باندھ کر دولہا بنایا۔ کمر میں پٹکا کسا۔ زربفت کی شیروانی اور بنارسی سیلے میں اصغر بہت حسین نظر آ رہا تھا۔ جذبات کی فراوانی اور فرطِ خوشی سے اس کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح تر و تازہ اور شگفتہ ہو گیا تھا۔

برات چڑھنے کا وقت تھا تو دس بجے لیکن مارا مار کرتے کرتے بھی ساڑھے گیارہ بج گئے۔ جب کہیں خدا خدا کر کے برات چلی۔ گھوڑے پر نسیم شہ بالا بن کے بیٹھا۔ اور باقی ڈھائی تین سو براتی ساتھ ہو لیے۔ آگے آگے نفیری اور شہنائیاں بجتی جا رہی تھیں اور دولہا سُرخ ریشمی رومال سے منہ چھپا کے بیٹھا تھا۔

جب برات دلہن کے مکان پر پہنچی اور جیسے ہی دولہا گھوڑے سے اترا تو ایک طرف سے جنّو اور دوسری طرف سے شرف اللہ جھپٹے کہ دیکھیں کون گھوڑے پر پہلے بیٹھتا ہے۔ دونوں نے ایک ایک پاؤں رکاب میں ڈال لیا،

اور دوسرا کاٹھی پر لے جانے کو بیک وقت ساتھ اٹھایا تو بیر زین پر پہنچنے کے بجائے ہوا میں ایک دوسرے سے ٹکرا کر رہ گئے۔ گھوڑا اس معرکہ سے بدک گیا اور دونوں کو گھسیٹتا ہوا لے چلا۔ وہ تو سائیس ہوشیار تھا گھوڑے کو فوراً قابو میں کر لیا۔ دونوں فریقین کے لوگ ایک دوسرے کو بڑھاوے چڑھاوے دینے لگے اتفاق سے چنو بائیں طرف تھا اور دوبارہ جب دونوں اچک کر پھر زین پر بیٹھے ہیں تو چنو آگے اور شرف النساء ان کے پیچھے گھوڑے پر سوار ہوئے۔ دلہن والوں نے بڑے فخر وافتخار سے ٹھینگا دکھا کر کہا ابس ہار گئے۔ دولہا میاں غلام بنے رہیں گے۔ لیکن دولہا والے کہہ رہے تھے کہ دولہن گھوڑے پر ساتھ بیٹھے ہیں آگے پیچھے سے کیا ہوتا ہے لہٰذا پلہ برابر رہے گا۔

آخوند جی نے جو فرشتہ صفت اور ایک عالم وفاضل بزرگ تھے نکاح کے ایجاب وقبول کروائے۔ اور جب انہوں نے اُن سے پوچھا کہ بلقیس جہاں بیگم بنت مرزا شہباز بیگ عمر اٹھارہ سال چار ماہ بعوض مہر پچاس ہزار سکہ رائج الوقت موجل تم کو قبول ہے تو ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ سینے میں ایکا ایکی دھک دھک کرنے لگا۔ اور اس نے دل کی ان ہی بے شمار دھڑکنوں میں بلقیس کو اپنی منکوحہ قبول کر لیا۔ مگر اس نئے بندھن اور زندگی کے اہم ترین فیصلہ کے بعد جہاں سے اس کی زندگی حیات کے نئے رخ پر مڑ رہی تھی ایک عجیب اور بالکل انوکھا غم اس کے دل کو ملنے لگا۔ وہ اس کیفیت سے اس قدر ناآشنا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ درحقیقت یہ وقت اس کے لیے خوشی کا باعث ہے یا رنج کا۔

اجازت دیتے وقت مرزا شہباز کی آنکھیں نمناک ہو گئیں اور یہ خیال آتے ہی وہ رو دیے کہ آج ان کی عزیز بیٹی پرائی ہو گئی۔ لیکن مبارک سلامت کے غلغلے میں داماد اور خسر دونوں اپنی اپنی کیفیتوں کو بھول گئے۔

چھوارے لٹائے گئے، ہار پھول اور پان بٹے۔ ابھی شہدے اور بھانڈ انعام واکرام کے لیے چلّا رہے تھے "الٰہی دولہا ست پوتا ہو۔ ایک سے اکہتّر ہوں" کہ مہمان اُٹھنے لگے اور پھاٹک سے نکلتے ہوئے ہر ایک کو لال رومال میں بندھی ہوئی تانبے کی چیتی ہوئی طشتریوں میں گوٹا اور مٹھائی پیش کی گئی اور وہ بن بلائے مہمان جو اپنے ساتھ کئی کئی بچے لے کر آئے تھے کئی کئی حصے سمیٹ کر خوش وخرم چلے گئے۔ کچھ ابھی تک جوتیاں تلاش کر رہے تھے۔ اس ہڑبونگ میں شرف اللہ کی جوتی بھی کسی نے پار کر دی تھی لہٰذا انھوں نے اپنے والے سے بہتر کسی اور کا جوتے کا جوڑا تاک کر ہتھیا لیا۔

ادھر اصغر کو اس کے یار دوستوں نے گھیر لیا اور سہرے پر سہرے پڑھے جانے لگے جن میں دولہا اگر آفتاب تھا تو دلہن مہتاب، سائل صاحب بھی سہرا کہہ کر لائے تھے اور اپنے پڑھنے کی طرز اور انداز بیان پر داد پر داد لیتے تھے۔

محفل طرب و انبساط تھی۔ ہر بندہ و بشر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وقت کا بھلا کس کو دھیان رہتا۔ اور عصر کا وقت ہوتا جا رہا تھا۔ جب بہت دیر ہو گئی تو حبیب الدین نے اشفاق سے اصرار کیا کہ جلدی رخصتی کرا دو۔

اور آخر کار زنان خانے میں اصغر کو آرسی مصحف کے واسطے بلایا گیا۔

ڈیوڑھی ہی میں بہنوں نے سر پر دوپٹے ڈالے اور آنچل کی چھاؤں میں اسے لے کر چلیں، "دولھا اندر آتا ہے" کی آواز سنتے ہی محرم اور نامحرم کیا بوڑھی کیا جوان سب ہی دولہا کو دیکھنے کے اشتیاق میں گدگد کرتی دالان میں سمٹ آئیں۔ کہیں پازیب اور چوڑیوں کی چھم چھم تھی کہیں جھانجن اور چھاگل کی جھنک۔ کاسنی اور بسنتی، آتشی، سرخ اور عباسی رنگ کے طول طویل پاجاموں کے پائینچے سنبھالتی جن کی کلی کلی پر گوکھرو،

پوتھ اور سلمہ ستارے ٹکے ہوئے تھے اور حسن کے بوجھ سے پہننے والیوں کی کمریں لچکتی اور بل کھاتی تھیں، بادلے کے فالسئی اور اگرئی دوپٹے جو ٹھپے اور پمک کے آنچل پتّو کے وزن سے چلنے میں سر اور سینوں پر سے بار بار پھسلے جا رہے تھے۔ ان خوش تنوں کے چمپئی اور صندلی گداز بدن آب رواں، جالی اور گلشن کی باریک باریک کسی ہوئی انگیوں اور چپسی ہوئی کرتیوں کی اوٹ جھلکتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ان پر گنگا جمنی لباسوں کی جگمگاہٹ اور جڑاؤ جھومر ٹیکے کی جھل بل کا عکس پڑتا جس سے تر و تازہ گالوں کی تابش اور بڑھ جاتی۔ گول گول بازوؤں پر نونگے اور جوشن دمکتے جن کو دیکھ کر ستاروں کا گمان ہوتا۔ موتیوں کی مالا، ست لڑے اور چندن ہار بلوری گردنوں کو اور آبدار بنا رہے تھے اور حسن و صباحت کے ان مرقعوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ پریاں قوس و قزح کے پُر فریب رنگ اور آفتاب کی جھمکتی ہوئی کرنیں ہمراہ لے کر زمین پر اتر آئی ہیں۔ سب نے مل کر دولہا کو چاروں طرف سے اس طرح نرغے میں لیا کہ سانسوں کی گرمی اور معطر جسموں کی حرارت سے دسمبر کے جاڑے میں پسینے آ گئے۔

ستاروں کا سمٹا ہوا یہ حسین جھرمٹ قدم بہ قدم دالان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پیروں کی جنبش سے گھنگھرو بولتے اور پازیب ٹھنکتی۔ بل اور توڑے سونا اور چاندی ایک دوسرے سے ٹکرا کر سُر بکھیرتے۔ عطر موتیا اور عنبر کی تیز اور مست خوشبو نے ہوا کو بھاری اور فسوں ساز بنا دیا تھا اور اس کے ساتھ ڈومنیاں لہک لہک کر گا رہی تھیں اور پوری فضا شادی کے گیتوں سے گونج رہی تھی۔

میّا پیارا بنڑا آیا ری
بڑی دوری سے بنڑا بلایا ری

خراماں خراماں دولھا دالان تک پہنچا اور مسند پہ بٹھایا گیا اتنے میں ڈومنیوں نے نئی چیز گانی شروع کر دی:

نور کے تنبو تلے لا کے بٹھایا ری بنا
چل کے دیکھو ری سکھی سب سے سوایا ری بنا
سیج مخمل کی بچھی تکیے مشجر کے لگے
چل کے دیکھو ری سکھی

بیگم نہال نے بیٹے کی بلائیں لیں۔ ان کی پیشانی کے تینوں بل خوشی اور مسکراہٹ سے دب گئے رکھے اور اصغر دلہن کے انتظار میں بیٹھا رہا۔

اور جب بلبتیس سرخ جوڑے اور دوپٹے میں دلہن بنی پھولوں کے گہنے اور سہرے سے لدی سہاگ عطر میں بسی بسائی دولہا کے مقابل لا کر بٹھائی گئی ہے تو ڈھولک کی تھاپ پر بڑے سہانے بول لہریں لے رہے تھے:

لال جوڑے والی بنو میں نے پائی
اس ری بنو کو جھومر سوہے
ہیرے موتی والی بنو میں نے پائی

اسی اثنا میں دولہا دلہن پر کار چوبی دوپٹہ ڈال دیا گیا اور آرسی مصحف کی چشمک شروع ہو گئی۔

میراسن نے آگے بڑھ کر کہا: "میں صدقے گئی میرے سرکار۔ کہیے بیوی آنکھیں کھولو میں تمہارا غلام ہوں۔"

اصغر نے کہا:

"آنکھیں کھولو میں تمہارا گلاب ہوں۔"

میراسن بولی:

"نہیں میاں دلہن بیگم آنکھیں نہیں کھولیں گی، اللہ رکھے جب تک غلام نہیں کہیں گے۔ اے سرکار کہیے غلام ہوں۔"

دوپٹہ تن جانے سے اندرا اندھیرا ہو گیا تھا اور آئینہ میں صورت صاف نظر نہ آتی تھی۔ اور اصغر اس رخِ زیبا کو دوبارہ دیکھنے کے لیے بیتاب تھا جس کے تصور میں اُس نے دکھ درد اٹھائے تھے جس صورت کا وہ دیوانہ وار عاشق تھا۔ لیکن بلقیس نے شرم و حیا کے سبب اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا رکھا تھا۔

میراسن پھر بولی۔

"اے میاں کیا کر رہے ہیں۔ دیکھ لیا منہ ؟"

"ارے دیکھوں کہاں سے۔ وہ گھونگھٹ ہی نہیں کھولتیں۔"

"ارے واہ سرکار وہ کیوں کھولیں ہیں واری گئی اپنی بنو پر سے بسم اللہ کر کے خود گھونگھٹ اٹھائیے۔ قل پڑھ کر دلہن کی مانگ میں سروج بھریئے۔"

اور اس وقت سب میراسنیں اپنے کانوں پر ایک ہاتھ رکھ رکھ کر اس قوت اور زور شور سے خوش ہو کر اور جذبے سے لے کر گا رہی تھیں جیسے ان ہی کی شادی ہو رہی تھی اور شادی کے سارے لطف و نشاط دراصل انہی کے تھے۔

میری ہریالی گھونگھٹ کھول سدا متوالی گھونگھٹ کھول

ترے گھونگھٹ میں چندا برا جے

سونے کی ڈنڈی روپے کے پلڑے

تو بیٹھی ہے جوبن تول اتاں پیاری گھونگھٹ کھول

اصغر نے گھونگھٹ الٹ دیا اور دلہن کی مانگ میں صندل لگا دیا۔ بلقیس نے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی لمبی لمبی گھن دار پلکیں جو مٹی سے اور چمکیلی ہو گئی تھیں، دھیرے دھیرے اوپر اٹھائیں اور اپنی بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں کھول دیں اور اصغر کو شرما کر دیکھا۔ نگاہوں کے تصادم کے ساتھ ایک شرارہ دونوں کے دلوں میں بیک وقت چمکا اور اصغر کے مرتعش دل میں جذبات کی شورشوں نے بے قرار آرزوؤں کا طوفان

بپا کر دیا۔ بلقیس کے احساسوں نے پہلی انگڑائی لی اور اچانک جاگ اُٹھے۔ اس نے مجوب ہو کر اپنی آنکھیں پھر بند کر لیں اور اصغر اس ساعت کا منتظر تھا جب بلقیس اس کی جانِ تمنا بن کر اس کی پرشوق آغوش میں ہوگی اور ہمیشہ اسی کی رہے گی حتیٰ کہ موت کے سوا کوئی ان کو جدا نہ کر سکے گا۔

تین بج چکے تھے اور وحیدہ بیگم نے شہباز بیگم سے وداع کی اجازت چاہی خوشی کے نغمے ختم ہوئے اور منڈھا گایا جانے لگا:

پربت بانس منگا مورے بابل
ہرے ہرے بانس کٹا مورے بابل
نیکا منڈھا چھوا اورے بابل

شہباز بیگم دھاروں دھار رونے لگیں۔ حالانکہ وہ بلا وجہ غم کا رونا رونے والوں میں نہ تھیں۔ لیکن بیٹی کی رخصتی ایک غم انگیز واقعہ ہوتی ہے۔ بہنیں، بھاوجیں بلکہ محلہ والیاں بھی اس وقت آنسوؤں دریا بہا رہی تھیں۔ عورت کی حقیقت ہی کیا؟ وہ اسی دن کو پیدا ہوتی ہے کہ ماں باپ پال پوس کر پروان چڑھائیں اور جوان ہوتے ہی پرائے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دیدیں اور وہ دوسروں کی ہو جائے۔ ان غیر لوگوں کی جن کو اس نے کبھی دیکھا تھا نہ بھالا جن سے اس کو نہ محبت تھی نہ الفت۔ آج جب اس کی بہاریں دیکھنے کے دن آئے اور وہ اس قابل ہوئی کہ ماں باپ کے دکھ درد میں شریک ہو، جب ان کی خوشیوں میں خوش اور ان کی زندگی میں شامل ہو کر ہاتھ بٹائے تو وہ غیروں کے حوالے کر دی جاتی ہے۔ اب وہ ان ہی کی کہلائے گی اور ان کے متعلقین وہ بن جائیں گے۔

ہم تو بابل ترے بیلے کی کلیاں گھر گھر مانگی جائیں رے
ہم تو بابل ترے جھانپے کی چڑیاں شام پڑی اڑ جائیں رے

ہم تو بابل ترے کھونٹے کی گیاں جدھر باندھیں بندھ جائیں رے
کاہے کو بیاہی بدیس رے سکھی بابل مورے

اور یہ سارے جذبات تھے جو دلہن کے عزیز و اقارب پر غم و یاس کے بادل بن کر چھا گئے اور منڈھے کی پُرسوز لے اور مغموم بول سننے والوں کے دلوں کو چھیڑ چھیڑ کر اثر کر رہے تھے۔ اور اس وقت ان کے دل گداز ہو کے رنج و الم سے لبالب تھے۔ دولہا والوں میں سے بھی بہت سے پُرنم ہو گئے۔ یہاں تک کہ وحیدہ بیگم جن کو بھائی کی شادی کی سب سے زیادہ خوشی تھی، وہ بھی اس گھڑی خوشی اور رنج میں امتیاز نہ کر سکیں اور دو آنسو ان کی آنکھوں سے فرار ہو کر رخساروں پر بہہ کر آ گئے۔ چنبیلی در سے لگی ایک کونے میں کھڑی ٹسر ٹسر زار و قطار رو کر دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھتی جاتی تھی۔

بھیا کو دینی محل دو محلے ہم کو دیا پردیس رے
گڑیا کھلونے میں نے طاق میں چھوڑے
چھوڑا سہیلیوں کا ساتھ رے سکھی بابل مورے

مرزا شہباز بیگ اور بُندو بھی رخصت کرنے اندر آ گئے۔ ان کے چہرے آزردہ تھے اور ان آنسوؤں نے جو خشک ہو چکے تھے ان کے گال ملگجے کر دیے تھے۔ ان کی بیٹی اس وقت رخصت ہو رہی تھی اور اس کا بندھن کسی اور سے بندھ چکا تھا۔ وہ ان کی بندھی تھی۔ اب یہ اس کے شوہر کی رضا و رضا پر منحصر تھا کہ وہ چاہے تو بلقیس کو اپنوں سے ملنے دے یا نہ ملنے دے وہ بھی احتجاج بھی نہ کر سکتے تھے۔ لیکن خدا کی مرضی یہی تھی اور دنیا کی یہی ریت، یہی فطرت کے تقاضے اور کارِ قدرت بھی یہی۔ اسی ڈھنگ سے ان کے باپ دادا بھی دوسروں کی بیٹیاں لے کر آئے تھے اور وہ خود بھی اسی بات پر قائم تھے اور ان کی اولاد بھی اسی طرح پرائی لڑکیوں کو اپنا کرتی رہے گی۔

مگر حقیقت تلخ ہے اور جدائی اذیت سے خالی نہیں۔ اٹھارہ برس وہ ان کے ساتھ رہی تھی، وہ حسین و لطیف اٹھارہ سال، پیار و محبت سے لبریز زمانہ اور آج وہ ان سے وداع ہو رہی تھی، باپ نے بیٹی کے سر پہ ہاتھ پھیرا، کچھ نصیحتیں کیں کچھ دعائیں دیں پھر وہ باہر چلے گئے۔ منڈھے کے بول زیادہ پُردرد تھے؛

امبوا تلے سے نکلا جو ڈولا
کوئل سبد سناؤ رے
تو کیا روئے میری کالی کوئلیا
چھوڑا ہم نے بابل کا دیس رے

وقت گزر رہا تھا اور اصغر دلہن کو لے جانے کا منتظر کھڑا تھا، وداع کی گھڑی نے اس کو بھی اداس کر دیا تھا۔ اس کے اردگرد سب عورتیں اشکبار تھیں اور بلقیس بھی گھونگھٹ میں سسکیاں بھر رہی تھی۔

اصغر نے جیسے ہی جھک کر اس کو گود میں اٹھایا تو اس کے قرب اور لمس سے دل ایکا ایکی اُچھلا اور پُر لذت خواہشیں مچلنے لگیں، لیکن یہ مسرت کیسی تھی جس میں کہیں غم بھی جھلک رہا تھا۔ کبھی کبھی رنج اور خوشی کے فاصلے مٹ جاتے ہیں اور ان کی حدود اس طرح ختم ہو جاتی ہیں کہ ان میں فرق کرنا مشکل ہوتا ہے۔

جب اصغر اپنے معطر اور عزیز بوجھ کو لے کر نیلے نیلے آسمان کے نیچے آیا تو ایک سفید بادل کا ٹکڑا امنگ کی طرح پھیل گیا، فطرت اور فضا بھی اصغر کی خوشیوں میں شامل ہو کر عشق و محبت کی خوش طالعی پر مسرور نظر آنے لگیں۔ منڈھا ابھی تک گایا جا رہا تھا:

سونا بھی دینا روپا بھی دینا
ایک نہ دینی سر کی کنگھی

ساس نند بولیں بول رے
کاہے بیاہی بدیس

اصغر کے کانوں میں منڈھے کی بازگشت گونج رہی تھی۔ تاشے باجے بجتے رہے۔ مست تانیں ہوا میں ابھرتی رہیں۔ ہنسی مذاق ٹھٹھے ٹھٹھول کے ساتھ برات گلی کوچوں میں سے ہوتی ہوئی میر نہال کے گھر پر آ پہنچی۔

دلہین نے دلہن کے پاؤں دودھ سے دھلائے۔ بیگم نہال نے بہو کو چاندی کے چٹکی چھلے پہنائے اور اصغر نے گود میں اٹھا کر دہلیز پار کرائی۔ بہنوں نے بار روکی ہینگ وصول کر لیا تب کہیں اندر لے جا کر دلہن کو مسند پر آرام سے بٹھایا۔

کھیر چٹائی اور دولہا کو ڈھکانے کی رسم کے بعد سب کی خواہش پر وحیدہ بیگم بہت فخر سے دلہن کا منہ اٹھا اٹھا کر رونمائی کرنے لگیں۔ بلقیس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ شرم سے گردن جھکائے بالکل دوہری ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کے خوبصورت سیاہ بال موتیوں کے جھوم میں سے جھلک رہے تھے ماتھے پر افشاں چنی ہوئی تھی۔ لال چنی پڑی ہوئی ہنتہ اور ہونٹوں پر جمی ہوئی مسی کی باریک تہ نے اس کے حسن اور ملاحت کو دوبالا کر دیا تھا۔ رشک سے لوگ بار بار دیکھتے آنکھیں حسن کو دادِ حسن دیتی ہوئی پھسل جاتیں اور پھر اسی موہنی صورت پر آکر ٹھہر جاتیں۔

اصغر کو شمس اور سعید حسن نے گھیر کے بٹھا لیا اور اس کو صنفِ لطیف کے متعلق ساری معلومات بہم پہنچانے لگے۔ جنس کے اسرار اس کی لذتیں بڑے چسکے لیکر بتاتیں۔ اصغر جھینپا ہوا ہنس ہنس کر سب کی باتیں سنتا رہا۔

جب رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تو ہر ایک تھکن سے بے حال ہو کر غافل سو رہا۔۔۔۔ آسمان پر لاکھوں ستارے چمک رہے تھے۔ آج ان کی جگمگاہٹ میں شوخی بھی تھی اور بےتابی بھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جذبات کو اکسا رہی تھی اور اصغر

شوق سے مجبور اور وارفتہ ہوکر دبے پاؤں شبِ عروسی کے کمرے میں چلا گیا۔

؂ ؂ ؂ ؂

اگلے روز دلہن کے میکے جانے کے بعد شادی کے ہنگامے اسی طرح برقرار رہے۔ حبیب الدین نے شمس کو بازار بھیجکر رنگ گلال اور عبیر منگوا کے دیگوں میں رنگ گھلوا دیا۔ پھر کیا تھا پچکاریاں بھر بھر کے ایک دوسرے پر رنگ پھینکنے لگے جو چھپنے یا رنگ سے بچنے کی کوشش کرتا اس کی شامت زیادہ آتی۔ حبیب الدین، سعید حسن کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑا رہے تھے لیکن سعید حسن اس وقت خواجہ اشرف علی کے مکان میں جو مہمان ٹھیرانے کو مانگ لیا تھا بیٹھے نظر الحسن کو شادی کرنے کی ترغیب دلا رہے تھے۔ نظر الحسن اصغر سے دو چار سال بڑے تھے اور ملازمت بھی معقول اور پکی تھی۔ مگر تھے ابھی تک کنوارے۔ چنانچہ سعید حسن کہہ رہے تھے:

"میاں جاڑے کی چاندنی اور غریب کی جوانی کس نے دیکھی ہے؟ یہ عمر اور یہ جوانی یوں نہ گنواؤ۔ مہینہ بھی سہالک کا ہے۔ سُو سُو کرتے جو جاڑے میں سکڑتے پھرتے ہو تو بھیا سردی جائے روئی سے یا دُوئی سے۔"

لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ نظر الحسن پند و نصائح کا خاک بھی اثر نہیں قبول کر رہے بلکہ چکنا گھڑا بنے بیٹھے ہیں تو اپنی عادت سے مجبور ہو کر انھیں قصہ سنا کر قائل کرنے لگے:

"کہتے ہیں کسی گاؤں میں ایک لکڑہارا رہا کرتا تھا۔ اس کی ایک ہی بیٹی تھی ایک روز دونوں باپ بیٹی قریب کے جنگل میں لکڑیاں چننے گئے۔ وہاں پہاڑی کے دامن میں ایک غار تھا جس میں لال لال پتھر پڑے ہوئے تھے۔ لڑکی نے ان کو دیکھا تو ایک دم چیخی:

"ابا ابا، لعل" لکڑہارا بولا "پگلی ہوئی ہے یہ لال رنگ کے پتھر ہیں، لعل

کہاں ؟

"اب اسی گاؤں میں ایک بنیا بھی تھا۔ ایک روز اتفاق سے اُس کا گزر بھی اس جنگل میں ہوا اور اُس نے پہاڑی کے دامن میں پڑے ہوئے لال لال پتھر دیکھے، وہ دو پتھر اٹھالایا اور تھیلی میں باندھ کر شگون کے لیے اپنی دوکان میں لٹکا دیے۔ ایک دن جو لکڑہارا اور اس کی بیٹی بنیے کی دوکان پہ نون تیل لینے آئے جیسے ہی لڑکی کی نگاہ ان پتھروں پر پڑی وہ پھر چیخی "ابا ابا لعل"۔ اب جو بنیے نے پتھروں کو غور سے دیکھا تو واقعی وہ سچ مچ لعل ہی تھے۔ بنیے نے لڑکی سے پوچھا "اری تو نے ایسے پتھر اور کہیں دیکھے ہیں؟"

وہ بولی:

"ہاں ہاں۔ پہاڑی کے غار میں۔"

یہ سنتے ہی بنیے نے لکڑہارے سے کہا:

"اس لڑکی کی شادی مجھ سے کر دے۔"

معلوم ہے کیوں؟ بنیا گدھا تو نہ تھا۔ عورت لکشمی ہوتی ہے اور اُس نے سوچا یہ لڑکی جہاں جاتی ہے اسے لعل ہی لعل نظر آتے ہیں۔ تو دوست مقدّر عورت کا ہوتا ہے سب دلدّر دور ہو جاتے ہیں۔"

وہ ابھی بات پوری بھی کرنے نہ پائے تھے کہ حبیب الدین ان کو ڈھونڈتے ہوئے آپہنچے اور پیچھے سے پوری رنگ کی بھری بالٹی الٹ دی۔ سعید حسن براقروختہ ہو کر مڑے لیکن جب دیکھا کہ مذاق حبیب الدین نے کیا ہے تو ہنس کر بدلہ لینے ان کے پیچھے لپکے۔ اتنے میں رنگ کھیلنے والوں کی ساری ٹولی آگئی اور ایک دوسرے کو جوڑا کر دیا۔ کسی کو جو سوجھی تو اس نے صحن کے حوض میں بھی رنگ گھول دیا اور چھپا چھپ ایک ایک کو غوطے دینے لگے۔ دو چار اصغر کو پکڑ دھکڑ کے اٹھا لائے اور پورے قد سے حوض میں پھینک دیا۔ وہ چُن چُن کے سب کو ڈبکیاں دے رہے تھے۔

لیکن شرف اللہ کا کہیں پتا نہ تھا۔ ایک دو اُن کی تلاش میں نکلے۔ آخر شمس نے اُن کو ڈھونڈ نکالا۔ بیچارے کئی دن کی تھکن اور جگائی کے بعد چھتے میں پڑے خرّاٹے لے رہے تھے۔ بجائے جگانے کے سب نے ان کو مع چارپائی کے کندھوں پر اُٹھا لیا اور خواجہ اشرف علی کے مکان تک لے آئے۔ وہ اللہ کا بندہ ایسے گھوڑے بیچ کر سویا تھا کہ اسے خبر بھی نہ ہوئی کیا شرارت ہو رہی ہے۔ جب وہ خواجہ اشرف کے صحن میں پہنچ گئے تو شرف اللہ کی آنکھ کھلی اور وہ دہائی دینے لگے:

"خدا کے لیے چھوڑ دو میں گر جاؤں گا۔ میں مرا۔"

لیکن کون سنتا تھا۔ اور شرف اللہ کو چارپائی سمیت حوض میں غڑاپ سے اُلٹ دیا۔ غریب نے یخ پانی میں دو چار ڈبکیاں کھائیں۔ آنکھ ناک میں پانی گھس گیا اور وہ کُلیاں کرتے چھینکتے کھڑے ہو گئے اور سب نے خوب قہقہے لگائے۔

پھر تو شرف اللہ بھی بدلہ لینے پر ایسے اترے کہ میر نہال کو بھی نہیں بخشا۔ اور کسی کی تو اتنی مجال نہ تھی کہ ان سے گستاخی کرتا اور رنگ کھیلتا۔ میر نہال شرف اللہ کی شرارت اور بیباکی پر مسکرا کر چپ ہو گئے اور اپنے پر سے گلال جھاڑنے لگے۔ جوش میں سب نے رنگ کی بالٹیاں اٹھا اٹھا کر مرزا شہباز بیگ کے گھر کا رُخ کیا اور مرزا جی کو رنگ کر ہولی کا بھڑوا بنا دیا۔ وہ شرف اللہ پر بہت بھنائے لیکن کسی نے پوری بالٹی اُن پر انڈیل دی۔ اس پر اشفاق لڑنے مرنے کو کھڑے ہو گئے۔

"یہ کیا لغویت ہے۔ ختم کیجیے۔ اس مذاق کو۔ اس سردی میں کیا کسی کی جان لینی چاہتے ہیں؟"

"بس آپ یہی سمجھتے ہیں۔ ذرا دیکھیے تو۔" یہ کہہ کر شرف اللہ نے اپنی فوج کو للکارا:

"دیکھیے کیا ہو بچ کے نہ نکل جائیں بڑا غرّہ ہے انہیں۔"

اور پھر تو سب نے مل کر اشفاق پر نہ صرف رنگ ڈالا بلکہ جس کے ہاتھ جو لگا، گلی کی موری کی کیچڑ، مٹی، غلاظت سب ان کے منہ پر لیپ دیا۔ بندو کی حالت بھی قابل رحم تھی وہ سوانگ کا بیچا بنا کھڑا سردی سے پھریریاں لے رہا تھا۔ گھر میں ادھر عورتیں بھی خوب تفریح کر رہی تھیں۔ آناؤں کی دیکھا دیکھی بچے بھی بے آپے ہو گئے تھے۔ کلیم بیگم اور جمال بیگم نے بوڑھیوں ٹھوڑیوں کو دیگوں کے کنارے زبردستی لا لا کر تر بتر کر دیا۔ دیواریں رنگین ہو گئیں۔ صحن میں ہر طرف نیلا پیلا رنگ بکھرا ہوا تھا۔ سفید بگلا سے سر گلال سے گلنار ہو گئے اور بیویوں کے کپڑے جوڑا ہو کر جسموں سے چپک گئے اور جسم کی گولائیاں اور خط واضح ہو گئے۔ چہرے رنگ برنگے ہو کر دیوالی کی گڑیاں نظر آ رہے تھے۔

غفور اور احمد و زبیر آپس میں رنگ کھیلتے کھیلتے ایسی ترنگ میں آئے تھے کہ محلے والوں کو بھی نہ چھوڑا۔

اور جب سب تھک کے چور ہو گئے تو مل کر نہلائے، اور کپڑے بدل بدلا کر انسانوں کی جون میں آئے۔

شادی کا ہنگامہ عبیر اور گلال اڑا کر اور جوتی کھیل کر کیف و خوشی سے بخیر و خوبی رخصت ہوا اور مہمان ولیمے کے بعد ایک ایک کر کے اپنے ٹھکانوں کے ہو گئے اور ان کے جانے سے گھر سونا سونا معلوم ہونے لگا۔

۳

بیاہ کے بعد اصغر بہت ہی خوش رہنے لگا بلقیس کو پا کر اسے معلوم ہوتا تھا کہ دونوں جہاں کی نعمت مل گئی ہے۔ بلقیس نئی نویلی دلہن زیور میں گوندنی کی طرح لدی عطر سے مہکی ہوئی شرمائی لجائی ہاتھ بھر کا گھونگھٹ نکالے تمام دن بیٹھی رہا کرتی۔ چلتی تو قدم بھی گن گن کر اٹھاتی، نئی نئی زندگی، نیا نیا گھر، نئے لوگ، نئی چال نیا ڈھب اور دلہناپے کا زمانہ۔ کوئی ضرورت ہوئی تو چنبیلی ساتھ ہی آتی تھی اس کے کان میں چپکے سے کہہ دیا۔ بیگم نہال اپنی سکڑی سمٹی شرمیلی بہو سے اکثر کہتیں:

"بیٹی تمہارا ہی گھر ہے۔ چلو پھرو، جو جی چاہے کرو۔ تمہیں کون روکتا ہے۔"

البتہ جب وہ اپنے میکہ میں ہوتی آزادی سے بات چیت کرتی اور اٹھتی بیٹھتی سسرال میں صرف رات کے وقت جب وہ اپنے کمرے میں جاتی تو شرم ایک حد تک کم ہو جاتی پھر وہ اور اصغر بے تکلفی سے باتیں کرتے۔

لیکن اکثر جب وہ دونوں یکجا ہوتے تو اصغر اس کی کمر کے گرد ہاتھ حمائل کر دیتا۔ اس کی گرفت میں دباؤ اور قید کا احساس ہوتا اور بلقیس بولتے بولتے

خاموش ہو جاتی۔ اصغر اس کو اچانک خاموش دیکھ کر پوچھتا تم چپ کیوں ہو اور بلقیس اس سے بغیر نگاہیں ملائے ہوئے کہتی آپ بتائیے کیا باتیں کروں۔ ایسی روح پرور تنہائیوں میں اصغر کی ہمیشہ یہی خواہش ہوتی کہ بلقیس کی آواز کسی بہتے ہوئے جھرنے کی طرح نغمہ بار ہو، اور زبانِ حُسن داستانِ عشق کہے جس میں وصال کے فسانے اور ہجر کی بے قراریاں ہوں، اور بلقیس بڑھ کر اس کے گلے میں باہیں ڈال دے، اس کو پیار کرے، تم میری جان ہو کہہ کر اپنی الفت و چاہت کا یقین دلائے۔ لیکن بلقیس ایک سیدھی سادی سی مشرقی لڑکی تھی، جہاں دبی دبائی حیا اُبھر کر زیادہ سے زیادہ میرے سرتاج تو کہہ دیتی مگر اس سے سوا اس کو عشق اور اظہار عشق کے وہ تمام رنگین اور لذت بھرے طریقے نہ آتے تھے جن کا اصغر اس سے طالب تھا۔

اصغر جب کبھی اس سے کہتا:

"تمہاری حسین آنکھوں میں عشق کی پُر کیف آرزو اور شوق پنہاں تھے اور تمہیں اپنی آغوش میں لینے کو میں مجنوں سے زیادہ بے قرار تھا" تو اس کے صندلی گالوں پر حیا کی سُرخی بکھر جاتی اور وہ بدن چرا کر بڑی بڑی آنکھیں جھکا لیتی اور اصغر جواب نہ پا کر بڑی اُمید سے پوچھتا:

"بلقیس میری طرف دیکھو۔ کیا تمہیں مجھ سے عشق نہیں؟ بولو بلقیس"

اور بلقیس والہانہ ادا سے صرف مسکرا کر رہ جاتی، یا اصغر کے تقاضوں پر کہتی:

"جب میں نے آپ کو پہلی دفعہ دیکھا تو سچ مچ میں شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی اور میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ گھر کے کس کونے میں چھپ جاؤں" اس جواب سے اصغر کے بھڑکتے ہوئے جذبات پر اوس پڑ جاتی۔

تخیلات کی دنیا میں بسنے والے اصغر نے بلقیس کو بھی اپنے ہی جیسا بنتا

عاشق تصور کر لیا تھا، اور اپنے تصور میں نہ جانے کیوں اس کو یہ یقین تھا کہ وہ بھی اس کی محبت اور فراق میں تڑپ تڑپ کر گھلتی رہی ہوگی۔ وہ اپنے خیالوں میں خود کبھی ایک بہادر راجپوت بن جاتا تو کبھی وہ مغل شہزادہ جس نے کسی عشق کی ماری دوشیزہ کو اپنا دست محبت تھما کر اس کی جان بچائی تھی۔ اس کے قلب میں عشق کے وہ آتش کدے دہک رہے تھے جو ملکہ نور جہاں کی محبت میں جہانگیر کے دل میں بھی نہ سلگے ہوں گے چنانچہ بلقیس ممتاز محل سے بھی بڑھ کر حسین اور پیاری بن جاتی۔

مگر بلقیس قفس کی وہ بند چڑیا تھی جس کو آدابِ قید و بند اچھی طرح آتے تھے۔ وہ پرواز چاہے بھول چکی ہو مگر جذبۂ آزادی جوں کا توں دل میں باقی تھا۔ عشق کے درس دیے نہیں جاتے، اس کے رازو اسرار خود بہ خود کھل جاتے ہیں، اور عشق اپنے اسلوب خود سکھا دیتا ہے۔ چاہے بلقیس میں وہ گدگدانے والی ہیجانی کیفیت نہ رہی ہو لیکن اس نے اصغر کی خواہشات کو کبھی نہ ٹھکرایا تھا۔ اگر خوبصورت اور بناوٹی الفاظ اعلانیہ اعلانِ محبت نہ کر سکتے تھے تو اس کے یہ معنی نہ تھے کہ وہ اصغر کو چاہتی نہ تھی۔ بلقیس کا اچھوتا دل محبت کی پوری گرمی اور چاشنی سے آشنا تھا۔ اصغر اس کے واسطے نہ صرف ایک شوہر تھا بلکہ اس کے لیے بلقیس کی روح اور ہستی تک حاضر تھی۔ اس کی نگاہوں میں اصغر ایک دیوتا تھا جس کے چرنوں پہ پہلے دن ہی وہ تن من دھن وار چکی تھی اور اسی عشق کے جذبے سے مغلوب ہو کر وہ اکثر نظریں چرا کر اصغر کو محبت میں سرشار نگاہ سے دیکھتی۔ ایسے لمحات میں وہ وارفتہ ہو جاتا اور اسے محسوس ہوتا کہ اسے عشق کی معراج حاصل ہو گئی ہے اور اس کے دل میں از سرِ نو محبت کے چراغ روشن ہو جاتے اور ان کی ہلکی ہلکی روشنی میں اس کو ایک عجیب لذت و سرور ملتا۔ وہ بلقیس کو بیتاب ہو ہو کر بھینچتا اور پیار کرتا۔ اصغر کے اس اضطرار و ہیجان کے باوجود بلقیس اپنی سادہ محبت میں رنگ آمیزی

نہ کرسکتی بلکہ جوشِ محبت اس کے لبوں پر اور مہر سکوت ثبت کردیتا۔ اس وقت اصغر کو مشتری بائی اور اپنی ساری دیرینہ آشنائیں ایک ایک کرکے یاد آتیں ان کی وہ ارمان نواز باتیں اور بوس وکنار یاد آتے جن کے چٹخارے وہ اپنی بیوی کی ذات میں تلاش کرتا۔ ان عورتوں کے طرب کوش غمزہ وعشووں کے مقابلہ میں بلقیس اس کو پھیکی اور خشک معلوم ہوتی۔ لیکن وہ اس کی بیوی تھی۔ اس کے نقش ونگار دلآویز تھے۔ گدرایا ہوا سڈول جسم اور بھرپور جوانی تھی اور اصغر کے خیال جلد ہی پلٹا کھا کر اس کے جوان اور خوبصورت جسم کے گرد منڈلانے لگتے اور وہ بلقیس کے حُسن کے سہارے خوابوں کی بھول بھلیوں میں گم ہوجاتا اور بیوی کی اس سادگی کو جس میں شدتِ جذبات کی کمی تھی اس کی طرز اور گھر کے چلن پر محمول کرکے صبر کرلیتا۔ اور وہ ان خود فریبیوں میں بلقیس کو اسی شدت سے چاہتا چلا گیا لیکن دراصل اس کو بلقیس سے تو اتنی محبت نہ تھی جتنا وہ اپنی ذات کا عاشق تھا۔ اس کو اپنے ان خوابوں سے محبت تھی، اپنے اس تخیل وتصورسے جو بلقیس کے حسن سے وابستہ ہوکر اس کے واسطے کائنات بن گئے تھے۔

بلقیس کی والدہ کو چونکہ اپنی ذات سے دلچسپی تھی اس لیے وہ دنیا اور اس کے بکھیڑوں میں پورے انہماک سے لگی رہتی تھیں لیکن بلقیس اس معاملے میں ان کے برعکس تھی، اور اس کی فطرت بالکل جدا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ بلقیس کو اس کی پھوپی نے جو لاولد تھیں گود لے لیا تھا اور ان کے انتقال کے وقت تک وہ انہی کے پاس چودہ برس رہی تھی۔ اس لیے اس کی تعلیم وتربیت شریف گھرانوں کی عام فضا میں ہوئی تھی، جہاں لڑکیوں پر کڑی نگرانی رکھی جاتی ہے، اشاروں کنایوں سے دنیا کی ساری اونچ نیچ آنکھ کھلتے ہی ذہن نشین کرادی جاتی ہے۔ ان کے جذبات اور امنگوں کی کوئی وجہ اونچی نہیں ہوتی۔ زمانے دستور کا جو چلن تھا اس کے

مطابق انھوں نے بلقیس کی دیکھ بھال بخوبی کی تھی۔ اُردو لکھنی پڑھنی اتنی سکھا دی تھی کہ مذہبی کتب اور رسائل کے علاوہ بوقتِ ضرورت خط لکھ پڑھ لے اور امورِ خانہ داری سے متعلق جتنے جتنے اور گُر ہوتے ہیں وہ گڑیوں کے کھیل میں ہوش سنبھالتے ہی آ گئے، اور بلقیس سینے پرونے میں طاق اور کھانا پکانے میں مشاق تھی۔ ایک اچھی بیوی اور سگھڑ بہو بیٹی کے لیے یہی ضروری فرائض تھے کہ وہ جہاں جائے اپنی گھرداری خوش اسلوبی سے چلا سکے۔ بلقیس کا لڑکپن تو گڑیاں کھیلتے گزر گیا مگر شباب کی منزل میں قدم رکھتے ہی اس پر وہی پابندیاں عائد ہوگئیں جو سب مشرقی لڑکیوں پر اس رسم و رواج میں جائز تھیں۔ اور اس کے کان میں بھی یہی باتیں پڑتی رہیں ”اے بیٹی اب اللہ رکھے سیانی ہوگئیں، ڈھنگ پکڑو۔ تمہیں پرائے گھر جانا ہے۔ بہتو غیروں سے پالا پڑے گا۔ کہتے ہیں ماں جنم کی ساتھی ہوتی ہے کرم کی نہیں۔ کون کیسا ملے گا۔ ابھی سے آرام اور بڑھیا بڑھیا کپڑوں کی عادت پڑ گئی تو مشکل ہوگی“ بناؤ سنگھار صرف جنم مرن کے ساتھی کے لیے مخصوص تھا اور کوئی لڑکی نہ بیاہ سے پہلے عطر لگا سکتی تھی نہ پھول گل پہن سکتی تھی اور نہ پان کھا کر ہونٹ رچا سکتی تھی۔ اے خدا کی سنو! پھول سا منہ پڑا ہے۔ ابھی سے ہار پھول پہنوگی منہ کا نور اُڑ جائے گا۔ بچیاں بھولی بھالی اچھی لگتی ہیں۔ پھر کون ایسی بیوقوف تھی جو منہ کا روپ انوپ اُڑانا چاہتی ہو۔ لہٰذا اگدرائے جسم اور البیلی جوانیاں گاڑھے گزی اور کوری ململ کے دوپٹوں میں ملفوف پرائے گھر جانے اور کسی ان دیکھے مرد کے خوابناک تصور میں مطمئن اور مسرور گزر جاتیں۔ پھر وہ وقت بھی آجاتا اور یہ تمام شوق اور حرص و ہوس جنت و دوزخ کی فرحت و اذیت کے مختصر فلسفے میں ختم ہو جاتی اور اس کے ساتھ ساتھ انھیں اچھے بُرے مقدر سے دوچار ہونے اور مخالف حالات کا خوگر بنانے کے لیے وقت سے پہلے تیار کر دیا جاتا۔ نشیب و فرازِ راہ اور خطراتِ سفر کے پہلے ہی سے سبق

ملتے اور نہ موجیں ساحل کی طرف بڑھتیں نہ طوفان آتے اور نہ فتنے ہی اٹھتے۔ بھلا اس فضا میں حضرتِ عشق کہاں براجتے اور دھونی رماتے اور ان کی کارگزاریاں گل کترتیں تو کہاں؟ اوّل تو ایسے امکانات پیدا ہی نہ ہوتے اور اگر ایسی کوئی نادان لڑکی ہوتی اور بھول سے کسی خلیرے یا چچیرے بھائی سے محبت کر بیٹھتی تو وہ مرتے دم تک کرنیوالی کے دل میں ہی رہتی۔ مجال ہے جو زبان پر کسی نے حرفِ شوق یا نامِ حبیب سنا ہو۔ بدنامی اور رسوائی اور کلنک کے ٹیکے کا خوف ہونے سے بھی زیادہ تھا کیونکہ ہزاروں سال سے دادی سے پوتی اور ماں سے بیٹی کو یہ اصولِ زندگی اور عزت کے درس سینہ بہ سینہ ملتے چلے آئے تھے۔ یہ سب ایک ہی چمن کی پروردہ تھیں جہاں "جان جائے پر آن نہ جائے" کا زرّیں نقش تحریر تھا۔

بلقیس کو یہی سب سکھایا گیا تھا اور وہ اتنا ہی جانتی تھی۔ اگرچہ اس کی محبت دریائے لنگر دار تھی لیکن منہ سے بھاپ بھی نہ نکلتی تھی۔ رہے محبت جتانے کے گورکھ دھندے تو وہ اس کی حدودِ گویائی سے بھی دور تھے اور اصغر انہی دکھاوں کے لیے نیم جاں ہو رہا تھا۔ حالاں کہ بلقیس اس کی آغوش میں سما کر اپنی ہستی کو بھی بھلا بیٹھی تھی۔

بلقیس کو ساس سسر کے گھر میں کوئی خاص تکلیف نہ تھی، لیکن سسرال پھر سسرال ہے اور نئی نئی بہوؤں کو لحاظ اور ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ گو بیگم نہال سے لے کر ہر چھوٹا بڑا اس کو سر آنکھوں پر بٹھاتا لیکن حجاب آخر اٹھتے ہی اٹھتے اٹھتا ہے جمال بیگم سے چونکہ میکہ کی کنبہ داری تھی، بلقیس ان ہی سے بے تکلف ہو گئی اور اکثر ان کے پاس کوٹھے پر جا کر بیٹھ جاتی۔ مگر دل اکثر چاہتا تھا کہ اس کا اپنا الگ ایک گھر ہو جہاں وہ پوری آزادی سے رہ سکے، اور بلا پس و پیش جس طرح چاہے اپنے اصغر کی ناز برداریاں اٹھائے۔ لیکن اصغر سے اس نے اپنی خواہش کا ذکر نہ کیا۔ وہ ابھی

میاں کی طبیعت سے پوری طرح واقف نہ ہوئی تھی نہ معلوم وہ اس سادی سی بات کو کس پیرائے میں لے۔

جوں جوں وقت آگے بڑھتا گیا بیگم نہال اپنی بہو کا دم بھرنے لگیں۔ شادی کے کوئی دو مہینے بعد ایک دن جمال بیگم نے دیورانی سے کہا، اُوئی بوا بہو کو گھونگھٹ میں کب تک گھونٹے رکھوگی؟ بس جی میں تو کہتی ہوں خیر سے گھونگھٹ بڑھادو۔ اور جمعہ کو ساس نے بلقیس سے کھیر پکوا کر گھونگھٹ بڑھانے کی رسم بھی پوری کر دی۔ اب وہ دوسرے گھر والوں کی طرح گھر کے کام کاج میں حصہ بٹانے لگی۔

وحیدہ بیگم مہرو کی شادی کی وجہ سے ٹھہر گئی تھیں۔ ابھی بہت کچھ سلنا سلانا ادھورا پڑا تھا اور بلقیس نے خوشی خوشی سلائی ٹکائی پوری کر دی۔ کبھی کبھی اگر دل چاہا تو باورچی خانے میں جا کر اپنے ہاتھ سے کوئی خاص چیز پکا دی۔

گو وہ اب گھر کا فرد بن گئی تھی، لیکن میر نہال نے اب تک بہو سے بات نہ کی تھی اور بلقیس کو یہ بات اکثر کھٹکتی تھی۔ وہ سوچتی کہ چونکہ یہ شادی ان کی مرضی کے خلاف ہوئی ہے اسی واسطے وہ مجھ سے ناراض ہیں لہٰذا ایک دن اس نے دلچین سے پوچھ ہی لیا:

"معلوم ہوتا ہے کہ ابا میاں مجھ سے خفا ہیں۔ آج تک انھوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔"

دلچین اس بات پر ہنس دی اور بلقیس کو اطمینان دلایا:

"نہیں بیٹی وہ کسی سے بھی خفا نہیں ہوتے، اور بھلا تم سے کیوں ہوں گے؟ خدا سلامت رکھے سرکار بڑے محبت والے ہیں۔ تم خود دیکھ لوگی۔"

شام کو میر نہال نے کھانا کھاتے کھاتے سر اُٹھا کر بیوی سے پوچھا:

"یہ کوفتے کیا تم نے پکائے ہیں؟"

بیگم نہال کہنے لگیں :

"کیوں، کیا بدمزہ ہیں ؟"

"نہیں بہت عمدہ ہیں۔ بڑے دنوں بعد اس مزے کے کھائے ہیں۔"

بیگم نہال خوش ہو کر بولیں :

"اللہ مبارک کرے۔ چلو تم کو کسی کے ہاتھ کا پکا بھایا تو سہی۔ اللہ رکھے اصغر کی دلہن نے پکائے ہیں۔ اب تو وہی کرتی ہے سب کچھ۔ مجھے تو خبر بھی نہیں ہوتی ....."

اس کے بعد ایک دن وہ باہر سے آئے تو ان کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی۔ وہ سیدھے بلقیس کی طرف بڑھے اور بہت محبت آمیز لہجے میں بولے :

"لو دلہن یہ میں تمہارے واسطے لایا ہوں۔"

بلقیس نے جلدی سے کاغذ کھول کر دیکھا بہت ہی خوش رنگ ہری پوتھ کا تھان تھا۔ کپڑے کو انگلیاں پھیر کر محسوس کرتے ہوئے بلقیس ایک غیر معمولی خوشی سے بولی :

"ابا میاں بڑا نفیس کپڑا ہے، اور مجھے یہ رنگ بھی بہت مرغوب ہے۔" اور میر نہال کو آداب کر کے وہ پائنچے سنبھالتی ہوئی کوٹھے پر اصغر کو سسرے کا دیا ہوا پہلا تحفہ دکھانے چلی گئی۔ میر نہال مسکرا کر بیوی سے کہنے لگے :

"اصغر کی دلہن واقعی اچھی لڑکی ہے اور میرا خیال ہے اصغر کو خوش رکھے گی لیکن اس کی ماں تو اللہ کی پناہ علامۂ دہر ہیں۔"

بیگم نہال جلدی سے میاں کی بات کاٹ کر بولیں :

"ہے ہے تم کو کیا ہو گیا ہے۔ بڈھے ہو گئے مگر تمہاری زبان کو لگام نہیں۔ بلا وجہ ایک ایک کی عیب جوئی کر کے اپنے نامۂ اعمال سیاہ کرتے ہو۔ اور دلہن سن لے تو تمہاری کیسی کرکری ہو۔"

"ارے بھئی منہ پر مہر لگا دو۔ سچی بات بن کہے رہا نہیں جاتا۔" یہ کہتے ہوئے وہ بیٹھک میں چلے گئے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

مارچ کا مہینہ تھا اور موسم بہار کی ایک خوبصورت شام۔ اصغر اور بلقیس اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور مہندی کے پھولوں کی تیز مہک ہر جھونکے کے ساتھ اندر آتی۔ شام کی پُر کیف تنہائی اور پھولوں کی مست خوشبو سے دلوں میں نا معلوم ارمان مچلتے، محبت اور شوق کے سوز اور انبساط سے دل میں ایک میٹھا میٹھا درد کروٹ لیتا۔ دن بھر کی عشق و عاشقی کے بعد آفتاب کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا اور پہاڑیوں کے پرے جاتے جاتے اس کی آخری شعاعیں ہر بادل کے ٹکڑے کو محبت سے چھو رہی تھیں، اور سارے آسمان پر دمکتا ہوا جو گیا رنگ پھیل گیا تھا جس میں بادل نارنجی ہو کر اتنے دل کش نظر آ رہے تھے گویا انسان کی نگاہ نے ایسے حسین و جمیل اور دلفریب رنگ اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ بلقیس خیالوں میں غرق ڈوبتے ہوئے آفتاب کا منظر دیکھ رہی تھی دونوں وقت گلے مل رہے تھے اور ہلکے ہلکے رنگین اجالے میں فضا اداس تھی اور دل میں ایک موہوم یاس۔ اصغر اٹھا اور بلقیس کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ کے محبت اور حفاظت سے اس کو محصور کر لیا پھر بڑی نرمی سے کہا "تم اس قدر افسردہ کیوں ہو؟"

بلقیس نے اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں اٹھا کر اصغر کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں پرستش اور عقیدت عیاں تھی۔ وہ کہنے لگی:

"میں دیکھ رہی ہوں آپ ہر وقت کچھ پریشان سے رہتے ہیں۔ کیا آپ کو اب تک ملازمت نہیں ملی اس لیے؟ آخر ایسے پریشان کیوں ہوتے ہیں؟ خدا پر

بھروسہ رکھیے وہ بڑا کارساز ہے۔ کوئی نہ کوئی سبیل نکل آئے گی۔"

بلقیس نے یہ ساری بات اتنی محبت اور دلی خلوص سے کہی کہ اصغر اس کی محبت میں بیقرار ہو گیا۔ ایسی ساعتوں میں اس کا دل ہمیشہ عجیب دل آویز خیالوں اور رنگ و بو کی آماجگاہ بن جاتا تھا۔ اس کو بلقیس پر بے اختیار پیار آ گیا اور اسے اپنی آغوش میں لے کر پیار وں پہ پیار کرنے لگا۔ بلقیس ذرا کسمسائی اور پھر بڑے سکون سے اس کے سینہ سے اپنا سر ٹکا دیا۔

دھیرے دھیرے سانولی سلونی شام جا رہی تھی۔ پھاگن کی البیلی رُت اور اس کی غم انگیز فضاؤں کے سوز و ساز بھی جیسے ان کے خوابِ محبت میں سمو گئے اور وہ دونوں خاموش پہلو بہ پہلو، رخسار بہ رخسار، ہاتھوں میں ہاتھ لیے دور دراز فرحت انگیز باتوں کا سوچتے ہوئے اپنے خوابوں کی حسین دنیا میں کھوئے رہے یہاں تک کہ رات نے بڑھ کر ہر چیز کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ ایک ایک کر کے تمام ستاروں کی شمعیں روشن ہو گئیں اور معلوم ہوتا تھا کہ بے شمار پٹاخے جھم جھم کر رہے ہیں اور اصغر اس خیال سے مخمور تھا کہ وہ گھر جہاں صرف بلقیس تنہا اس کے ساتھ ہو جنتِ ارضی سے کم نہ ہو گا۔

۴

بلقیس امید سے تھی اور اکثر اس کی طبیعت خراب رہتی۔ کھانا پینا چھوٹ گیا۔ دن بھر وہ امچور کی پھانک اور املی کے کٹارے چوستی رہتی، یا پھر کھٹ میں منہ لپیٹے پڑی رہا کرتی۔ اس کا رنگ ماند پڑ گیا اور آنکھوں کے گرد حلقے دکھائی دینے لگے۔ اکثر وہ لیٹے لیٹے کھجور کے درخت کو دیکھتی جس کے نیچے کے تمام پتے زرد پڑ کر گر چکے تھے اور پھننگ پر دو چار پتے رہ گئے تھے۔ اس خزاں آلود کھجور کو دیکھ کر بلقیس کو زیادہ مایوسی ہوتی۔

لیکن پھر فوراً ہی اسے اس نئی ہستی کا احساس ہوتا جو اس کے جسم میں جنم لے چکی تھی۔ بچہ پیٹ میں پھرتا تو اس کی ہر حرکت سے دل کے پیمانے انوکھی مسرت سے چھلک اٹھتے، اور کائنات کی ہر شے دلفریب نظر آتی۔ جدھر وہ دیکھتی نئی زندگی کا آغاز معلوم ہوتا۔ مہندی نے اپنا پرانا لباس اتار پھینکا تھا اور اس پر ننھی ننھی سبز کونپلیں آ رہی تھیں۔ چڑیاں چونچوں میں پر اور تنکے لے کر انڈے دینے کی تیاری میں نئے آشیانے بنا رہی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اٹھلاتے ہوئے

جب بلقیس کو چھیڑتے ہوئے گزرتے تو ایسے یہی محسوس ہوتا کہ نوید حسن اور وجود نو
کے سندیسے لے کر آئے ہیں۔ ان کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ میں زندگی کی خوشی
کے مدھ بھرے گیت سنائی دیتے۔ وہ احساس فرحت سے مطمئن ہو جاتی اور مسکرا کر
اپنے دوپٹے کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ لیتی اور اپنے پیٹ کو جو اب بتدریج نمایاں
ہوتا جا رہا تھا کچھ اس طرح تھپتھپاتی گویا وہ اپنے ہونے والے بچے کو ابھی سے
پیار کر رہی ہے۔

سب بلقیس کا خیال پہلے سے زیادہ رکھنے لگے۔ بیگم نہال اور جمال بیگم
اس کو اونچے نیچے پیر بھی نہ رکھنے دیتیں۔ قدم قدم پر بسم اللہ، اور دلہن سنبھل کر
چلو، بیٹی قدم دھیرے اٹھاؤ، کہتیں۔ حد ہے کہ پانی کا بھرا لوٹا بھی اسے نہ اٹھانے
دیا جاتا۔

یہ بات انسان اور حیوان کی جبلت میں ہے کہ وہ اپنی افزائش نسل چاہتا
ہے۔ باپ بن کر انسان کو یہ خوشی اور فخر ہوتا ہے کہ اس کا وجود اور نسل برقرار رہے۔
اپنی وہ صورت جو وقت کی رفتار سے بگڑ جاتی ہے، انسان اولاد کے آئینۂ ہستی میں
صاف اور نکھر کر دیکھنی چاہتا ہے۔ گویا یہ اس کا ایک اور پیکر ایک اور شبیہہ ہے
اور اپنی اس آلہ کاری کے زعم باطل میں سمجھتا ہے کہ سلسلۂ انسانی ابد تک چلتا رہے گا
اصغر بھی اس بات پر نازاں تھا کہ نئے انسان کو وجود میں لا کر نہ صرف اپنی ذات کا
ماحصل مل رہا ہے بلکہ وہ باپ کہلائے گا اور یہ بچہ عصائے پیری بن کر سہارا دے گا
اور آئندہ اس کا نام چلانے والا بھی ہوگا۔

بلقیس اور اصغر کا بیشتر وقت اپنے ہونے والے بچے کی باتیں کرتے ہوئے
گزر جاتا۔ ابھی سے اصغر نے بیٹے کا نام بھی تجویز کر لیا تھا اور اس کے مستقبل کے
بارے میں وہ دونوں بڑے بڑے منصوبے بناتے، کس طرح اس کو اچھے پیمانے پر

تعلیم و تربیت دیں گے اور ایسی کوئی خامی اس میں نہ رہنے دیں گے جو ان کے والدین کی کوتاہ بینی اور سہج سے ان میں رہ گئی تھی۔

بلقیس اب تک اصغر کو اپنا خدا کے مجازی بنا کر پوج رہی تھی مگر اب وہ اپنے شوہر کو اپنے آنے والے بچے کا باپ سمجھ کر دیکھتی تو اس کا دل احسان مندی سے معمور ہو جاتا۔ ماں بننا تکمیلِ نسوانیت ہے اور عورت کی قدرتی اور سب سے پہلی خواہش جب سے بلقیس کی محبت میں منت و مشکوریت کا نیا زمندانہ عنصر شامل ہوا تھا اس کو اصغر پر بے ساختہ پیار آنے لگا تھا گویا اصغر نہ ہوتا تو وہ ماں کہلانے کی ازلی تمنا سے محروم رہتی۔ وہ خلافِ عادت اب اکثر اس کے بالوں میں اپنی ریشم جیسی انگلیاں ڈال کر کھیلتی۔ کبھی اس کے رخساروں سے اپنے رخسار ملتی اور بعض اوقات اس کے گلے سے وارفتہ ہو کر لپٹ جاتی۔ اصغر بلقیس کے اس بدلے ہوئے رویے پر نہ صرف مسرور تھا بلکہ وہ آئے دن کوئی نہ کوئی سوغات بھی بیوی کو لا کر دیتا اور اس طرح بلقیس کی محبت وصول کرتا۔ اس نوع اصغر کی تشنگی اور خواہشات کی تکمیل بھی ہوتی رہتی۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

دن گزرتے کتنی دیر لگتی ہے۔ مہروز مانی کی شادی نزدیک آ گئی۔ گھر میں پھر ہماہمی نظر آنے لگی۔ اس عرصہ میں بلقیس کی طبیعت بھی سنبھل گئی تھی۔ مگر مرزا شہباز بیگ بہت علیل تھے اور وہ اپنے میکے چلی گئی۔ لیکن مایوں سے چار روز پیشتر بیگم نہال نے بہو کو بلوا لیا۔

مہرو کی شادی میں اتنے مہمان تو نہ تھے جتنے اصغر کی دفعہ مگر پھر بھی اچھے خاصے لوگ تھے کنبہ والوں ہی سے گھر بھر گیا۔ مہرو کو مایوں بٹھایا جا چکا تھا اور نکاح سے ایک دن پہلے برات بھی بھوپال سے آ گئی۔ سب لوگ لینے گئے۔ مسرور وہاں

سے واپس آکر سیدھا مہرو کی صحنچی میں پہنچا اور کہنے لگا:

"مجھے بہت کہتی تھیں کالا کلوٹا، لو تمہارے دولھا تو کالے بھجنگ بالکل الٹے توا ہیں۔ سچ ــــ میں جھوٹ تھوڑی کہہ رہا ہوں۔ بڑے بدصورت ہیں دولہا بھائی ایک کان تو ندارد ہے۔ مجھے تو کن کٹے دیو معلوم ہوتے ہیں۔ قد دیکھو تو راون کے راون۔"

مہرو نے بگڑ کر اس کو ڈانٹا:

"تم کو شرم نہیں آتی مجھ سے ایسا مذاق کرتے ہو۔ جاؤ یہاں سے ورنہ ابھی۔۔"

اور مسرور وہاں سے یہ کہہ کر اٹھ گیا: "تم چاہے غصہ ہولو۔ مگر دیکھ لینا میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

مسرور کے جانے کے بعد تو مہرو کچھ اس قدر خوفزدہ ہوئی کہ روتے روتے حال سے بے حال ہو گئی۔

عصر مغرب کے درمیان نکاح تھا جب برات آئی تو میر نہال نے اپنے ہونیوالے داماد کو پہلی بار دیکھا اور دیکھتے ہی ان کے سینہ پر گھونسا سا لگا۔ مسرور مذاق نہیں کر رہا تھا۔ معراج واقعی بدصورت تھا کالا رنگ اور ایک کان سرے سے غائب جو شکار میں غلطی سے بھری بندوق کی لبلبی دب جانے سے اُڑ گیا تھا اور گولی کان کے پار ہو کر دماغ میں گھس گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے بہتیری کوشش کی مگر گولی نہ نکل سکی اور گولی رہ جانے سے دماغ پر بھی اثر ہو گیا۔

دلّی سے نظرالحسن کئی بار بھوپال معراج کے بر دکھوّا کو بھیجے گئے تھے مگر اتفاق ایسا ہوا کہ وہ معراج کو ایک بار بھی نہ دیکھ سکے۔ اس کے بارے میں جو پوچھ گچھ ہوئی وہ خاطر خواہ تھی اور کسی کو یہ شبہ بھی نہ ہوا کہ وہ عیبی ہو گا۔ معراج کو دیکھ کر میر نہال اس قدر متنفر ہوئے کہ فیصلہ کن انداز میں کہا: "میں اپنی بیٹی ایک پاگل کے حوالے

نہیں کر سکتا۔" اور یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں آ گئے۔ ندامت، غصے اور رنج سے ان کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ براتیوں کے چہرے ان کے فیصلے سے فق ہو گئے اور سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ دولہا والوں نے میر نہال کی بہت منت سماجت کی لیکن وہ اپنے انکار کے سامنے کسی کی بات سننے کو تیار نہیں تھے۔ وہ باپ تھے اور اپنا حقِ پدری اچھی طرح سمجھتے تھے۔ مہرواں ان کی سب سے چھوٹی بیٹی اور ان کی جوانی کی آخری نشانی تھی۔ انھوں نے سب کی سنی اَن سنی کر کے ٹکا سا جواب دیدیا۔

حبیب الدین کو بھی معراج کی صورت سے وحشت اور نفرت ہو رہی تھی، لیکن وہ معاملہ فہم اور دوراندیش تھے معاملے کی نزاکت پر سنجیدگی سے غور کر رہے تھے۔ برات کو اٹھا دینا تو مشکل نہ تھا مگر اس کے بعد انجام کیا ہوگا؟ جتنے منہ اتنی باتیں۔ مارنے والے کے ہاتھ تو پکڑے جا سکتے ہیں، کہنے والوں کی زبان کون پکڑ سکتا تھا۔ لڑکی کا معاملہ تھا۔ یہ تو کوئی نہ دیکھے گا کہ دراصل حقیقت کیا تھی؟ چھری پر خربوزہ گرے یا خربوزے پر چھری، نقصان سراسر خربوزہ کا ہے۔ ان سب باتوں پر غور کرنے کے بعد وہ میر نہال کے پاس آئے اور ان کے قدم پکڑ لیے کہ ابّا اجازت دیدیجیے۔ میر نہال کڑک کر بولے:

"تم سب نے مل کر مجھے دھوکا دیا ہے۔ آنکھوں دیکھے مکھی نہیں نگلی جاتی۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں اپنی معصوم بچی کو اس قزاق کو دیدوں؟ لڑکوں کا کال تھوڑی ہے، اور نہ مجھے بیٹی بھاری ہے۔" اور یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئے۔

حبیب الدین نے ڈرتے ڈرتے کہا:

"مگر دُنیا کیا کہے گی؟"

میر نہال غصے میں آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ یہ سن کر بکھر گئے اور چیخ کر بولے:-

"چولہے میں جائے دنیا ــــ تم بھائی ہو۔ تم کو بہن سے زیادہ دنیا کے کہنے کی پڑی ہے۔ میں باپ ہوں۔ میں اپنی بے گناہ بیٹی کے پاؤں پر آپ کلہاڑی نہیں مار سکتا۔ مہرو کا اور اس کا کوئی جوڑ نہیں۔ نہ عمر نہ صورت۔ لاحول ولا قوت۔"

حبیب الدین باپ کی خوشامد کرنے لگے:

"ابا میاں سوچیے تو سہی۔ اگر اس وقت برات اٹھ گئی تو ہم ہی نکّو بن جائیں گے نہ معراج کا کچھ بگڑے گا نہ کسی اور کا۔ سننے والے یہی کہیں گے کہ لڑکی ہی میں کوئی ایسا عیب ہوگا کہ دولہا والے بن بیاہے چلے گئے۔ بیچاری مہرو کہیں کی نہ رہے گی...."

میر نہال کا خون اُونٹ رہا تھا۔ طیش کے عالم میں کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہل رہے تھے۔ غم اور غصے سے ان کے ہونٹ بھنچ گئے تھے اور تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ پھر وہ ٹہلتے ٹہلتے رکے اور حبیب الدین سے کہنے لگے:

"جاؤ ــــ میں ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔ اس مردود حبشی کے ساتھ سب کو یہاں سے دفعان کرو۔ میں اپنی بچی کا ہاتھ کسی کنگال کے ہاتھ میں دے دوں گا مگر اس مسخ صورت کو اپنا داماد نہیں بنا سکتا۔ میں اپنی بیٹی کا دشمن نہیں ہوں۔ سن رہے ہو؟ مجھے نہ دُنیا کا ڈر ہے نہ کہنے والوں کا......"

یہ کہہ کر وہ پلنگ پر بیٹھ گئے۔ حبیب الدین نے اپنی ٹوپی باپ کے قدموں میں ڈال دی اور کہنے لگے:

"ابا میاں میری بات مان جائیے۔ شریفوں کی زبان پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ ہم ان کو زبان دے چکے ہیں۔ للہ آپ خاندان کی لاج رکھ لیجیے۔"

میر نہال نے اپنے پاؤں کھینچ لیے اور ٹوپی اٹھا کر بیٹے کے سر پر رکھ دی۔ مگر ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب تھا کہ اُمڈا چلا آ رہا تھا۔ ان کی خاموشی سے حبیب الدین سمجھ گئے کہ اجازت مل گئی ہے اور وہ اُٹھ کر مہمانوں میں آ گئے۔ مگر

میر نہال کا ضمیر اور ان کی محبت و شفقت سب ان کو بری طرح ملامت کر رہے تھے۔ وہ نکاح میں شریک نہیں ہوئے اور اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے بے بسی، تاسف اور غم کے آنسو بہاتے رہے ان کو معلوم ہو رہا تھا کہ آج انھوں نے اپنی چہیتی مہر د کو خود اندھے کنویں میں دھکیل دیا ہے.....

مسرور نے ساری اطلاع جاکر مہرو کو دی اور وہ ہچکیاں لے لے کر روتی رہی۔ لڑکیوں کو اپنی قسمت کے معاملات میں جو دخل تھا سو اتنا کہ وہ خاموشی سے آنسو بہائیں ان کے والدین اور ولی وارثوں کو اختیار تھا کہ جس سے چاہیں ان کا پلہ باندھ دیں۔ ان کے فیصلے کے آگے لب ہلانے کی اجازت نہ تھی اور مہرو کی حالت ایک مجبور و زخمی اسیر پرندے کی سی تھی۔ رونمائی ہو جانے کے بعد معراج کی صورت دیکھ کر پرائے گھر جانے کے وہ پُر کیف خواب سب خاک میں مل گئے اور محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک بے زبان گائے کی طرح قصائی کی چھری تلے کھڑی ہے۔ خوابوں کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ حقیقت نے بے حوصلہ کر دیا اور اس نے اپنے مقدر سے چپ چاپ ہار مان لی۔ احساسِ شکست کے ساتھ ایک طرح کا سکون آگیا۔ اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ مجبوری کا دوسرا نام صبر ہے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

باہر جو ہنگامہ ہو اتھا اس کے مدوجزر کی زنانخانے میں بھنک بھی نہ گئی۔ ڈومنیاں سہاگ گاتی رہیں۔ بیویاں شادی میں شریک ہونے آئی تھیں۔ اس خوشی کی تقریب میں انھیں صرف اپنی زیب و زیبایش کی نمایش و نمود مقصود تھی جہاں وہ دوسروں کا اہتمام لباس دیکھ رہی تھیں اور اپنا دکھا رہی تھیں۔

آج بلقیس نے اپنا چوتھی کا سبز اور اودا جوڑا پہنا تھا۔ گلبدن کے کرنے دوپٹے میں اس کا کندن جیسا جسم چمک اٹھا تھا اور حسن تھا کہ پھوٹا پڑتا تھا۔ اس نے اونچی

ایڑی کی ولایتی جوتیاں جو اصغر نے تحفۃً لا کے دی تھیں پہن رکھی تھیں سسرال والیوں کی نظر جب اس کے ولایتی منڈدوں پر پڑی تو تلملا کر جلی کٹی سنانے لگیں،

"ہے ہے بھابو تم نے دیکھا اصغر میاں کی دلہن کو؟ باون گز او نچے موئے کافروں کے جوتے پہن رکھے ہیں"

"ہاں بی خوب دیکھے۔ ابھی تو تیل دیکھو اور تیل کی دھار دیکھو نئی روشنی کی ہیں۔ آسمان میں تھگلی لگائیں گی"

ایک بڑی بی جنھیں اصغر کو اپنا نواسہ داماد بنانے کی آرزو تھی جل کر بولیں،

"اے مرزا شہباز بیگ کی بیٹی سے اور کیا توقع ہوگی۔ بیوی ان کا تو پورے کا پورا گھرانا موئے فرنگیوں کی بیٹ کھا گیا ہے"

غرض بلقیس جدھر سے گزرتی زہر میں بجھی پھبتیاں سنائی دیتیں۔ دراصل وہ اس کو سنانے کے واسطے کہی بھی جا رہی تھیں۔ یہ طعنے اگر اس کی ذات تک محدود ہوتے تو خیر مگر اس کو اپنے باپ اور خاندان کا سن کر بہت کھلا۔ مگر پورا سسرال موجود تھا۔ کس کس کو جواب دیتی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تو آئے لیکن وہ اپنے کو ضبط کر کے پی گئی۔

مہر و وداع ہو چکی تھی۔ جانے والے مہمان چلے گئے۔ جو ٹھہرے وہ کھانا کھا کر جدھر جگہ ملی پڑ کر لمبی تانے سنا رہے تھے۔ بلقیس کا سارا لطف بیویوں کے طعنے سن سن کر کرکرا ہو گیا تھا۔ صبح سے سنتے سنتے اس کا دل پک چکا تھا اور جب رات گئے وہ کوٹھے پر گئی ہے تو اصغر اس کے انتظار میں ابھی تک جاگ رہا تھا۔ اصغر کو دیکھ کر وہ سبک سبک رونے لگی اور سب کی کہی ہوئی باتیں دوہرائیں اصغر کو بھی سن کر بہت برا لگا، لیکن سوائے بیوی کی دل جوئی کے وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا، اور کہنے لگا۔

"ارے چھوڑو۔ جاہلوں کی باتوں پر کان ہی کیوں دھرتی ہو۔ تم کو تو خوش ہونا چاہیے کہ تم پر اور تمہارے کپڑوں پر ان کو رشک آیا جب ہی تو جل جل کر تم کو سنائیں اور یہ بھی کچھ دن کی بات ہے۔ جیسے ہی مجھے ملازمت مل گئی۔ میں الگ گھر لے لوں گا جہاں ہم دونوں مل کر اطمینان سے ہنسی خوشی رہیں گے، چلو اب تو ہنس دو۔" اور وہ اس کو گدگدانے لگا۔ بلقیس روتے روتے مسکرا دی۔

۵

اصغر نے کئی جگہ درخواستیں دے رکھی تھیں مگر ابھی تک کوئی قابلِ قبول ملازمت نہ مل سکی تھی، اور وہ اسی چکر میں پریشان اور سرگرداں نظر آتا۔ حبیب الدین نے اس کو متفکر دیکھ کر ایک دن کہا:

"بھئی کہو تو میں ڈپٹی کمشنر سے تمہارے متعلق گفتگو کروں۔ میرے ان سے اچھے مراسم ہیں۔ ویسے میں پولیس کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کو بھی بخوبی جانتا ہوں اور ان کی سفارش سے تمہیں پولیس کے محکمہ میں اچھی نوکری مل سکتی ہے۔"

لیکن اصغر کو سرکاری ملازمتوں میں قطعی دلچسپی نہ تھی اور اس نے جواب دیا:

"نہیں آغا بھائی، میں سرکاری نوکری سرے سے کرنی ہی نہیں چاہتا۔ کون اپنی خودداری گنوائے اور افسروں کی جی حضوری میں ہاتھ باندھے کھڑا رہے۔ مجھ سے تو کسی کی چاپلوسی ہوتی نہیں۔ دوسرے ساری عمر خانہ بدوشوں کی طرح خاک چھانتے پھرو۔ آج یہاں اور کل وہاں چھوٹی چھوٹی تحصیلوں میں تعینات ہو کر قصبوں میں رہو جہاں نہ کوئی

ملنے جلنے والا نہ دوست احباب، اور ملازمت کے بعد پنشن کے وہی ڈھاک کے تین پات لے کر گھر بیٹھ جاؤ۔"

اس پر حبیب الدین بولے:

"میاں آج چاہے کوئی اعتراض کرو مگر بعد میں سرکاری ملازمت نہ کرنے پر پچھتاؤ گے۔ سرکار کا نمک خوار ہو کر کم از کم رعب داب، عزت، اثر رسوخ تو ہوتا ہے۔ پھر مستقل بندھی بندھائی آمدنی گھر بیٹھے آتی رہتی ہے۔"

اصغر نے کہا:

"جی نہیں۔ میں تو اپنا ہی کوئی دھندا شروع کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم نہیں آج کل تجارت میں بڑھنے کے زیادہ موقعے ہیں۔ اور ایک دفعہ کام جم جائے تو روپیہ بھی بہت ہے۔"

حبیب الدین یہ سن کر چپ ہو رہے۔

اصغر اور باری دونوں سے ساتھ مل کر الگ کاروبار کرنے کی فکر میں تھے اصغر کو نفیس لباس کا شوق تھا اور وہ ہمیشہ عمدہ سلے ہوئے کپڑے پہنتا بھی تھا۔ لہٰذا باری سے ایک دن کہنے لگا:

"یار! میرے خیال میں درزی کی دوکان اچھی رہے گی۔"

باری اس پر بولا:

"میاں نہ تم درزی نہ میرا باپ درزی۔ کپڑے کتر بیونت کون کرے گا؟ اور درزی تو نانی کے کفن میں سے بھی چرا کر ٹوپی سی لیں۔ ہاں کچھ اور سوچو۔"

اصغر نے دماغ پر زور ڈالا اور سوچ کر کہا:

"ہاں کہتے تو ٹھیک ہو۔ پھر جوتوں کی تجارت موزوں رہے گی۔ بنے بنائے ولایتی جوتے منگوا لیا کریں گے۔"

باری نے یہ سن کر بھرپور قہقہہ لگایا اور جواب دیا:

"واہ میرے یار۔ جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی۔ حضرت کیا شاہ بڑے پر بھنگ گھونٹ کر دم لگانے لگے ہو جو دماغِ عالی اونچی اڑان کر رہا ہے۔ میاں گراہکوں کے سڑے بھسے گندے پاؤں میں جوتے تم پہنایا۔ یار خاں تو حاجی جی بنے شان سے گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے رہیں گے۔ البتہ اگر کوئی آ گیا سجیلا چٹ پٹا تو اپنے پیر پر پٹاخ سے ہاتھ مار کر مفت جوتا پہنوا دیں گے۔"

اس پر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے اور یہ تجویز بھی آئی گئی ہوئی۔ اسی طرح تمام تجویزیں ادھوری رہ جاتیں اور دونوں اِدھر اُدھر ٹاپک ٹوئیاں مارتے اور عقل کے گھوڑے دوڑاتے۔ دونوں ناتجربہ کار تھے۔ محض زبانی جمع خرچ تو آتا تھا لیکن حقیقتاً کوئی کام کبھی عملاً نہ کیا تھا۔ کئی ایک بیوپاریوں سے تجارت پر گفتگو ہوئی بھی مگر ہر ایک نے کچھ اس قدر ہیر پھیر کی بتلائی کہ دونوں نے عاجز آ کر تجارت کا خیال سرے سے چھوڑ ہی دیا۔ لیکن اصغر کو ایک دیسی کمپنی میں اچھی شرائط اور معقول تنخواہ پر ملازمت مل گئی جو مرزا شہباز بیگ کے ذاتی اثر اور کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اصغر خوش تھا کہ ساری سوئیاں نکل گئیں اور بلقیس اس خیال سے خوش تھی کہ اب اس کا اپنا گھر الگ ہو جائے گا۔

بلقیس کو اَن گنا مہینہ لگ چکا تھا۔ بیگم نہال تو یہی چاہتی تھیں کہ بہو کی پہلی زچگی سسرال ہی میں لیکن سمدھن اور بیٹے کی ایما یہ تھی کہ بچہ میکے میں ہو۔ لہٰذا بیگم نہال نے جو چھوٹے موٹے سوزنیاں نہالچے اور کرتے ٹوپی سیے تھے وہ سب بقچی میں باندھ کر بہو کے حوالے کر دیے۔ اور بلقیس اپنی ماں کے ہاں چلی گئی۔

شہباز بیگم نے ستھورا پنجیری بنوا کر اپنے کنبے اور سمدھیانے میں حصے بھجوا دیے جمال بیگم نے ستھورا کھایا اور اسی شام کو جب نیچے اُتر کر آئیں تو بیگم نہال سے کہا:

"بی مجھے تو معلوم ہوتا ہے تمہارے اللہ رکھے پوتی ہوگی۔ سٹھورا بڑے مزے کا ہے"
اس پر بیگم نہال بولیں:
"اے بوا پوتا ہو یا پوتی، اللہ کی دین ہے۔ بس اللہ بھاگوان کرے اور نصیبہ والا ہو۔"

اس بات کو دو روز ہی ہوئے ہوں گے کہ دلچین نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے آکر بیگم نہال سے کہا:
"بیگم صاحب جلدی کیجیے۔ اللہ رکھے دلہن بیوی کے درد لگ گئے ہیں۔ ان کی اماں نے ڈولی بھیجی ہے آپ کے واسطے۔"
بیگم نہال یہ سنتے ہی جس طرح بیٹھی تھیں اسی طرح اُٹھ کھڑی ہوئیں اور سارے راستے وہ اپنی بہو کے لیے دعائیں مانگتی رہیں۔
پہلوٹھی کا بچہ تھا۔ بلقیس کو ٹھہر ٹھہر کر درد اُٹھتے اور وہ تکلیف سے چیخیں مارتی اور اس کی ہر چیخ پر اصغر بے چین ہو ہو جاتا۔ عورت کی زندگی میں یہ کتنی کٹھن گھڑی ہوتی ہے، مگر بلقیس آسانی سے فارغ ہوگئی اور بیگم شہباز اور بیگم نہال ایک دوسرے کو مبارک باد دیتی ہوئی دالان میں آکر بیٹھ گئیں۔ چنبیلی نے اصغر سے کہا:
"مبارک ہو میاں چاند سی بیٹی کے ابا ہوگئے۔"
وہ بیٹی ہونے کی خبر سن کر مایوس ضرور ہوا کیونکہ اس کو بیٹے کی ولادت کا پورا یقین تھا، لیکن خیر وہ کشمکش تو ختم ہوگئی۔ دائی نے بچی کے ناف کاٹ کر پھیری اور بیسن سے نہلا دُھلا کر رضائی میں لپیٹ دادی کی گود میں لاکر ڈال دیا۔ وہ نہال ہو رہی تھیں اور پوتی کو کلیجے سے لگا کر سمدھن سے پوچھا:
"اے بی اذان کون دے گا؟"
"اس کے نانا دیں گے۔" اور شہباز بیگم اٹھ کر شہد کی شیشی اٹھا لائیں اور

نواسی کو لے کر صحنچی میں چلی گئیں جہاں مرزا شہباز بیگ لیٹے ہوئے تھے۔ مرزاجی بیمار تو کافی عرصے سے تھے مگر کچھ دنوں سے تو وہ چل پھر بھی نہ سکتے تھے۔ انھوں نے نواسی کے کان میں اذان کہہ کر شہد چٹا دیا۔ بچی نے ذرا سا منہ کھولا، پہلے تو شہد چاٹ لیا اور اس کے بعد بُرے منہ بنا بنا کر رونا شروع کر دیا۔

دائی بلقیس کو صاف ستھرا کر کے آرام سے لٹا چکی تھی۔ پان کلّے میں دبا کر بچّی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"اللہ قسم صبح سے یہ وقت ہو گیا۔ اتنے میں تو محلّے بھر کو جنا دیتی۔ یہ لڑکیاں بہت ہلکان کرتی ہیں۔"

اور وہ برقعہ سر پر ڈال کے جانے کو کھڑی ہو گئی — "کل تڑکے آؤں گی۔ زچّہ کو کچھ کھلانا پلانا نہیں۔ بس ملکو کا عرق دینا۔" پھر چلتے چلتے اصغر سے بولی:

"میاں تم سے ایک ریشمی جوڑا اور سونے کے کڑے لوں گی۔"

اصغر کو جب کمرے میں جانے کی اجازت ملی تو بلقیس اُجلے اُجلے اور صاف ستھرے بچھونے پر کامدانی کی اودی رضائی اوڑھے لیٹی ہوئی تھی اور اس کے سر پر ریشمی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اودے رنگ میں اس وقت اس کا چہرہ کوری ململ کی طرح سفید نظر آ رہا تھا۔ اصغر کو دیکھ کر وہ مسکرائی اور اس کی مسکراہٹ میں محبت سے زیادہ ماں بن جانے کی خوشی تھی۔ اصغر ہلکے سے پٹی پر بیٹھ گیا۔ بلقیس نے اپنے نازک ہاتھ میں اس کا ہاتھ لے لیا اور گرمجوشی سے دبایا۔ اصغر اس کی پیشانی کو چومنے جھکا اور اس کا دل اچانک مضطرب ہو کر دھڑکنے لگا۔ باپ بن جانے کا احساس کتنا عجیب تھا اور یہ جذبہ کتنا انوکھا۔

خبر ملتے ہی ہیجڑے اور بھانڈ زور زور سے تالیاں بجاتے، "اے اللہ کی امان، میں واری میں صدقے زچّہ بچّہ کی خیر" کرتے ہوئے آ گئے، اور مٹکتے

ہوئے ترچہ گیریاں گانی شروع کردیں۔ رک رک کر درمیان میں ایک کہتا: "اے نانی پیاری کو بلاؤ۔ نواسوں والی ہوں، آج تو سونے کے کنگن پہنوں گی۔ اے صدقے گئی دادی اماں کو بلاؤ۔ سوا سو بیل لوں گی"۔ اور پھر زچہ بچّہ کی نقلیں اتارتے ایک کھڑا ہو کر ڈھولک پیٹتا اور ایک گھونگھٹ نکال کر بے ڈھنگے پن سے اونگے بونگے پیر اُٹھا اٹھا کر چھم چھم ناچتا اور باقی مل کر اپنی مردانی بھونڈی آوازوں سے پوری قوت سے گلے پھاڑ کر گاتے۔ لونڈے لاری جمع ہو گئے۔ اور محلے کی عورتیں دیواروں پر چڑھ چڑھ کر اپنی چھتوں سے ان کا تماشا دیکھنے لگیں۔ بیگم نہال نے آخر بیس روپے بیل دے کر ان کو رخصت کیا۔

چلّہ نہانے تک بلقیس کے کمرے میں ہر وقت کالے دانے کی دھونی جلتی رہتی اور دھواں اندر بھر کر باہر تک پھیل جاتا۔ کالے دانے سے بچی کی پیشانی پر بھی نندر گزر کی ٹیکی لگا دی جاتی اور وہ ماں کے گرم گرم پہلو میں بے خبر سوتی رہتی۔ بلقیس کبھی کبھی اس کے ریشم جیسے بالوں پر مہر و محبت سے ہاتھ پھیرتی، بچی کلبلاتی چھوٹے چھوٹے ہاتھ پیروں کو مروڑ کر انگڑائیاں لے کر منا سا منہ بسورتی اور بلقیس جلدی سے اس کے منہ میں دودھ دے دیتی اور جب بچّی کے گرم اور ملائم لب بند ہوتے اور کھلتے اور چھاتیوں سے دودھ کی دھار کھنچتی تو ایک عجیب سی سنسنی اس کے سارے جسم میں دوڑتی ہوئی ریڑھ کی ہڈی کے مہروں میں جا کر ختم ہو جاتی اور بلقیس ماماتا کے جوش میں دوسرا ہاتھ بچی پر رکھ کے مطمئن ہو کر سو جاتی۔ ماں بن جانے کے بعد کتنا روحانی سکون اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔

نور تن اور گود بھرائی ہو چکی اور بلقیس چلّہ نہالی تو وہ پاؤں پھیرنے اپنی بچی جہاں آرا کو لے کر میکے سے سسرال آ گئی۔ مرزا شہباز بیگ کی طبیعت زیادہ بگڑتی جا رہی تھی اور وہ پلنگ سے لگ گئے تھے۔

اتنے میں بقر عید سر پر آ گئی۔ گلی میں ہر دروازے کے سامنے بکرے دُنبے اور مینڈھے بندھے ہوئے تھے اور محلے میں چاروں طرف سے بکروں کے بھیں بھیں کرنے کی کرخت آوازیں آتیں۔ میر نہال عید سے پندرہ دن پہلے خود چوک جا کر قربانی کے لیے دُنبے لے آئے۔

عید کی صبح کو میر نہال، اصغر اور مسرور نماز پڑھنے چلے گئے، اور واپس آ کر قربانی کی۔ تین دن تک جو ہر گھر میں قربانیاں ہوئیں تو نالیوں میں خون بہہ بہہ کر ناگوار سڑاند اُٹھنے لگی۔ جگہ جگہ موریوں کے کنارے اوجھڑیاں اور آلائش نظر آتی اور بکروں کی کھالوں کے ڈھیر دکھائی دیتے۔ چماریاں دست اور رانوں کے حصے گھر گھر لاتی لے جاتی دکھائی دیتیں۔

چونکہ مرزا شہباز بیگ کی حالت نازک ہو گئی تھی اور چل چلاؤ معلوم ہوتا تھا لہٰذا عید کے دوسرے روز ہی بیگم نہال نے بہو سے کہا:

"بیٹی خیر سے تم اپنی ماں کے ہاں چلی جاؤ تمہارے ابا کی طبیعت خراب ہے۔"

اور عید کے چوتھے روز فجر دم اذان کے وقت مرزا شہباز بیگ اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔

بیگم نہال اور بیگم جمال ان کے انتقال کی خبر سن کر پُرسے کو پہنچیں۔ اصغر کفن دفن کے انتظام میں باہر ہی باہر پھر رہا تھا۔

بلقیس کی چھوٹی بہن زہرا کے پاس یہاں آ رہی تھی اور میرزا شہباز بیگ کی بیوی صحنچی میں پیٹھ موڑے بیٹھی ہوئی بیوڑی کچوری کا ناشتہ کر رہی تھیں۔ پُرسے کو آنے والے خاموشی سے جا جا کر دالان میں بیٹھ جاتے۔ جلدی جلدی ناشتے سے فارغ ہو کر شہباز بیگم نے ہاتھ منہ صاف کیا اور سب کے پاس آ کر بیٹھ گئیں، اور بیویوں کے ساتھ مل کر اپنی بیوگی پر رونے اور اپنے سہاگ اجڑنے پر ماتم کرنے لگیں۔

بلقیس پر البتہ بہت اثر تھا اور وہ پچھاڑیں کھا رہی تھی.....

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

مرزا شہباز بیگ کا چالیسواں ہوتے ہی اشفاق کلکتہ چلے گئے۔ ان کا جانا ازبس ضروری اس لیے تھا کہ مرزا جی کا اصل کاروبار کلکتہ میں پھیلا ہوا تھا اور جب وہ حیات تھے تب بھی اشفاق ہی اس کے کرتا دھرتا تھے۔ بندو تو باپ کے انتقال کے ہفتہ بھر بعد ہی رام پور چلا گیا جہاں اس کو ملازمت مل گئی تھی۔ اب لے دے کر مردوں میں اصغر ہی رہ گیا تھا جو مرزا شہباز بیگ کے مرنے کے بعد ان کی بیوی کی خبر گیری کرتا اور گھر بار سنبھال سکتا۔ چنانچہ اس نے ساس کی دیوار سے ملحق جو مکان تھا وہ کرایہ پر لے لیا اور اپنے نئے گھر کو حسب ذوق مغربی طرز پر سجایا، جو وہ میر نہال کے ڈر سے ان کے گھر میں نہ کر سکتا تھا۔ میز کرسیاں خریدیں، پردے لٹکائے، دیواروں پر مناظر کی تصویریں۔ میزوں اور کارنس پر گلدان رکھے اور سگریٹ کی راکھ دانیاں۔

اپنے نئے گھر کی الٹ پلٹ اور اس کو جمانے سجانے میں بلقیس باپ کی جدائی کو ایک حد تک بھول گئی۔ اصغر تو صبح ناشتہ کر کے دفتر چلا جاتا اور بلقیس بیچ کی دیوار کی کھڑکی کھول کر جو ماں اور بیٹی کے گھروں کو ملاتی تھی اور دونوں میں ادھر سے ادھر آنے جانے کے لیے راستے کا کام دیتی تھی، اپنی بچی کو لے کر ماں بہن کے پاس چلی جاتی اور اصغر کے لوٹنے کے وقت سے گھنٹہ آدھ گھنٹہ پیشتر اپنے گھر آجاتی۔ کنگھی چوٹی کر کے نیار ہوتی اور شام کی چائے اور رات کے کھانے کا بندوبست کرتی۔

شام کو اکثر اصغر کا کوئی نہ کوئی ملاقاتی آجاتا۔ کبھی کبھی کبیر الدین اور حبیب الدین کے بچے چچا کے سلام کو آجاتے۔ نسیم اب چھٹے برس میں تھا اور مکتب میں بٹھا دیا گیا

تھا۔ ملقیس بچوں سے باتیں کرتی۔ ان کو چھوٹے موٹے کھلونے اور بسکٹ مٹھائی دے دیا کرتی جس سے وہ خوش ہو جاتے۔ کبھی اصغر کی طبیعت حاضر ہوئی اور چچا بننے کی موج آئی تو ساتھ لے جاکر رنگین منیلیں اور کاپیاں دلوادیں۔

ایک دن اتوار کو اصغر ابھی سو کر اٹھا ہی تھا کہ سعید حسن آگئے۔ انھوں نے کنڈی کھٹکھٹا کر کہا: "میں ہوں سعید حسن" اور اصغر جلدی سے اپنا عنابی رنگ کا پھولدار ریشم کا ڈریسنگ گاؤن پہن کر ان کی پیشوائی کو آیا۔ سعید حسن آج بھی ہمیشہ کی طرح چونچال تھے۔ مہرو سے انکار ہو جانے پر نہ وہ مایوس ہوئے اور نہ شادی کا شوق کم ہوا تھا۔ بلکہ ہر رشتے کنبے والوں کے ہاں جہاں بھی شادی کے قابل کوئی لڑکی ہوئی اپنا پیغام بھجوا دیا کرتے۔ آج کل انھوں نے میر نصیر الدین کی بیٹی ثریا کے واسطے رقعہ بھیج رکھا تھا۔ جوں ہی ان کی نظر اصغر کی بھڑکیلی ڈریسنگ گاؤن پر پڑی تو وہ اس وضع کے لباس کو دیکھ کر چونکے اور کہنے لگے:

"بھئی یہ چغہ تو بہت عمدہ پہنے ہوئے ہو۔ کہاں سے لیا؟"

اصغر نے ان کو ملاقاتی کمرے میں لاکر بٹھاتے ہوئے جواب دیا:

"للہ چغہ کہہ کر اس کی توہین نہ کیجیے، یہ ڈریسنگ گاؤن ہے، ڈریسنگ گاؤن چغہ نہیں۔"

سعید حسن ڈریسنگ گاؤن کے کالر کو ہاتھ پھیر پھیر کر دیکھنے اور اس کی تعریفیں کرنے لگے۔ بیٹھنے کے بعد سعید حسن نے اطمینان سے پورے کمرے پر نظر ڈالی اور ہر چیز کا جائزہ لیا۔

"اخاہ یہ ٹھاٹھ ہیں۔ بالکل صاحب بہادر بن گئے۔" پھر تھوڑی دیر تک چپ رہنے کے بعد پوچھنے لگے:

"کیوں صاحب آپ نے بڑے میاں کو بھی چھٹی دے دی اور بڑی بی کو

بھی رخصت کر دیا ہے۔"

"کون سے بڑے میاں، دولہا بھائی میں سمجھا نہیں۔" اور سعید حسن ایک تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے۔ تجاہلِ عارفانہ سے کہنے لگے:

"میاں وہی بچارے بزرگوار تخت اور بیچاری چاندنی۔ اب تو تمہارے کمرے میں میم صاحب کا راج معلوم ہوتا ہے۔ دیکھو ان کی سہیلی بی کرسی کس شان سے کونے میں بیٹھی ہیں۔"

اصغر نے کونے والی کرسی کو دیکھا اور اسے سعید حسن کی باتوں پر ہنسی آ گئی۔

"تو آپ کو اس سے کیا بغض ہے آخر؟"

"نہیں بھئی۔ مجھے نہ کسی سے بغض ہے نہ عناد۔ بس اب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم کنوئیں سے نکل گئے۔ ولایت کی ہوا لگ گئی۔ تھوڑے دنوں میں تم ہم سے گٹ پٹ گٹ پٹ کرو گے۔ خیر۔ چلو تم فیشن ایبل جنٹلمین تو بن گئے۔"

"نہیں دولہا بھائی میں بچارا غریب آدمی ہوں، جو تھوڑا بہت کمایا کچھ کھایا پیا کچھ اوڑھ لیا کچھ بچھا لیا۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔" مگر وہ اس خیال سے جی ہی جی میں خوش تھا کہ یہ سب چیزیں ان کی نظر میں تو آ گئیں۔

سعید حسن نے ٹہل ٹہل کر سجی ہوئی چیزیں اٹھا اٹھا کر دیکھیں، دیوار کی تصویروں کا بہ غور معائنہ کیا اور حد ہے کہ کرسیوں کے اسپرنگ اور گدّے تک ٹٹولے اور پھر بیچ بیچ کرتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور کافی دیر تک اصغر کو افسوس اور ملال سے دیکھتے رہے، پھر ایک لمبی اور افسردہ آہ بھر کے کہنے لگے:

"میاں اللہ تم کو یہ سب سامان برتنا نصیب کرے۔ مگر سچ پوچھو تو یہ ولایتی چیزیں دیکھ کر بڑی تکلیف ہوئی۔ ہم لوگ زمین پر سادگی سے بیٹھنے اٹھنے والے اُجلی اُجلی چاندنیاں، جاجم اور گاؤ تکیہ استعمال کرتے تھے اس رہن سہن میں ایک

اداسی اور پھر اس کے کارآمد پہلو تو دیکھو۔ وہ دنیا جہاں کا کونسا کام تھا جو ہم نیچے بیٹھ کر نہ کرتے تھے۔ کھانا پینا، سونا سلانا، اٹھنا بیٹھنا۔ زمین پر ہی جنم لیتے تھے اور زمین پر ہی مر جاتے تھے۔ اب تو ہم لوگ اپنی ساری اچھی باتیں چھوڑتے جا رہے ہیں۔ ہماری تو وہی کہاوت ہے: کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ معلوم ہوتا ہے دنیا سے رسم وفا اٹھتی جا رہی ہے اور سادگی اور وضع داری تو جیسے ناپید ہو گئیں۔"

اور یہ کہہ کر میر عاشق کا قصہ سنانے لگے جن کے نام پر آج تک کوچہ میر عاشق مشہور ہے:

"بچارے بزرگ آدمی تھے۔ چتلی قبر پر رہا کرتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ روزانہ چہل قدمی کو جامع مسجد سے چاندنی چوک جاتے تھے۔ اور لال کنویں اور چاوڑی سے ہوتے ہوئے گھر واپس آتے تھے۔ وقت کے اتنے پابند تھے کہ گھنٹہ گھڑیاں ملا لو۔ ایک ثانیہ جو کبھی ادھر سے ادھر ہو۔ اور راستے میں چند مقام ایسے تھے جہاں وہ گنے گنائے لمحوں کے لیے رکتے۔ جہاں جس کے لیے جتنی دیر پہلی بار تھم گئے زندگی بھر اتنی ہی دیر وہاں ٹھہرتے اور ان کے معمول میں فرق نہ آتا۔ وضع داری کا تو یہ عالم تھا کہ نہ پوچھو۔ بس اگر کسی سے مڈبھیڑ ہو کر یاد اللہ ہو گئی ہے یا سلام کر لیا ہے چاہے وہ شخص وہاں موجود ہو یا نہ ہو یہ سلام کرتے ہوئے یا سلام کا جواب دیتے ہوئے گزر جاتے یا کچھ دیر کو تھم جاتے۔

لال کنویں پر کچھ کھٹلوے بیٹھے رہا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ان کو دل لگی سوجھی کہ میر عاشق کو کسی طرح روک کر ان کے معمول میں فرق ڈالا جائے۔ ایک بولا یہ کونسی بڑی بات ہے، کل ہی لو جب وہ ادھر سے گزریں گے، ہاتھ نہ ملایا ہو تو اپنے باپ کا نہیں۔ اور دوسرے دن حسب معمول مقررہ وقت پر جب وہ گزر رہے تھے یہ لڑکا ان کی طرف بڑھا مگر ان کا وہ دغدغہ تھا کہ اس کی ہمت نہ ہوئی کہ ہاتھ ملاتا، اور

میر عاشق اپنی دھن میں آگے نکلے چلے گئے۔ یہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اور اس کے دوستوں نے کہا: ابے جا بڑا تیس مار خاں بن رہا تھا، ملالیا ہاتھ؟ اس لڑکے کو بھی ضد آگئی تھی بولا: اگر کل نہ ہاتھ ملایا ہو تو مونچھیں منڈوا دوں گا۔ اگلے روز میر عاشق کو جیسے ہی دیکھا یہ لونڈا بڑے زور سے چلایا: دُہائی ہے میر عاشق کی میر عاشق نے جو نہی سنا کہ کوئی ان کا نام لے کر دہائی دے رہا ہے فوراً رُک گئے۔ لڑکے نے کیا کیا، ان کے رکتے ہی جلدی سے ہاتھ پھیلا کر میر عاشق کی طرف دوڑا اور مدد کے خیال میں میر عاشق نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ لڑکے نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور السلام علیکم کہا۔ میر عاشق نے وعلیکم السلام کہا اور آگے بڑھ گئے۔ لڑکا اکڑتا ہوا اپنے ساتھیوں میں جا ملا۔ بات آئی گئی ہوئی۔

"اتفاق سے اس لڑکے کی کچھ لوگوں سے ناچاقی ہو گئی اور نوبت مارنے مرنے تک پہنچی۔ حریفوں نے کہا اگر ہے تیرا کوئی حمایتی تو بلالے، ہم دیکھ لیں گے۔ جب میر عاشق کے کان میں یہ خبر پڑی فوراً سر پہ کفن باندھ قرولی سونت اس لڑکے کی مدد کو میدان میں آگئے۔ لیکن بھلا کسی کی مجال تھی کہ ان سے آنکھ اٹھا کر بھی بات کرتا.....

"تو میاں ایسے وضعدار لوگ تھے اور ایسی وضعداریاں۔ ایک ہم لوگ ہیں تھالی کا بینگن، ایک وہ لوگ تھے کہ اگر کسی کو ایک بار دوست کہدیا تو مر کے بھی دوست رہے۔ افسوس!"

اصغر کو سعید حسن کے دوشالے میں لپٹے ہوئے طنز سے اذیت پہنچ رہی تھی لیکن نہ سعید حسن ہی اپنی خو بدل سکتے تھے اور نہ اصغر ہی اپنی وضع چھوڑ سکتا تھا۔ ہر نئی چیز کو لوگ شبہ کی نگاہ سے دیکھتے اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اصغر کو خود اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔

۶

جس طرح چاند سورج منزلوں پر منزلیں طے کرتے اور زمین مدار پر گھومتی رہتی ہے اور ستارے سفر کر کے اپنے اپنے بُرج میں آ جاتے ہیں، اسی طرح ہر مہینہ اپنے مقررہ وقت پر آتا اور چلا جاتا یہاں تک کہ ۱۹۱۲ء ختم ہو کر ۱۹۱۳ء کا آغاز ہو گیا
گزشتہ سال دسمبر میں برٹش انڈیا کے وائسرائے بہادر لارڈ ہارڈنگ نے اپنا اقتدار بڑھانے کو دلّی میں ایک نقلی دربار منعقد کیا تھا۔ اس موقع پر کسی نے ان پر بم پھینکا مگر ابھی انگریزوں کا اقبال عروج پر تھا اور وہ بال بال بچ گئے۔ لیکن اس حادثہ کے بعد تو ملک بھر میں طرح طرح کی شورشیں سر اٹھانے لگیں۔ صوبہ بنگال سے خاص طور پر تخریبانہ کارروائیوں کی آئے دن اطلاعیں آنے لگیں اور وہاں دہشت پسندوں کا زور جڑ پکڑنے لگا۔ نہ صرف بنگال ان کی سرگرمیوں سے متاثر تھا بلکہ شدہ یہ اثر دوسرے صوبوں میں بھی سرایت کر رہا تھا۔

انگریز چاہے کتنے ہی دانا و زیرک کیوں نہ رہے ہوں اور چاہے ان کی قسمت کتنی ہی یاوری کیوں نہ کرتی رہی ہو، مگر یہ حقیقت تھی کہ لوگ اب ان کی

حکومت سے نالاں ہو چکے تھے، اور ایک عام بے چینی سارے ملک میں پھیلتی نظر آتی تھی۔ لوگ انگریزی دور سے شاکی ہو کر تری تری پکارنے لگے تھے۔ یوں تو اس کی وجوہ کئی تھیں لیکن سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ رعیت پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکارا ہو چکی تھی کہ انھوں نے عنانِ حکومت سنبھالتے وقت جو وعدے وعید کر کے سبز باغ دکھائے تھے دراصل ان کی اصلیت کچھ نہ تھی اور فرنگیوں کے بچھائے ہوئے سنہری دام کی ظاہری چمک دمک اور اوپری ٹیپ ٹاپ جس سے لوگ مرعوب ہو گئے تھے اور بہت سی امیدیں وابستہ کر لی تھیں سر بہ سر فریب جلوہ تھی اور حصولِ ملک اور اپنی دولت و قوت اور شوکت بڑھانے کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اب ہندی رعایا کے وہ سارے خوابِ خوش حالی تقریباً مٹ چکے تھے۔ امن چین کی امیدیں ٹوٹ گئی تھیں۔ دلوں میں اندیشے بڑھ گئے تھے۔ ہر دم آئندہ مشکلات کا دھڑکا تھا۔ آنے والی کٹھن گھڑیوں کے کھٹکے سے قلوب میں ہل چل تھی اور ذہنوں میں پریشان خیالی کے سوا کچھ نہ تھا۔ عام پیشگوئی یہ تھی کہ اب انگریزوں کا زوال قریب آ گیا ہے اور ۱۹۱۱ء جو انگریزوں کی حکمرانی کا نقشِ اوّل تھا اور دورِ عروج، اسی برس میں ان کے استحکام میں دراڑ پڑ گئی تھی۔

دلّی میں بھی اندرونِ شہر میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہو رہا تھا۔ وہ بدرَو جو مغلوں کے زمانے سے اب تک زمین دوز چلی آتی تھیں ان کو پاٹ پاٹ کر اس قدر اُتھلا کر دیا تھا کہ گندہ پانی کناروں تک بھرا رہتا اور آلائش ان کے دہانوں سے لگی ہوئی سڑا کرتی۔ محلوں گلی کوچوں میں ناک نہ دی جاتی۔ یہ بھی دلّی والوں نے ٹھنڈے دل سے برداشت کر لیا تھا۔ لیکن جب چاندنی چوک کو چوڑا کیا گیا اور اس کے وہ کہنہ سال پیپل کے درخت جو شاہراہ کے عین وسط میں قطار در قطار صدیوں سے بڑے وقار سے ہرے بھرے کھڑے تھے، کاٹ دیے گئے تو

اُن کے دلوں پر آرے سے چل گئے۔ ان کے خیال میں بازار کی شان ان ہی بلند و بالا درختوں سے تھی۔ ان کی ٹھنڈی ٹھنڈی گھنی چھاؤں میں سینکڑوں انسان آندھی پانی اور برق و باد سے پناہ لیتے تھے۔ ہزاروں دھوپ اور لو سے محفوظ ہو جاتے تھے۔ ان کا سایہ لاوارثوں کا آسرا اور بے ٹھکانوں کا ٹھکانہ تھا۔ اور پھر ایک بچھڑے ہوئے زمانے کی یاد ان کی تر و تازگی میں باقی تھی۔ نظریں انھیں دیکھنے کی عادی تھیں آنکھ کھولتے ہی انھوں نے ان پیڑوں کو دیکھا تھا۔ اور وہ کاٹ کر نیست و نابود کر دیئے گئے تھے۔ دلّی کی ساری خوبصورتی ملیامیٹ ہو گئی تھی۔

شہر کے باہر ترکمان اور دلّی دروازے سے پرانے قلعہ اور فیروز شاہ کے کوٹلے تک ایک نئی دلّی کی داغ بیل ڈالنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اہلِ دہلی یہ نئے رنگ ڈھنگ دیکھ بھی رہے تھے اور محسوس بھی کر رہے تھے۔ وہ خطۂ خاک جسے وہ دلّی کہتے تھے صرف ان کا تھا اور ان کو اس سے وہی محبت تھی جو کسی بلبل کو چمن سے ہوتی ہے۔ اور اب دستِ صیاد اس چمن کے نقشے بدل رہا تھا۔ وہ ارضِ وطن جہاں وہ پیدا ہوئے پلے بڑھے اور جوان ہوئے تھے، جس کا چپّہ چپّہ ان کا ہمدم اور رفیق تھا، جس کے در و دیوار ان کے انیس و ہمراز تھے اب اجنبی ہوتی جا رہی تھی۔ سنگ و خشت کے یہ سقف و بام گونگے ضرور تھے مگر اندھے اور بہرے نہ تھے۔ انھوں نے دلّی والوں کا ہر موقع پر ساتھ وفا سے دیا تھا۔ یہ محراب و مینار ان کے ساتھ ہنسے تھے، ان کے ساتھ روئے تھے۔ دلّی کا ذرّہ ذرّہ اپنے باسیوں کی نس نس سے واقف تھا۔ یہاں کے موسم ان کے مزاج داں تھے۔ اور ہوائیں ان کی نبض پہچانتی تھیں۔ یہاں ان کے عزیزوں کے عزیز مدفون تھے، ان کے آبا و اجداد کی ہر فرد دلّی کی گلیوں میں حیات و موت سے کھیل کر اسی سرزمین میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سو گئی تھیں۔ یہ ان

کی جدّی میراث تھی، ان کے جدِ امجد اسی کی راہوں پر جیتے تھے اور اسی کی راہوں پر مٹے تھے اور اس مٹنے میں حیاتِ جاودانہ کا مزا پایا تھا۔ دلّی ان کا حسین خواب تھی اور ان کے خواب کی روشن تعبیر بھی۔ اور اب وہ خواب باطل ہو جائیں گے۔

نئی دلّی کے معنی ان کے نزدیک ایک نیا زمانہ، نئی زندگی اور ایک نئی ڈگر تھے۔ گویا بچے کھچے اور پرانے آثارِ ہستی گم گشتہ بہاروں کے ہم نشیں ہو جائینگے اور قدیم دلّی والوں کی زندگیوں کا حساب بے باق ہو جائے گا اور یہاں وہ لوگ آباد ہو جائیں گے جو اس کی تاریخ سے نابلد ہیں۔ جنہوں نے اس کا دورِ شباب دیکھا اور نہ دورِ خزاں، جن کو اس سے ہر عنوان نہ کوئی تعلق تھا نہ قرب۔ جب سے انگریزوں نے سریر آرائے سلطنت ہو کر دلّی کو اپنا دار الخلافہ قرار دیا تھا ہندوستان کے دور دراز صوبوں سے لوگ آنے لگے تھے اور ان قماش قماش کے پردیسیوں کا طرزِ زندگی جدا تھا، فطرت جدا تھی، ان کی بود و باش، ان کا رہن سہن الگ تھا اور بول چال مختلف۔ ان کو دلّی کی روایات سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا اور ان جدا تہذیبوں اور الگ تمدن کا اثر دلّی پر ہونا لازمی تھا۔ اس کا وہ محاورہ اور اصطلاح، بول چال کی نزاکت و سلاست جس میں دلّی ہمیشہ برتر رہی ہے؛ زبان کی وہ شوخی و رنگینی اور کنائے کے لوچ اور لطافت جن پر اس کو ہمیشہ ناز رہا تھا اب جو لا بدل لے گا اور ان کی اچھوتی تہذیب اور عصمت مآب ادائے زندگی داغدار ہو کر وہ حسن و عفت، نفاست و یکتائی جس پر برس ہا برس سے دلّی والوں کو کبر و ناز تھا۔ آخری سانس لے کر دم توڑ دے گی گو وہ خود کبھی کبھی اس سے بیزار ہو کر بے اختیارانہ پکار اٹھتے ہیں:

ہائے دلّی وائے دلّی بھاڑ میں جائے دلّی

لیکن ان کو اس کے ہر ذرّۂ خاک سے انس و عشق رہا ہے، اور وہ اس کے دل و جان سے

سیدائی ہیں۔

ساتویں دلی جو شاہجہاں نے آباد کی تھی غارت ہوگئی۔ اس کے کھنڈرات میں جو تھوڑا بہت حسن و جمال باقی رہ گیا تھا وہ انگریزوں کی بنائی ہوئی نئی دہلی کے بعد تغافل شعاریوں کی نظر ہو جائے گا اور دلی والے اکثر مکدر ہو کے کہتے، نو دلی دس باولی قلعہ وزیر آباد..... لیکن زمانہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ کون مظلوموں کا دادرس ہوا ہے، اور کب کسی نے برباد ہونے والوں پر آنسو بہائے ہیں؟ وقت کبھی کسی کا ساتھی نہ ہوا، نہ اس نے عہد وفا کیا اور نہ پیمان استوار رکھے۔ نینوا اور بابل اس کی خود غرضیوں پر بھینٹ چڑھ گئے، کارتھیج اور روما وقت کی سنگینی کا شکوہ کرتے ہوئے مدت کی گمنام خندقوں میں کھو گئے۔ مگر کون تھا جو ان کا ہمنوا ہوا، کب کسی نے سینہ کوبی کی؟

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

میر نہال اور ان کے ملاقاتی حالات حاضرہ پر غور کرتے اور بحث مباحثے ہوتے اور کوئی تدبیر ازالہ کی تلاش کرتے، مگر سانپ نکل چکا تھا اور لکیر پیٹنا لاحاصل ان کی دلی اب ان کی نہ تھی، گویا اب زندگی اور تقدیر بھی ان کی نہ رہی تھی اور اس پہ بھی دوسروں کا قبضہ ہوگیا تھا یہی اصل وجہ تھی کہ میر نہال نے گھر سے باہر نکلنا قطعی چھوڑ دیا تھا، اور وہ گھر میں بیٹھے رہتے۔ ان کی ہستی سبزۂ بیگانہ ہو کر رہ گئی۔ گوشہ نشینی کی بے کیف گھڑیوں میں انھوں نے حکمت اور کیمیا کا سہارا لے لیا۔ کتب اور علوم کی دنیا میں یہ اطمینان تو تھا کہ نہ کوئی دخل انداز تھا نہ کسی کی دسترس۔ اس سے جو وقت میسر آتا وہ پوتوں سے ہنس بول کر گزارتے۔ یہ ناسمجھ بچے ہی ان کا سامانِ مسرت اور دل بہلاوے کا واحد ذریعہ تھے۔

کبیر الدین کے دو بیٹے حمید اور شاہد تھے جن کی عمریں آٹھ اور دس برس کی تھیں۔ مگر میر نہال حبیب الدین کے بیٹے نسیم کو زیادہ چاہتے تھے۔ وہ حمید اور شاہد سے عمر میں

کافی چھوٹا تھا لیکن ان دونوں سے زیادہ ذہین اور فراست والا۔ لاڈ پیار نے اس کو اور شوخ اور جری بنا دیا تھا، اور وہ اس قدر چلبلا ہوگیا تھا کہ ذرا دیر نچلا نہ بیٹھتا۔ جب کھیلتے کھیلتے تھک جاتا تو کسی کونے میں یا سیڑھیوں پر خاموش بیٹھ کر شہزادیوں اور پریوں کے خیال میں گم ہو جاتا اور پرندوں اور جانوروں کی عجیب عجیب صورتیں اپنے ذہن میں ترتیب دیتا۔ اور جب تخیلات کے پُراسرار جہانوں کی بھول بھلیوں سے نکلتا تو بھونڈی آواز سے بے سرو پا نظمیں گاتا پھرتا جن میں سے بیشتر اس کی اپنی بے معنی تک بندیاں ہوتیں۔ اس کو مکتب میں بٹھا دیا تھا مگر روز روز استانی جی کے پاس جاکر پڑھنا جان پر آتا تھا، اور عربی اس کو ایک جناتی زبان معلوم ہوتی۔ جب وہ استانی کے ہاں سے واپس آتا تو میر نہال اس کو اُردو کا سبق دیتے اور نرسل کے قلم خود تراش کر قط لگاتے اور تختی لکھوا کر خوش خطی کی مشق کراتے وہ نہ صرف مشفق دادا تھے بلکہ مہربان استاد بھی جو بہت تحمل اور شوق سے اس کو درس دیتے عموماً نسیم اپنا سبق دلجمعی سے یاد کرتا، فرفر کہانیاں سناتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ کھیل میں پڑ کر وہ پڑھنے پر قطعی دھیان نہ دیتا تو البتہ میر نہال سخت سست کہہ دیتے۔

گرمیوں کی دوپہروں میں ایک ایک بچہ ان کے پاؤں باری باری دباتا جب میر نہال قیلولہ سے فارغ ہو کر اٹھتے تو عصر کی نماز پڑھ کر سب بچوں کو اپنے پاس بلا لیتے اور چائے کی تیاری ہوتی۔ انھیں سبز چائے بہت بھاتی تھی اور غفور سماوار میں آگ جلا کر پانی بھر دیتا۔ بقیہ اہتمام وہ خود کرتے۔ پتیاں اور دودھ ساتھ ڈال کر اَوٹاتے۔ جب اس کا رنگ گلابی ہو جاتا تو الائچی اور دارچینی بھی شامل کر دیتے اور بھاپوں کے ساتھ بھینی بھینی خوشبو نکلنے لگتی۔ پھر غفور دیوار میں جڑی ہوئی الماریوں میں سے نیلے رنگ کے چینی کے پیالے اور گہرے چمچے نکالتا۔ یہ میر نہال کی خاص اور

پسندیدہ چیزیں تھیں ۔ پیالوں کے اندر اور باہر دونوں طرف پہاڑ اور درخت یا پھول پتیاں بنی ہوئی تھیں اور چمچے بھی انھیں سے ملتے جلتے تھے۔ میر نہال سماوار کی ٹونٹی کھولتے اور سب بچوں کے پیالے باری باری چائے سے بھر دیتے ـــــ بچے کرارے بھربھرے پاپے پیالوں میں ڈبو دیتے جو چائے میں بھیگنے کے بعد پھول جاتے، اور وہ ان کو چینی کے چمچوں سے نکال نکال کر بڑے شوق سے کھاتے ۔ اس وقت میر نہال دنیا کی تلخیاں اور زمانے کی زیادتیاں سب بھول جاتے اور خاموش بیٹھے ہوئے ایک خاص سکون سے پوتوں کو چائے پیتا ہوا دیکھتے رہتے۔ ان کا چہرہ پُرمسرت ہوتا اور آنکھوں میں محبت ۔

حمید اور شاہد دادا سے ذرا ڈرتے تھے اور جب انھیں چورن چاہیے ہوتی تو نسیم کو جو میر نہال کا منہ چڑھا تھا قاصد بنا کر بھیجتے اور خود ڈیوڑھی میں کھڑے رہتے نسیم دادا کے پاس جا کر کہتا :

"اچھے دادا آبا تھوڑا سا چورن دیدیجئے"

میر نہال غفور سے کہتے :

"چورن کی شیشی تو لانا"

اور چٹکی بھر کے چورن نسیم کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیتے ۔ لیکن نسیم کہتا :

"نہیں دادا آبا تھوڑا سا اور دے دیجیے"

میر نہال کہتے :

"نہیں، چورن زیادہ نہیں کھاتے"

مگر وہ دادا کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوئے کھڑا رہتا اور میر نہال پوتے کی ضد سے عاجز آ کر ناچار شیشی کا ڈھکنا پھر کھولتے اور اس کی ہتھیلی پر پہلے سے زیادہ چورن

ڈالتے ہوئے جھوٹ موٹ بگڑ کر کہتے:

"بس جاؤ۔ اب اور نہیں ملے گا۔ زیادہ چورن کھانے سے آنتیں کٹ جاتی ہیں"
نسیم اچھلتا ہوا باہر آجاتا۔ حمید اور شاہد جو پہلے سے اس کے منتظر کھڑے ہوتے نسیم کو پکڑ لیتے۔ چورن آپس میں بٹ جاتا اور وہ چٹخارے لے لے کر کھاتے۔ جب چورن ختم ہو جاتا تو زبانیں نکال نکال کر اپنی ہتھیلیاں چاٹتے ہوئے کسی اور کھیل میں مصروف ہو جاتے۔

میر نہال، بچوں کی معصوم حرکتوں اور شوخیوں سے برابر محظوظ ہوا کرتے، ان شوخیوں سے جو کبھی خود ان کا سرمایۂ حیات تھیں۔ جب بھی بچے ان کو گھیر لیتے تو وہ اپنے کو یکسر فراموش کر کے ان کی باتوں کا مزا لیتے اور لطف اٹھاتے۔ لیکن ایک دفعہ وہ سچ مچ برہم ہو گئے۔ ہوا یہ کہ کبیر الدین کی بیوی کے نام ڈاک سے روپیے آئے تھے چونکہ ان کے میاں زیادہ تر دوروں پر رہا کرتے تھے وہ اپنے ساس سسر کے پاس آگئی تھیں، اور میاں پہلی کی پہلی ان کا ہاتھ خرچ بھیجدیا کرتے تھے۔ جس وقت روپیے آئے یہ بیٹھی ہوئی سی رہی تھیں۔ روپیے لے کر انھوں نے تخت پر سوزنی کے نیچے رکھ دیئے۔ بے خیالی میں ایک روپیہ پاؤں لگ کر لڑھکتا ہوا نیچے گر گیا اور انھیں سینے کی دُھن میں اٹھانے کا دھیان نہ رہا۔ اتفاق سے شاہد کی اس پر پڑی اور اس نے چپکے سے روپیہ اٹھا لیا اور حمید اور نسیم کو جا کر دکھایا۔ تینوں کا گٹھ جوڑ تو تھا ہی، بجائے روپیہ اماں کو واپس کرنے کے مرزا دودھ والے کے ہاں جا کر خوب برفیاں اڑائیں۔ جو ریزگاری بچ گئی وہ ڈیوڑھی کے اندر ایک موکھے میں چھپا دی۔ دلچین کسی کام سے ڈیوڑھی میں آئی، تو اس کی نگاہ پڑی۔ اس نے جا کر کبیر دلہن سے پوچھا:

"بیوی کیا آپ نے بچوں کو روپیے دیئے ہیں؟"

کبیر دلہن بولیں :

"نہیں تو۔"

پھران کو کچھ خیال آیا اور انھوں نے اپنے روپے گنے تو دو ہی ایک روپیہ کم تھا جو لڑھک کر تخت کے نیچے گر گیا تھا۔ انھوں نے سب بچوں کو بلا کر پوچھنا گچھنا شروع کیا تینوں ایک تھے۔ کون قبولتا۔ وہ بچوں پر چیخ چلا رہی تھیں کہ میر نہال اندر آگئے۔ بہو کو بچوں پر غصہ ہوتے دیکھ کر بولے :

"جانے دو، دلہن بچے ہیں۔"

بہو کہنے لگیں :

"ابا میاں انھوں نے میرا ایک روپیہ اٹھا لیا اور بغیر پوچھے لے گئے۔"

بس اتنا سننا تھا کہ میر نہال آئیں تو جائیں کہاں۔ اگر انھیں کسی بات سے نفرت تھی تو جھوٹ اور چوری سے۔ ایک دم گرج کر بولے :

"دلچین لانا میری تلوار۔ ابھی سب کو بتاتا ہوں۔ نالائق، شریفوں کی اولاد اب چوریاں کروگے، ڈاکے ڈالو گے۔ ابھی سب کے ہاتھ کاٹ ڈالتا ہوں۔"

دلچین بھی جا کر کمرے میں سے تلوار لے آئی اور اس کو دیکھتے ہی تینوں کے ڈر کے مارے پیشاب خطا ہو گئے۔ میر نہال نے کہا :

"خبردار آئندہ کبھی ایسی کوئی حرکت نہ سنوں۔ شریفوں کے بچے اور چوری کریں !" اور وہ تلوار رکھنے کے بہانے وہاں سے چلے گئے.....

مگر ایسے موقعے کم ہی آتے تھے اور بچے ہنسی خوشی چوکڑیاں بھرتے پھرتے رہتے یا کبھی کبھار آپس میں کوئی چھوٹی موٹی جنگ ہو جایا کرتی جو وہ خود ہی سلٹا لیا کرتے تھے۔

شام کو جب میر نہال کے دوست اور شناسا ملنے آتے تو بچوں کو بھی

بُلا کر بڑوں میں بٹھایا جاتا تھا اور ان کو ادب سے بیٹھے رہنے کی ہدایت ہوتی۔ وہ بڑوں کی باتیں سنتے رہتے تھے اور محفل میں بیٹھنے کے آداب بھی سیکھ جاتے تھے۔

غفور کمرے سے باہر بیٹھ کر حقّہ پیتا۔ وہ اب بھی اکیلا تھا، سال بھر پہلے، مہرو کی شادی کے بعد ہی اس کی بھی شادی شیخ محمد صادق کی بھانجی سے ہو گئی تھی، لیکن لڑکی کے رحم میں ناسور ہو گیا تھا اور وہ شادی کے چھ مہینے بعد ہی جاں بحق ہو گئی۔

—— یہ انجام ظاہر تھا، وہ غفور جیسے تن و مند آدمی کے لیے بہت چھوٹی تھی۔ اس کے بعد شیخ محمد صادق اس فکر میں رہے کہ پورا مہر مل جائے اور اس کے علاوہ کوئی رقم بھی اینٹھ لی جائے لیکن میر نہال نے کہا:

"یہ سب ناممکن ہے۔ آپ سے میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ لڑکی بہت کم سن ہے۔ اب میری ذمہ داری نہیں ہے۔ جو شرعاً واجب تھا وہ میں نے خود دلا دیا۔"

غرض معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ لیکن جوان بیوی کے مرنے سے جل بھن کے رہ گئے اور غفور میں وہ پہلا سا دم خم نہ دکھائی دیتا تھا۔ بالوں میں تیل کی تلیاں نہ بہتیں اور وہ بجھا بجھا سا رہنے لگا......

مہرو مسرور میں لڑائی ہو کر جو تھوڑا بہت شور و غل ہو جایا کرتا تھا وہ مہرو کے چلے جانے سے ختم ہو گیا اور بیگم نہال اکثر بیٹی کی کمی محسوس کرتی تھیں۔ ورنہ اس گھر اور گھر کے مکینوں کے کاروبارِ زندگانی وہی تھے۔ چہار دیواری اسی طرح مستعدی سے حلقہ بگیر تھی جہاں تر و تازہ ہوا کا گزر ناممکن تھا۔ مگر عورتوں کی روکھی پھیکی زندگیوں کو یہ احساس بھی نہ تھا کہ ان کی حیات میں کوئی تنوع نہیں۔ شمس و قمر، انجم و کوکب، اپنی اپنی گردشیں پوری کرتے، رُت بدلتی رہتی اور اپنے اپنے وقت پر ہر موسم نیا روپ دھار کر آ جاتا۔ گرمی آتی، لو چلتی، حبس ہوتا، کڑاکے کے جاڑے پڑتے، مہاوٹوں کی اندھیری راتیں ڈراتیں، برفیلی اور نامہربان ہوائیں ستاکر

چلی جائیں اور برسات بھی آجاتی ، ابر سیاہ جھوم کر آتا ، بادل گرجتے اولے پڑتے ۔ برق کوندتی ، چھاجوں پانی برس جاتا ، تال تلیاں بھر جاتیں اور دریاؤں میں باڑھ آجاتی مگر ان ہستیوں کی بے حسی مدام تھی جو نہ ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے فقیر حسب معمول پھیرا لگا کر گلی در گلی درد بھری صدائیں لگاتے ۔ رات کے تاریک سکوت میں بلبلیں غراتیں ، لڑتیں اور پھر چھتوں پر پھرا کرتیں ۔ ستارے چلے جاتے ، چاند غروب ہوتا ، آفتاب طلوع ہو کر آسمان کو شنگرفی کر دیتا ۔ مگر زندگی بے رنگ تھی بے رنگ رہی اور غفلت سے بسر ہوتی رہی ۔

۷

جہاں آرا ڈیڑھ برس کی ہو گئی تھی، گھٹنیاں چل کر وہ گھر کے کونے کونے کی خبر
لے آتی۔ گڈّو لینے کے سہارے ایک آدھ قدم بھی اٹھا لیتی۔ نیا نیا بولنا سیکھا تھا.
اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اپنا مطلب بھی ادا کر دیتی۔ بلقیس کے لیے وہ ایک
جیتا جاگتا ہنستا کھیلتا کھلونا تھی۔ دن بھر وہ بچی کی بھولی بھالی باتوں سے بہل کر
اپنے رنجور دل کو تسکین دے لیا کرتی۔ ورنہ اصغر کو تو اب نہ بیوی کا کوئی چاؤ تھا
اور نہ کوئی خیال — محبت کا وہ پہلا پہلا جوش چڑھی ندی کی طرح اتر چکا
تھا اب اس کو بیوی کے جسم میں نہ تو کوئی نیا پن محسوس ہوتا نہ حسن میں سبھاؤ نظر آتا —
چنانچہ وہ صبح جان بوجھ کر دیر سے سو کر اٹھتا اور بلقیس سے بالکل بے تعلق ہو کر دفتر
جانے کی تیاری میں لگ جاتا گھنٹوں آئینہ میں اپنی صورت کو بن بن کر ہر زاویے سے
دیکھتا، خودستائی سے مسکراتا اور پھر چھوکری کو آواز دے کر اپنے لیے چائے منگواتا.
اکیلے اکیلے ناشتہ کرتا اور دفتر کے لیے گھر سے نکل جاتا اور رات گئے جب بلقیس اسکے انتظار میں جاگتے
جاگتے مایوس ہو جاتی اور اس کی آنکھوں میں تنکے سے چبھنے لگتے اور وہ تھک ہار کر

اصغر کے خیال میں سو جاتی تو گھر میں گھُستا۔ داماد کی غیر موجودگی میں بیگم شہباز بیگ کم و بیش بلقیس کے پاس رہتیں اور زہرا جس کا لڑکپن اب رخصت ہو رہا تھا گھر کے کام کاج میں بہن کا ہاتھ بٹاتی اور زیادہ تر جہاں آرا کو کھلاتی۔ ماں اور بہن کے پاس ہونے سے دوسرا ہٹ تو ضرور ہو جاتی تھی مگر اصغر کی تغافل شعاریوں کا خیال آتے ہی بلقیس کے دل کی تنہائی سوا ہو جاتی۔ اور وہ ہر وقت مغموم اور خاموش رہنے لگی۔

جہاں آرا کے دانت نکلنے کا زمانہ تھا۔ اس کے مسوڑے سوج گئے تھے جس کی وجہ سے آج کل وہ ہر وقت ٹھنکتی رہتی۔ بلقیس اس کو کندھے سے لگائے پہروں ٹہلتی طرح طرح سے بہلاتی لیکن جیسے ہی مسوڑھوں میں سلسلاہٹ ہوتی وہ اور زیادہ روتی۔ اگر اتفاق سے اصغر گھر میں ہوا تو جھلا جھلا کر بیوی پر بگڑتا:

"آخر اس کو چپ کیوں نہیں کرتیں۔ بچی نہ ہوئی روگی ہو گئی۔ مستقل ریں ریں کیے جاتی ہے اور تم کو تو اب کوئی کام ہی نہیں رہا۔ ہر وقت اس کو کوٹھے پر چڑھائے رکھتی ہو۔" اور پھر وہ دانت پیس کر تلخی سے کہتا:

"آخر بیوی کا پھر کیا خاک فائدہ ہے جب آدمی کو نہ محبت ملے نہ آرام میسر ہو۔" اور وہ پیر پٹختا ہوا جاکر دوسرے کمرے میں اطمینان سے بیٹھ جاتا۔

اگر اصغر کی جھنجھی دو چار روز کی ہوتی تو خیر مگر جھڑ کی گھُڑکی، جھٹک پٹک اس کا روزانہ کا وطیرہ ہو گیا۔ وہ بلقیس سے سیدھے منہ بات کرنی بھول گیا تھا۔ میاں کے بس بھر سے جملے کٹے پر اور شکسا جھڑکیے مگر وہ بہ ظاہر خندہ پیشانی سے میاں کی نرم گرم جھیلتی اور بعد میں چپکے آٹھ آٹھ آنسو روتی۔

بیگم شہباز بیگ ایک جہاں دیدہ عورت تھیں۔ اُڑتی چڑیا کے پر گن لیتیں۔ داماد کے بگڑے تیور اور اپنی بیٹی سے اس کا بدلا ہوا رویہ خوب دیکھ رہی تھیں اور وہ اصغر کی طرف سے کھٹک گئیں ان کو اب جو کچھ کھٹکا تھا وہ بلقیس کا نصیبہ پھوٹ

جانے کا۔

ایک روز اصغر حسبِ معمول بیوی پر تن پھن کر کے دفتر چلا گیا تو انھوں نے بلقیس سے پوچھا؛

"اے بیٹی آخر بات کیا ہے؟ تم دونوں میں کچھ ان بن ہو گئی ہے کیا؟"

"نہیں تو۔" بلقیس نے دبی زبان سے کہا۔ بیگم شہباز بولیں:

"بھلا بیٹی مجھ سے کیا ڈھانک رہی ہو۔ میں میاں اصغر کا رنگ دیکھ رہی ہوں سال بھر میں طور سے بے طور ہو گئے۔ کیا تم نے کچھ کہہ دیا جو وہ بات بے بات بکھر جاتا ہے۔ اور وہ ہی کیا مجھے تو بیوی تم بھی خوش نظر نہیں آتیں۔"

بلقیس کہنے لگی؛

"اماں مجھے نہیں معلوم انھیں کیا ہو گیا۔ میں تو خود حیران ہوں۔ مجھ سے قسم لے لیجیے۔ میں نے تو کبھی الٹ کر ایک کہی نہ دو۔ آپی آپ روٹھے رہتے ہیں۔ ورنہ آپ نے بھی دیکھا تھا۔ ان کا مزاج ایسا نہ تھا۔"

بیگم شہباز ذرا تردّد سے بولیں:

"ہاں بیٹی جب ہی تو تم سے پوچھ رہی ہوں کہ آخر اس کو کونسی بات بری لگ گئی۔"

اس پر بلقیس کہنے لگی:

"شاید دفتر میں کام زیادہ بڑھ گیا ہے اور تھکن سے وہ چڑچڑاتے ہیں۔"

"نہیں بوا۔ دنیا جہاں کے مرد کما کر لاتے ہیں۔ اے دن بھر لوٹ کر ہی ڈھو کر مزدور بھی جھونپڑیا میں گھستا ہے تو بال بچوں سے ہنس بول کر اپنا جی ہلکا کر لیتا ہے یہ کھوڑ می کہ دھانیو دھانیو کرتے گھر میں گھسیں، منہ کھلائے ہوئے بیوی پر قہر اور اولاد سے بیزار۔ نوج جو کسی کا میاں ایسا ہو۔ میں نے بھی یہ سر دھوپ میں سفید نہیں کیا۔ بھلا کوئی میاں بیوی میں یوں آئے دن دانتا کل کل ہوتی ہے؟ نہیں بی،

میں نہیں مانوں گی۔"

بلقیس چپ بیٹھی ہوئی جہاں آرا کو تھپکتی رہی۔ ماں جو کچھ کہہ رہی تھیں ٹھیک تھا۔ یہ حقیقت سن کر بلقیس زیادہ افسردہ ہوگئی۔ بیگم شہباز نے اپنا شبہ مٹانے کو بیٹی کو سر سے پیر تک غور سے دیکھا اور بلقیس جلدی سے گردن نیچے کرکے جہاں آرا کی پیٹھ سہلانے لگی اور وہ آنسو جو اس کے موجودہ رنج والم کا اظہار کر دیتے آنکھوں ہی آنکھوں میں پی لیے۔

بیگم شہباز۔ تھوڑی دیر خاموش کسی گہری سوچ میں غرق بیٹھی ہوئی نواسی کے لیے سہاگ کھرل کرتی رہیں اور خاصی دیر بعد سر اٹھا کر بولیں:

"تم ابھی ندان ہو، زمانے کے اونچ نیچ نہیں سمجھتیں، تم کیا جانو ان مردوں کے رنگ ڈھنگ۔ اے میاں اصغر تو اللہ رکھے ابھی جوان ہیں۔ نگوڑی ماری مرد کی ذات تو ایسی ہے کہ قبر میں پاؤں لٹکا لیں تو بھی ہرجائی پنے سے باز نہیں آتے۔ بی میرا تو دل یہی کہتا ہے کہ میاں اصغر کی نظر میں کوئی اور چڑھ گئی ہے۔ یہ بیوی سے ہر دم کا روٹھے رہنا بلا وجہ نہیں۔"

بلقیس کو گم سم پاکر انھوں نے تسلی دی:

"گھبراؤ نہیں اللہ نے چاہا تو اس قطامہ کی طرف سے ان کا دل پھر جائے گا۔ کل ہی چنبیلی کو پیر جی کے پاس بھیجوں گی۔ ان کے تعویذ بہت مجرب ہوتے ہیں۔"

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

اب کے بہت دنوں بعد جمال بیگم ملنے آئیں۔ دونوں زمانے بھر کی باتیں کرتی رہیں۔ اتنے میں جمال بیگم کو بلقیس کا خیال آیا اور پوچھنے لگیں:

"اے ہے بلقیس کہاں ہے۔ میرا تو جی دیکھنے کو ترس گیا۔"

بیگم شہباز کہنے لگیں: "ہوں گی کہاں اپنے گھر میں منہ لپیٹے پڑی ہوں گی۔"

"کیوں خیر سے کیا پھر پیر بھاری ہے؟"

"اے بی اللہ اللہ کرو۔ خدا نہ کرے۔ یہاں تو ایک ہی بچی کے لالے پڑے ہیں اب تم سے کیا پردہ تمہارے بھتیجے اصغر نے تو وہ پیٹ سے پاؤں نکالے ہیں کہ میں تو اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر بھر پائی۔"

یہ سن کر جمال بیگم کے کان کھڑے ہوئے اور وہ شہباز بیگم کے قریب سرکتے ہوئے کہنے لگیں:

"آخر ہوا کیا؟ بُوا کچھ کہو تو سہی۔"

بیگم شہباز بڑے افسوس سے ایک سرد آہ لے کر بولیں:

"بی ہوتا کیا۔ سال بھر میں ہی اس کا دل ملقیس سے بھر گیا۔ اے بہن تم ہی بتاؤ بیاہ کو کے دن اور کے راتیں ہوئی ہیں۔ ابھی تو بچی کے ہاتھوں کی مہندی بھی پھیکی نہیں پڑی اور وہ بیوی بچی سے بیزار ہو گئے۔ نہ ہنسے نہ بولے، آپ ہی آپ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھا رہتا ہے۔ کہاں وہ شادی سے پہلے جاؤ تھے۔"

بیگم جمال نے بڑے وثوق سے کہا:

"بوا پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آتے ہیں۔ وہ تو ہمیشہ کا ننٹ کھٹ لڑاکا تھا۔ تم آج کہہ رہی ہو۔ مجھے تو پہلے سے ان کے گُن معلوم تھے۔ اپنے آگے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ لیکن جی میں اگر زبان ہلائی تو سب کہتے کہ بھتیجے سے جلتی ہیں۔ وہ تو سدا کا مطلب آشنا ہے۔ وہ سنا نہیں ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔"

بیگم شہباز نے کہا:

"یقین جانو مجھے ان کے خناسوں کی یہ خبر ہوتی تو یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ اللہ ماری عقل پر اس وقت کچھ ایسے پردے پڑ گئے تھے کہ نہ عیب سوجھا نہ ہنر۔

اب کیا ہوتا ہے میری بچی کی تو تقدیر پھوٹ گئی۔ اس نے اپنے کو ایسا گھونٹا ہے اور ایسی چپ لگائی ہے کہ اندر ہی اندر گھن لگ گیا۔ تم دیکھو تو پہچانو بھی نہیں کہ وہی بلقیس ہے۔ منہ دیکھو تو معلوم ہوتا ہے سرسوں پھول رہی ہے۔ وہ انار کا سا رنگ ہی نہ رہا۔"

"ہاں بی وہ کہتے نہیں ہیں موزے کا گھاؤ بیوی جانے یا راؤ۔ وہ تو کہو بلقیس جیسی دبی دبائی لڑکی ہے۔ آجکل کی کسی چھلاوا سے پالا پڑتا تو میاں جی کو چودہ طبق روشن ہو کر دو دن میں سیدھے ہو جاتے۔"

بیگم شہباز کہنے لگیں:

"بس بی اب تو رات دن دعا کرتی ہوں کہ کسی طرح دونوں کے دل مل جائیں۔"

اتنے میں جمال بیگم کی ڈولی آگئی تھی وہ گلے مل کر چلی گئیں۔

دوسروں کی ہمدردی کرنے اور غم خواریوں کا اثر یہ ہوا کہ بلقیس کو اصغر کی بے توجہی اور زیادہ محسوس ہونے لگی اور میاں کی لاپروائیاں دل کا روگ بن گئیں۔ بلقیس نے اپنی سدھ بدھ بسرا دی۔ نہ اس کا کھانے پینے کو جی چاہتا نہ پہننے اوڑھنے میں مزہ آتا۔ ماں کے کہنے کے بعد تو اب شبہ نہ رہا کہ گھر کی چھوکری سے اصغر کی چھیڑ چھاڑ ہنسی مذاق خالی خولی نہ تھا بلکہ بیوی سے زیادہ وہ اس ملازمہ پہ ملتفت اور مہربان تھا۔ اور بلقیس ہر پھر کر یہ سوچتی رہا کرتی کہ آخر مجھ میں ایسی کیا کمی ہے اور وہ ایسی کونسی خطا ہے جس کی پاداش میں اصغر اس سے بے مہری کا برتاؤ کر رہا ہے۔

اور وہ اکتوبر کی انہی اداس شاموں میں سے ایک تھی جب موسم گرما الوداع کہہ کر رخصت ہو رہا تھا۔ پت جھڑ ہو کر سوکھے ہوئے پیلے پتے درختوں کے قدموں میں پڑے تھے، شاخیں عریاں ہو چکی تھیں، اور برگ و بار پر ایک ناشاد پژمردگی پھیلی ہوئی

تھی اور دل خزاں کے مایوس کن احساس سے بے کیف تھے۔

شفق پھول رہی تھی مگر آفتاب زرد تھا۔ اس کے سارے شوخ رنگ آسمان کی بے کنار وسعتوں میں بکھر گئے تھے۔ آہستہ آہستہ ایک درد انگیز اندھیرا پھیلتا ہوا قلب کو رنجور کر رہا تھا اور جیسے کسی بچھڑے ہوئے محبوب کی جدائی اور بیتے ہوئے رنگیں دنوں کی یاد فضاؤں کو بھی آ رہی تھی۔

پیڑوں کی اونچی اونچی چوٹیوں پر کوے جمع ہو کر چکر کاٹتے اور شاخوں پر بیٹھ جاتے۔ جھنڈ میں سے ایک کوا کائیں کر کے اڑتا تو سب اڑ کر منڈلاتے اور ساتھ مل کر یکساں کائیں کائیں کا شور مچاتے۔ کبوتروں کے جھنڈ تیزی سے اڑتے ہوئے گزر رہے تھے۔ پالتو کبوتر اپنی اپنی چھتوں پر اتر جاتے اور جنگلی کبوتر اپنے آشیانوں کی تلاش میں اڑتے ہوئے آگے جا کر نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔

شام کی غمگین فضا میں بلقیس تنہا و مہجور بیٹھی ہوئی تھی۔

جہاں آرا کی بھی روتے روتے آنکھ لگ گئی تھی۔ بلقیس نے اس کو پلنگ پر لٹا دیا اور پھر تنہائی سے بیزار ہو کر خود بھی اس کے برابر لیٹ گئی۔ محلے میں سے کسی فقیر کی آواز آ رہی تھی۔ کسی کے گھر میں شادی ہوئی تھی اور فقیر دروازے پر کھڑا نئے جوڑے کو دعائیں دے رہا تھا:

"اے نصیبہ والی سہاگن دے دے اللہ کے نام پر۔ بھیج دے بابا کوئی پیسہ کوئی روٹی۔ اے آس اولاد والی تو جیے تیرا سائیں جیے۔ تیرا سہاگ قائم رہے۔"

بلقیس پہلے ہی دل شکستہ تھی، فقیر کی صدا سن کر اس کا دل اچانک کسی نامعلوم اور گہرے خوف سے ڈوب گیا۔ اس نے سوتی ہوئی جہاں آرا کو قریب کھسکا کر اپنے سینے سے چپٹا لیا اور پھر اس کو اپنی بدقسمتی پر افسوس ہونے لگا اور اس کے ساتھ

ساتھ اپنی بچی کے حال پر ترس آگیا۔ چند مہینوں سے تو اصغر کچھ زیادہ ہی کشیدہ رہنے لگا تھا اور بلقیس اس کی بے پروائیاں دیکھ دیکھ کر بار بار یہی سوچتی رہتی کہ مجھ سے یہ بیزاری آخر کیوں ہے، یہ بے وجہ کی دل آزاری کس لیے! یہ کل ہی کی بات تھی کہ وہ ایک چاہنے والا شوہر تھا۔ مگر اب اس کی پہلی چاہت کو کیا ہو گیا تھا۔ وہ پہلی سی محبت کہاں چلی گئی تھی؟ پھر وہ شادی کے دن سے لے کر آج تک اپنی ہر حرکت پر نظر ڈالتی، اپنے ہر قول و فعل کا جائزہ لیتی۔ شاید بے خبری میں اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہو۔ مگر دل کی صفائی، اور اس کا بے گناہ ضمیر ہمیشہ اس کو ایک ہی جواب دیتے کہ وہ بے قصور ہے۔ اصغر اور اصغر کی رفتہ عشقیہ باتیں اور اب اس کا مکمل تغافل اس کے واسطے پہیلی بن کر رہ گئے تھے، جس کا حل وہ نہ جانتی تھی۔ اور اب اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ محبت کا جو دیا اصغر کے دل میں بجھ چکا تھا اس میں اپنی محبت کی جوت پھر سے کیسے جلائے۔ وہ اس وقت بھی اپنے ان ہی خیالوں میں الجھی ہوئی بیٹھی تھی کہ اصغر کھٹ کھٹ کرتا گھر میں داخل ہوا اور سیدھا غسل خانہ میں چلا گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے اور تیار ہونے کے بعد کمرے میں آکر اس طرح بیٹھ گیا جیسے بلقیس اور جہاں آرا وہاں موجود ہی نہ تھے۔ پھر چھوکری کو آواز دی اور اپنے واسطے چائے منگوائی۔

بلقیس اٹھی اور اپنے ہاتھ سے اس کے لیے چائے بنا کر تپائی پر رکھ دی۔ اصغر نے کوئی توجہ نہ کی اور بہت بے نیازی سے چائے کی چسکاریاں بھرتا رہا۔ بلقیس قریب بیٹھ کر ٹکر ٹکر اس کو خاموشی سے دیکھتی رہی۔ اس وقت اس کی حالت اس سہمے ہوئے بچے کی سی تھی جو سرزنش کے بعد امید و بیم سے سزا دینے والے کو دیکھتا ہے۔ بلقیس کے دل و دماغ کی حالت تہ و بالا تھی۔ مختلف جذبات و خیالات نے اس کے اندر ہی اندر ایک عجیب خلفشار برپا کر دیا تھا۔ بیک وقت سینکڑوں خیال تھے جو

سامنے آ آ کر اس پر اپنا دباؤ ڈال رہے تھے اور پھر گڈ مڈ ہو کر آپس میں برسرپیکار ہو جاتے۔ ادھر اس کی اپنی خودداری تھی جو اپنے مٹائے جانے پر بلقیس سے شدومد سے تقاضے کر رہی تھی کہ آج ہمت سے کام لو اور میاں سے دو ٹوک بات کر کے اس الجھن کو ختم کر دو۔ مگر دل کا مطالبہ تھا کہ قصوروار چاہے سراسر اصغر ہی کیوں نہ ہو مگر تم اپنی غلطیوں کی اس سے معافی مانگ لو۔ اس کی یہ کیفیت تھی کہ عقل اور دل کے دو جہازوں میں معلق تھی۔ گو پریشانیاں سوہانِ روح اور اذیت دہ تھیں مگر اصغر سے ڈرتی بھی تھی کہ اس کی اس جسارت کا انجام نہ جانے کیا ہو۔

اصغر چائے پی چکا تھا اور اٹھ کر انگنائی میں جا کر بیٹھ گیا۔ سورج کبھی کا ڈھل چکا تھا اور رات کی دیوی نے اپنے سیاہ ستاروں جڑے پر پھیلا کر ارض و سما کو ڈھک لیا تھا۔ گھروں میں چولھے جل چکے تھے۔ لکڑی کا دھواں اوپر اٹھ رہا تھا اور ہوا میں دھوئیں کی کسیلی بو آ رہی تھی جس سے کبھی تو فرحت اور انبساط دامن گیر ہوتے، کبھی غم و اندوہ دل کو پکڑتے تھے۔ جہاں آرا ابھی تک بے خبر سو رہی تھی۔ اصغر کی نظر بیٹی پر پڑی تو محبت پدری نے جوش مارا اور اس کو بیٹی پر پیار آ گیا۔ وہ بڑھا اور جھک کر جہاں آرا کے گلوں پر جیٹ جیٹ پیار کرنے لگا۔ بلقیس نے یہ دیکھا اور اس کا دل امید و مسرت سے یکبارگی اچھل پڑا اور اس کے گالوں کی رگیں غیر متوقع خوشی میں دھک دھک چلنے لگیں۔ وہ چپکے سے آ کر اصغر کے پیچھے کھڑی ہو گئی اور اصغر کو بیٹی کو پیار کرتا ہوا دیکھتی رہی۔ اس وقت اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے بے تاب تھے اور ان پر ایسا تبسم تھا جو اس کے دل کے زخموں کی غمازی کر رہا تھا۔ اصغر نے جب بلقیس کو اپنے قریب کھڑا دیکھا تو بچی کے پاس سے ہٹ گیا اور بڑی بیگانگی سے دیوار کے پاس جا کر دور دیکھنے لگا۔

میلوں پھیلے ہوئے مکانوں کے کوٹھے اور بالائی حصے اندھیرے میں پیہم

رہے تھے اور آسمان پر ستاروں کی روشنی ہو رہی تھی۔ اور ان ستاروں کو دیکھ کر اصغر کو یاد آیا کہ اس نے کبھی ان سے زیادہ روشن اور تابناک ستارے دیکھے تھے جو کبھی حسن و عشق کے پیامی بن کر اس کو قصۂ مہر و الفت سناتے تھے اور ان ستاروں کی زمردی روشنی سے کبھی اس کے دل کا جہاں جگمگا اٹھا تھا۔ مگر آج نہ ان ستاروں میں روشنی تھی اور نہ چمک۔

بلقیس ابھی تک وہیں بت بنی کھڑی تھی۔ اصغر کے اس طرح بے رخی سے اس کے پاس سے گزر جانے سے بلقیس کو ایسا معلوم ہوا کہ ایک آتش فشاں تھا جس نے پھٹ کر آناً فاناً میں اس کی کل کائنات کے پرخچے اڑا دیے۔ ایک ہی دھچکے سے دل کی دنیا نے ہچکولا کھایا اور اس کی محبت کے سب محل ایک ایک کر کے نیچے آ رہے اور وہ اپنی مسمار اور تباہ شدہ دنیا کے ڈھیر پر تن تنہا ہراساں کھڑی تھی، جہاں نہ اس کا کوئی مونس تھا نہ غمخوار، کوئی ہمدرد تھا نہ مددگار۔ اپنی بے بسی سے اس کو رونا آ گیا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوب گئیں۔ وہ عالم لاشعوری میں بڑھی اور اصغر کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت نہ معلوم کیسے اتنی جرأت اس میں آ گئی کہ اس نے اصغر سے کہا:

"آپ نے اب مجھ سے بات تک کرنی چھوڑ دی۔ آخر کچھ کہیے تو سہی کیوں مجھ سے خفا ہیں۔ خدارا وہ میری تقصیر تو بتا دیجیے ایسی کونسی بھول مجھ سے ہو گئی جو آپ اتنے ناخوش ہیں مجھ سے۔"

اصغر نے یہ سن کر تیوری چڑھالی اور ترچھی چتون سے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ بلقیس کو اپنی آواز کی بازگشت کانوں کے پردوں سے ٹکراتی ہوئی دوبارہ سنائی دی اور اس کو اچانک معلوم ہوا کہ وہ گھپ اندھیرے میں اِدھر سے اُدھر ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ اسی وقت ایک نابینا فقیر کی صدا آئی جو اس محلے میں اکثر رات کو آیا کرتا تھا۔

"آنکھیوں والے بابا آنکھیاں بڑی نعمت۔"

شام کی اس تنہائی اور سنسانی میں فقیر کی صدا اس طرح آئی جیسے کہہ رہی ہو کہ اصغر بھی اپنی بصارت سے محروم ہو چکا اور بے بصیر ہو کر وہ راستوں کی تاریکی میں بھٹک رہا ہے۔ بلقیس اشکبار تھی مگر اصغر جس طرح بے حس کھڑا تھا ویسے ہی کھڑا رہا۔

چاروں طرف شام کا اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا اور ہر طرف خاموشی کا دور دورہ تھا۔ صرف بلقیس کے کانوں میں اپنی ہچکیوں کی آواز آجاتی تھی۔ آخر وہ روتے روتے بولی:

"میں آپ سے کچھ نہیں چاہتی۔ بس اگر تھوڑا سا مجھ کو بھی چاہتے رہیں تو میری زندگی اتنی تلخ نہ رہے گی......"

گلی میں کسی لونڈے نے پٹاخہ چھوڑا اور اس کی دھمک سے بلقیس ایک دم چونک گئی اور ڈر کے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ آنسوؤں کے قطرے ڈھلک کر اس کے رخسار پر ٹھہر گئے۔ بلقیس کی منتیں اور آنسوؤں سے بھرائی ہوئی آواز اصغر کو جیسے کہیں بہت دور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی اور اس کے ساتھ دھندلی یادیں جاگ اٹھیں۔ اس کے جذبات نے کروٹ لی اور لاشعور کے تہہ خانوں میں بند فراموش محبت کچھ دیر کو زندہ ہو کر نکل آئی۔ اس کا قلب پرانی یاد سے تازہ ہو گیا۔ اچانک اس کو اپنی بیوی پر رحم آنے لگا۔ اس نے قریب بیٹھ کر بلقیس کو اپنے سینہ سے لگا لیا۔

"تم کو یہ فضول خیال کیوں ہوا کہ میں تم سے ناخوش ہوں۔" اس کا لہجہ اس وقت صلح کن اور غیر معمولی طور پر نرم تھا۔ "دفتر میں کام کرتے کرتے اتنا تھک جاتا ہوں کہ پھر کسی بات کو جی نہیں چاہتا۔"

بلقیس کا دل سادہ اور فطرت بھولی تھی اور اصغر سے محبت کے دو بول سن کر اس کے دل میں نہ کوئی رنج رہا نہ ملال اور اس نے اصغر کے کہے کا یقین کر لیا۔ آنکھیں

گو نم تھیں اور آنسو بدستور ٹھہرے ہوئے تھے لیکن آنسوؤں کی اوٹ سے اس
کی آنکھیں مسکرانے لگیں اور ایک دل آویز مسرت بھرا تبسم اس کے گلابی اور
بھیگے ہوئے چہرے پر پھیل گیا۔

اندھیرا چپ چاپ بڑھا اور فسوں ساز رات نے خراماں خراماں آکر اپنا
جادو فضا پر کر دیا۔ اکتوبر کا حسین چاند دیوار کے پچھواڑے سے نکلا اور مسکرا کر
دنیا کو جھانکنے لگا۔ اس کی نقرئی چاندنی زمیں پر بکھر گئی۔ ذرہ ذرہ اور پتا پتا چاندی
کا بنا معلوم ہوتا تھا اور ہر شے ایک لطیف اور ٹھنڈی روشنی میں نہا کر خوابناک
دکھائی دیتی تھی۔ دو چمگادڑیں چاند کے مقابل اس سمت سے اس سمت اُڑ رہی تھیں اور
جب وہ تیزی سے چکر لگاتیں تو معلوم ہوتا کہ وہ اپنی ترنگ میں چمکتے ہوئے حسین چاند
کو چھو لیں گی۔ ایک شب بیدار جھینگر کسی سوراخ میں بیٹھا ہوا بڑے مزے سے
ایک ہی سُر میں جھن جھن جھنکار کی تانیں اڑا رہا تھا۔ موسمِ خزاں کی یہ دمکیلی شب
مہتاب سنگم بن کر آئی تھی اور جاتی ہوئی گرمی اور آتے ہوئے جاڑے کے الگ الگ
کنارے مل کر سنجوگ ہو گیا تھا، اور دلوں میں درد و گداز کی وہ پیاری پیاری خلش
ہو رہی تھی جو کسی پُرسوز راگ کو سن کر ہوتی ہے اور وہ پُرکیف سکوت جو سوتی
ہوئی ہر چیز کو تھپک رہا تھا اس میں جیسے کوئی بیراگی موہ اور مایا کا جال توڑ کر اس خود غرض
بندوں کی نگریا سے بہت دور کسی غارِ کوہ پر ایک آبشار کے کنارے مست ہو کر
بیٹھا ہوا رباب بجا رہا تھا۔

* * * * * *

عشق کے کھیل جگ سے نیارے ہیں۔ پریم اگنی آپ ہی جلائے آپ ہی بجھائے۔
جو آتشکدۂ عشق میں آیا جل کر نیست و نابود ہو گیا۔ اور کبھی پریم کی جوت سے
قلب بقعۂ نور بن کر خزانوں سے مالا مال ہو گیا۔ عشق کبھی نور ہے کبھی ظلمت، خود

ہی معنی ہے خود ہی صورت اور جب ایک بار آتشِ شوق دھیمی پڑ جائے اور گرمیٔ عشق فنا ہو جائے تو اس کو دوبارہ دلوں میں روشن کرنا مشکل ہے۔ محبت وہ ساز ہے جس کے نازک اور حساس تار ایک دفعہ ٹوٹ جائیں تو پھر ان میں سے کوئی نغمہ نہیں ابھرتا۔ جہاں عشق بے ساختہ اور سرکش ہے وہاں جذبات اور ولولے بھی آزادِ عشق کی نیرنگیاں اپنی جلو میں طغیانیاں لے کر آتی ہیں اور طغیانیاں لے کر چلی جاتی ہیں مگر عشق و محبت کی مبہم شورشیں اور جذبات کی پے در پے یورش انسان کے دل کو سخت اور سنگین بنا دیتے ہیں۔ مسلسل مقابلوں سے وہ بے حس ہو جاتا ہے۔ اور اصغر کا بھی یہی حال تھا۔ اس کے من مندر کے کواڑ بند ہو چکے تھے۔ پریم اگنی بجھ چکی تھی، اور محبت کی دیوی اس کے دل میں سو چکی تھی۔ اس روز شام کو بیوی سے ملاپ ہونے سے صرف یہ ہوا کہ کچھ عرصہ کو ختم ہوتی ہوئی محبت کی دبی چنگاریاں لو دینے لگیں اور وہ بظاہر پھر سے محبت کرنے لگا اور کچھ دنوں تک وہ پہلی سی رونق گھر میں رہی۔ بلقیس دوبارہ محبت پا کر از حد خوش تھی۔ مگر یہ سب ایسا ہی تھا جیسے کوئی مرنے والا جاتے جاتے آخری سنبھالا لے۔ وہ باتیں جو اوپری ہوں اور جب دل کا تعلق باقی نہ رہے تو کہاں تک نبھ سکتی ہے۔ آخر کار وہ محبت اور جذبات ہمیشہ ہمیشہ کو مر گئے۔

اب بیگم شہباز بھی اصغر سے شاکی ہو گئیں۔ جب بھی انھیں خیال آتا ایک چوٹ سی دل پر لگتی کہ گئے برس تک ان کا داماد کس سعادت مندی سے ان کی تابعداری کرتا تھا۔ چھینک بھی آجاتی تو پٹی پکڑ کر بیٹھ جاتا، دوڑا دوڑا جا کر حکیم صاحب سے نسخے بندھوا لاتا اور ان کی ذرا ذرا سی باتوں کا خیال رکھتا۔ اسی وجہ سے اب ساس اور زیادہ تلملانے لگیں کہ وہ ان کو بھی گھاس نہ ڈالتا تھا۔ اب تو جانے کسی نے کیا ڈھائی انچھر پڑھ کر اصغر پر پھونک دیا تھا کہ اس نے ان کے پاس بھی سرے سے آنا چھوڑ دیا اور اگر کبھی بھولے چوک سے آیا بھی تو سرسری اور اکھڑی اکھڑی

باتیں کیں اور ہوا ہو گیا۔

اصغر کی باتیں وہ تھیں جو نہ دھری جائیں نہ اٹھائی جائیں۔ بلقیس اگر سہہ رہی تھی تو اس کا فرض تھا۔ وہ بیوی تھی۔ مگر بیگم شہباز کا ہے کو داماد کی گستاخیاں برداشت کر کے للو پتو کرتیں۔ ان کی تنک مزاجی اس بات کی کب متحمل ہو سکتی تھی۔ پھر ان کا رشتہ بڑا تھا۔ وہ آخر کو ساس تھیں۔

بلقیس جو کام کر کے رکھتی اصغر ڈھونڈھ ڈھونڈ کر عیب نکالتا جھینکتا پیٹتا۔ ایک دن بیگم شہباز وہیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر تک تو اس کا طنطنہ دیکھتی رہیں پھر کہنے لگیں:

"اے میاں اصغر ہوش کی لو۔ آخر تیسوں دن اس طرح ہائے توائی کوئی بھلے مانسوں کا شیوہ ہے۔ آخر آدمی کہاں تک صبر کر سکتا ہے۔ اب کیا، مہینوں سے تمہارا یہی چلن دیکھ رہی ہوں۔ بیوی بچی جیسے تم کو زہر لگتے ہیں۔ آخر تمہاری منشار کیا ہے؟"

اصغر نے ترش رو ہو کر کہا:

"ذرا فرمایئے تو میرا کونسا چلن دیکھ رہی ہیں؟"

"بس میاں بس منہ نہ کھلواؤ۔ اب تو اٹھتے جوتی اور بیٹھتے لات کی کسر رہ گئی ہے۔"

اصغر بگڑ کر بولا:

"خوب صاحب خوب۔ میرا انہیں دیکھتیں کہ میں بھی آخر آدمی ہوں۔ گھن چکر تو نہیں ہوں۔ مجھے بھی آرام اور تنہائی کی ضرورت ہے۔ دن بھر کولہو کے بیل کی طرح جتا رہتا ہوں اور گھر میں آ کر دو گھڑی کا چین بھی نصیب نہ ہو، نہ میری کوئی چیز جگہ پر ملے۔ پھر شادی کا کیا فائدہ؟"

بیگم شہباز نے بھی تڑاق سے کہا،

"اے تو کسی پر کیا احسان ہے۔ کونسا مرد وا بغیر ہاتھ پیر ہلائے بیٹھا رہتا ہے۔ دنیا جہان کے مرد اپنے بال بچوں کے سکھ چین کے لیے کرتے ہیں۔ تم نے کیا کمال دکھایا۔ کوئی عرش کے تارے توڑ کر لا دیتے ہو؟"

"خیر چھوڑیے۔ میں تو کچھ نہیں کرتا۔ مجھے میرے حال پر تنہا چھوڑ دیجیے۔"

"لو یہ بھی نرالی کہی۔ اوئی ایسے ہی اکیلے چھڑے رہنے کا شوق تھا تو تم نے شادی ہی کیوں کی۔ کس نے تمہارے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔ اب تو نور کے لڈو کھالیے۔ تمہاری ذمہ داری ہے۔ سن لو۔ میں نے بھی اپنی بیٹی کو سے ہنکنی بنا کر تمہارے گھر کی چوکسی کرنے کو نہیں دی تھی۔ آخر میاں کے بھی کچھ فرائض ہوتے ہیں۔"

"تو آپ ہی فرما دیجیے نا، میں اپنے فرائض کس طرح انجام دوں جو آپ کو نظر آئیں۔ باہر کا سنبھالوں، کمانے کی فکر کروں یا گھر میں آپ کی بیٹی کی ناز برداری کرتا رہوں۔" اصغر نے اونچی آواز سے جواب دیا۔

بیگم شہباز جو کچھ کہہ رہی تھیں یہ باتیں چاہے ترش سہی مگر تھیں پتے کی اور اسی وجہ سے اصغر زیادہ بُرا مانتا رہا۔

"بس رہنے دو۔ مجھے دیدے نہ دکھاؤ۔ میں کسی خوشی خاں سے نہیں ڈرتی۔ یہ گیدڑ بھبکیاں تو کسی اور کو دکھانا۔ اے میں نے تمہیں کیا کہا ہے جو آپے سے باہر ہوئے جا رہے ہو۔ سب پہلے ہی سوچ لیا ہوتا۔ کیوں پرائی جانوں کا روگ پالا۔ میں تم کو ہرگز ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ بہت کماؤ، گھر میں بیٹھ جاؤ۔ بیوی کو کسی کے گھر کی ماماگیری کرنے بھیج دینا۔"

اصغر بھی چلا کر بولا:

"اپنی بیٹی سے پوچھ لیجیے کب انہیں تنگی ترشی ہوئی ہے یا میں نے کبھی ہاتھ

روکا ہے۔ بلکہ اپنی بساط سے زیادہ ہی کیا۔ جب ہی تو یہ صلہ مل رہا ہے۔"
"تو کون کہتا ہے کہ لنگوٹی میں پھاگ کھیلو۔ بیوی خالی خولی روٹی کپڑے کی ننگی بھوکی نہیں ہوتی۔ آخر پیار محبت کا سلوک اور دو میٹھے بول بھی کوئی چیز ہے۔"
"معاف کیجیے میں نے یہ سب شرائط نکاح نامے میں نہیں لکھے تھے جب مجھ میں یہ اُپج ہی نہیں تو کہاں سے لاؤں۔ اور جب آپ بیٹی دے رہی تھیں آپکو معلوم تھا میں کیسا آدمی ہوں۔ آپ کے بھی آنکھیں تھیں دیکھ لیا ہوتا۔ اب مجھ سے کیا شکایت ہے۔"
بیگم شہباز تو یہ کہہ کر اپنے گھر آگئیں کہ "سلام ہے تمہاری زبان کو" اور اصغر بلقیس پر برس پڑا:
"مجھے بھی تو بتاؤ تم کو کب میں نے فاقوں مارا ہے۔"
"مگر کون کہتا ہے؟" بلقیس نے دھیرے سے کہا۔
"تمہاری اماں جان اور کون! کیا تم نہیں سُن رہی تھیں؟"
"مجھ سے کسی چیز کی قسم لے لیجیے جو کبھی اماں سے ایک لفظ بھی آپ کے خلاف کہا ہو۔ آپ میری بات کا یقین کیجیے۔"
"بالفرض تم کو مجھ سے کوئی شکایت تھی بھی تو مجھ سے کہتیں۔"
"مگر میں نے اماں سے نہیں کہا۔" اور وہ رونے لگی۔
اصغر منہ چڑانے کے انداز میں بولا:
"یہ عجب تماشا ہے کہ ساس ٹانگ لیں کہ بیٹی پر فاقے ٹوٹ رہے ہیں اور بیٹی سے پوچھو تو بڑی ننھی نادان بن کر کہیں مجھے نہیں معلوم۔ ماں بیٹیوں نے مل کر میری زندگی وبال کر دی۔ پھٹکار ایسی زندگی پر۔ بہتر ہے چار کوڑی کا زہر کھا کر سو رہوں۔ اس عذاب سے نجات تو ہو جاؤں گا۔"

اصغر طیش میں اناپ شناپ بکے چلا گیا اور بلقیس کو روتا دیکھ کر جل کے بولا:
"ٹسوے بہانے کی ضرورت نہیں"
اتنا سنتے ہی بلقیس جیسے بہری بٹ ہو گئی اور اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا اس ایک آن میں یہ معلوم ہوا کہ اچانک وہ آئینہ اس کے ہاتھ سے ترٹتے چھوٹ گیا جس میں وہ اپنی شکل دیکھ رہی تھی۔ ایک چھناکے کے ساتھ بکھر کر سچ میں اس کی صورت ریزہ ریزہ ہو کر فرش پر بکھر گئی۔ ٹوٹے آبگینے کہیں جڑتے ہیں۔
شب کی سیاہی میں اس کی ہچکیاں ابھرتی ڈوبتی رہیں مگر اصغر پر سان حال نہ ہوا۔ اور جس طرح ایک نابینا کے لیے دن کا اجالا اور رات کی سیاہی کوئی معنی نہیں رکھتے، بلقیس کے نزدیک بھی اپنی موت و زیست کا مفہوم باقی نہ رہا۔ اور ساس سے دو بدو لڑائی ہو جانے کے بعد اصغر کا رہا سہا لحاظ بھی ٹوٹ گیا اور جیسے اسے پروانۂ آزادی مل گیا ہو، وہ بے فکر ہو کر گھر سے غائب رہنے لگا۔

۸

پھر ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ بستی بستی سے جوان بھرتی کیے جانے لگے اور دلی کی سڑکوں پر رنگروٹ قواعد کرتے ہوئے دکھائی دیتے اور گلی کوچے ان کے رزمیہ ترانوں سے بجتے رہتے:

بھرتی ہو جا نا رے باہر کھڑے رنگروٹ
یہاں چلائے لاٹھی سونٹھا وہاں چلے بندوک

جو خود مفتوح ہو چکے تھے اب اپنے فاتحین کے لیے رزم آرا ہو گئے تھے۔ اور یہ دھرتی کے وہ کڑیل سپوت اور بیش بہا لال تھے جو محض بارہ روپیے کی تنخواہوں کے عوض ایندھن بن کر لڑائی کے جہنم میں جھونکے جا رہے تھے۔

گاؤں کے آئے ہوئے یہ لمبے تڑنگے تندرست جاٹ، میوا ور رانگڑ جوان جواب فوجی وردیوں میں کسے کسائے رہتے تھے چاندنی چوک کی سجی سجائی دوکانوں پر ان کے جمگھٹے نظر آتے بھونچکا ہو ہو کر وہ دوکانوں کی چیزوں کو دیکھتے۔ حیرت و استعجاب سے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ چھوٹے چھوٹے دیہاتوں

میں رہنے والوں نے بھلا کب یہ رنگ وحسن دیکھا تھا۔ شہر کی ہر بات ان کے لیے نئی تھی اور دلکش۔ اور وہ تمام دن بازار میں کھوئے کھوئے ایلے گیلے پھرتے۔ وسیع و فراخ دلّی ان کے واسطے بھول بھلیاں کا شہر ہوگئی تھی۔

یوں تو مرزا دودھ والے کی دوکان ہمیشہ سے گپ شپ کا اڈہ تھی اور بیکار وقت گزارنے کا ٹھیّا، مگر اب تو اس کی حیثیت اچھی خاصی چوپال کی سی ہوگئی تھی۔ جنگ کی گرما گرمی ہوتے ہی دوکان رات کو دیر تک کھلی رہنے لگی جہاں کلّن کبابی صدیق بنیا اور خلیفہ جی تو ہوتے ہی تھے مگر محلّے کے اور لوگ بھی جمع ہو کر سیاست بگھارتے اور اپنی اپنی عقل و خرد کے مطابق جنگ کے متعلق قیاس آرائیاں کرتے اور اپنے علم کے موافق جنگی خبروں پر تنقید و تبصرے ہوتے، معاشی بحران اور لڑائی کے سود و زیاں پر گفتگو ہوتی، تخریبی مشینوں، مہلک بموں اور نئی نئی ایجادوں کی سنسنی خیز خبریں بڑے وثوق سے سنائی جاتیں۔ کلّن کبابی حقّہ اپنی طرف سرکاتے ہوئے کہتا:

"دئی مرزا پیارے ہماری عقل تو گھن چکّر بن گئی۔ بڑوں سے کہانیوں میں جو سنتے تھے جبتی زندگی ان آنکھوں سے دیکھ لیا۔ قربان ان انگریزوں پر، جادو کر دکھایا۔ سنا تم نے بھئی واللہ ایسی مشین بنائی ہے کہ وس کے اندر ہزّار دو ہزّار آدمی ایسے گھس جائیں جیسے مرغی کے پیٹ میں انڈا۔ اوئی مشین ہے یا عمر عیّار کی زنبیل۔ اور سن لو۔ دشمنوں کے بیچوں بیچ اس طریوں سر سراتی جاتی ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔ اور پھر پھک دِنا سے ہزار آدمی بندوقیں تانے دے باہرے کھڑے وے ہیں۔"

اور بیٹھنے والوں میں سے کوئی اپنے ذہنِ رسا کا اظہار کرتا:

"یار دِن کی تو پتلونیں ڈھیلی ہو جاتی ہوں گی۔"

خلیفہ کہتا: "ابے جرمن تو انگریز کا بھی باپ نکلا۔ دئی وِس نے تو انگریز کو نگنی کا ناچ نچا دیا۔ ایسے چرکھے داؤں مارتا ہے کہ خدا کی قسم وِن کا توڑ ہی نہیں۔ سپاہیوں کی ڈاڑھیاں بڑھ جاتی ہیں، بیارے خندقوں میں بیٹھے بیٹھے اور وِن میں پھر شروع ہوتی ہے کھاج، اور بندر کی طریوں نوچتے ہیں تو جرمن کیا کرتا ہے کہ خود ہی پیچھے ہٹ جاتا ہے میدان چھوڑ کے جیسے پِٹّا پہلوان ہٹ جاتا تھا، بس وِسی طریوں۔ اور یہ انگریز بھیّا بدھو پیر مزے میں آن آگے کو بڑھتے چلے جاتے ہیں اور وِن کے مُنھ کانوں پر جو پہنچتے ہیں تو وِنہیں استرے مل جاتے ہیں، بیارے یہ تو ہیں ہی دن کے اندھے سب بھول بھال اپنی کھجلی مٹانے استرے لے کے بیٹھ جاتے ہیں مونڈنے کو۔ یہ باشایہ استرے زہر کے بجھے ہوتے ہیں۔ بس سمجھ لو ادھر تو مُنڈے کے کیسر و سا نکلا وِدھر ملک الموت نے ٹینٹوا دبایا ہیں۔ ہزاروں لیٹے کے لیٹے رہ گئے۔ اب پڑے دے ہیں بلبے بلبے۔"

بڑھئی بھی حقّہ کا کش بھرتا اور اس سے بھی زیادہ نئی اور پھڑکتی ہوئی تازہ بتازہ خبر سناتا:

"وئی پیارے تم نے ابھی سنا ہی کیا ہے۔ بچّو وِس جرمن والے نے تو شیطان کے بھی کان کتر دیے۔ وِنہوں نے ایک مرغا بھی بنایا ہے کاٹ کا گگرڑوں کوں کرتا دا دئی بیتا نہیں چلتا بالکل اصل۔ وئی یہ تو مرے ہے ہیں نافاقوں، خندقوں میں پڑے چنے چبا رہے ہیں۔ وہ اپنا مرغا وِدھر کی طرف چھوڑ دیتا ہے۔ یہ بھوکے بنگالی جو مرغا آتا دیکھتے ہیں۔ کنگلوں کی طریوں وِس پر پل پڑتے ہیں۔ وئی ہاتھ لگایا اور پیٹ وِنا وہ بولا کنکڑوں کوں اور منہ میں سے گولیاں چلنی شروع ہوئیں دنادن۔ اور پیارے ایک طرف سے نہیں مارتا وہ پیچھے سے بھی چھوڑتا ہے زہریلی۔ کچھ ادھر اگاڑی سے مرے کچھ پچھاڑی سے لیٹے کے لیٹے رہ جاؤ۔ میری جان کھاؤ مرغا بیارو۔ وئی

کیا عقل پائی ہے وِ ِسنے۔ اماں داستانِ امیر حمزہ کے کرشمے نظر آتے ہیں۔"

اور اس خبر پر کوئی رائے زنی کرتا:

"وہاں کیا شان ہے وِس پاک پروردگار کی۔ اب آئیں گے بچہ جی کو مزے، یوں جانو فرعون کو موسیٰ مل گیا۔"

کبابی کہنے لگا:

"ابے حیران کیا ہو رہا ہے؟ تو نے مرغی والی بھی سُنی؟ پیارے انڈے بھی بن بیٹھے ہیں وِنہوں نے۔ اپنے کیمپ میں چھوڑ جاتے ہیں پڑے وِسے اِدھر اُدھر۔ یار لوگ سمجھتے ہیں اللہ میاں نے مرغیاں وِن پر رحم کھا کر نازل کر دی ہیں جنگل میں انڈے دینے کو وِن کے لیے۔ ضیافت اتر رہی ہے وِنہوں کے لیے آسمان سے، یہ پتا ہی نہیں کہ ملک الموت کا انڈا ہے وِدھر دانت لگایا نہیں کہ پٹاخہ چھوٹا۔ مُنڈیا غائب دھڑ ہی دھڑ رہ گیا۔ اب ہلے جاؤ۔"

اتنے میں ایک گاہک آگیا اور مرزا دودھ والا بڑی پھرتی سے دودھ کو ایک لٹیا میں سے دوسری میں اچھال اچھال کر ٹھنڈا کرنے لگا۔ دودھ کا ایک تار بندھ جاتا اور جب اوپر کی لٹیا میں سے دھار نیچے کی لٹیا میں گرتی تو دودھ کی ہلکی ہلکی شر شر کی آواز نکلتی اور اس میں جھاگ اٹھنے لگتے۔ کبابی کا قصہ سن کر اس سے نہ رہا گیا اور کہنے لگا:

"وِن کا رعاب شہاب یا رخاں پر تو پڑتا نہیں۔ پیارے الو بنا دیے ہیں ہریالی دکھا دیتے ہیں ہریالی۔ خدا قسم چاروں طرف موت برستی ہے۔ ہمارے جوانوں کو اپنی لُگائیوں کا لالچ دے دے کر لے جاتے ہیں اور کوئی میم ٹکے کو نہیں پوچھتی۔ لندن میں بھتوڑی رو گئے ہیں۔ سیدھے لے جاتے ہیں موت کی کوٹھڑی میں جہاں آگ برس رہی ہے دن کو بھی رات کو بھی۔ وہاں وہ پیار کرتی ہے، بھینچ بھینچ کے گلے

لگاتی ہے۔ یہ باولے بودم وہاں جا جا کے جان بے فضول دیتے ہیں کوری بارکا دپی
کے لیے۔ خدا قسم اللہ میاں کے ہاں بھی دوزخ ملے گی۔ جاؤ سالو میموں کے لالچ میں۔
نہ میم ہی ملے گی نہ حور ہاتھ آئے۔ یہاں بھی جلتے رہنا وہاں بھی دوزخ میں۔ میں
کہتا ہوں ہم سے بڑا گدھا بھی کوئی نہیں اور انگریز سے زیادہ ہشیار بھی کوئی نہیں۔ جیسے گدھے
والا دور سے گدھے کو گاجر دکھاتا رہتا ہے۔ وہی طریوں یہ بھی لاسے پرلے جارہے ہیں، گاجر
نہیں ملتی بوجھا ڈھوئے جاؤ پیارے۔"

یہ کہہ کر مرزا رُکا اور دودھ مٹی کے آبخورے میں ڈال کر کڑھاؤ کے کنارے سے
بالائی کا موٹا سا ٹکڑا کھچے سے کاٹ کر دودھ میں ڈال دیا اور اوپر سے بھا جھڑک کر
گاہک کی سمت بڑھا دیا۔ گاہک دوکان پر ہی کھڑے کھڑے پھونک مار مار کر دودھ ٹھنڈا
کر کے پینے لگا اور مرزا اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا:

"وہی کھری کھری تو یہ ہے کہ یہ انگریزوں کی ساری چکنی چپڑی باتیں ہیں۔ وہاں
نہ عورت ملتی ہے نہ دھن دولت۔ فقط جہاز میں ایک دفعہ بیٹھنے کی دیر ہے کہ بیٹا
چوہے دان کا منہ بند۔ پھر سمندر پار لے جا کر قربانی کے بکروں کے طریوں قصائی کے حوالے
کر دیتا ہے۔ بوٹیاں کی بوٹیاں کھا جائے اور ہڈیوں تلک کا شُروا پی جائے۔ نہ ہڈی
ملے نہ بوٹی۔ کبھی قبر بھی نہ بنے پیارے کہ آل اولاد کبھی فاتحہ ہی پڑھ لے۔ رانڈ بیٹھی
روتی رہے۔ مر گئے مردود جن کی فاتحہ نہ درود۔"

جذبات کی شدت سے اس کی آواز اونچی ہو گئی جس میں فکر و اندیشہ اور تاسف
کی ملی جلی کیفیت تھی۔ وہ ذرا کی ذرا رُکا اور پھر بولا:

"بڑا دربار رچایا تھا۔ قسم ہے وِس مولا کی ایسی منحوس گھڑی کبھی آئی ہی نہ ہوگی۔
اس دن سے جو مہنگائی بڑھنی شروع ہوئی تو آج تورڑی بڑھتی ہی جارہی ہے۔ نہ چینی
ملے نہ گیہوں۔ چڑھ جا بیٹا سولی پر رام بھلی کرے گا۔ چھپّنیا کال میں بھی ایسا حال

نہیں دیکھا۔ پیارے اجاڑکی بِدیا ہے اجاڑکی۔ اندھیر ہے گھی تو نوں ماشوں بکنے لگا اور بلیا ڈنڈی مارتا ہے سو نفع میں پیسے دھڑی کی چیز اشرفیوں کے مول ہو گئی ''۔

دوکان میں بیٹھے ہوئے لوگ خاموشی سے مرزا کی باتیں سن رہے تھے۔ کوئی حقہ کا دم کھینچتا تو گڑگڑ کی آواز آتی۔ ایک بلی دوکان کے پٹرے کے نیچے بیٹھی ہوئی کبھی کبھی باریک سی میاؤں کرتی اور چراغ کی پیلی روشنی میں اس کی ہری آنکھیں چمک جاتیں۔ مرزا نے سانس لے کر کہا:

'' گیہوں تو آٹھ سیر کا تم سب ہی کھا رہے ہو میں کیا کہوں۔ یہ اپنے یاروں کے لیے بھر بھر کے لیے جاتے ہیں جہازوں پر جہاز ہمارا پیٹ کاٹ کے۔ قربان پاک پروردگار کے جنم نہ دیکھا بوریا اور سپنے آئی کھاٹ۔ اب ہمارے ان داتا بنے بیٹھے ہیں۔ مگر جیسے کو تیسا۔ ان جرمن جنوائی نے بھی وہ گولا تاک کے مارا کہ جہاز سمندر کی پاتال میں۔ نہ تو کو نہ موکو، لے چولے میں جھونکو ''۔ پھر اس نے سرسری نظر ڈال کر کہا:

'' یارو، تم ہی ایمان سے کہو جو میں کہہ رہا ہوں کیا جھوٹ ہے؟ ''

اس وقت مرزا کی چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھیں باہر کو ابھر آئی تھیں اور اس کی سفید جھگی ڈاڑھی کے بال مدھم روشنی میں چمک رہے تھے اور ڈاڑھی کی نوک خنجر کی طرح نوکیلی نظر آ رہی تھی۔

کلن بڑھئی کے ہاتھ میں حقے کی نے اس کے منہ میں لگی ہوئی تھی۔ خریدار بھی مرزا کی باتوں میں اتنا محو تھا کہ اپنا دودھ ابھی تک ختم نہ کیا تھا۔ اس کا آخری جملہ سن کر سب نے ہم زبان ہو کر مرزا کی تائید کی۔

'' وئی خدا کی قسم بات تو پیارے سولہ آنے نقد کہی ''۔

کبابی غصے سے کہنے لگا:

'' قسم ہے سولہ آنے کی یہ فرنگی حرام کے نطفے شیطان کی اولاد، کیا کیا باتیں

بنائی تھیں، اور ہم بھولے بھالے وِن کے بہکاوے میں آ گئے۔"

اس پر کلن بڑھئی نے افسوس سے کہا:

"اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ سر پکڑ کے روؤ۔"

صدیق بنیا بھی دوران گفتگو میں دوکان کی طرف آ نکلا تھا اور لکڑی کے ٹیڑے سے لگا ہوا جس پر سب بیٹھے ہوئے تھے مرزا کی باتیں سُن رہا تھا۔ وہ موٹا تازہ تھا اور بیچ رنگی تہبند اس کے گول مٹول کولھوں پر طبلے کے غلاف کی طرح منڈھی ہوئی تھی۔ اس کی مٹکا سی توند کی نوک نمایاں طور پر ابھری ہوئی تھی اور گال مٹاپے کی وجہ سے اتنے پھول گئے تھے کہ آنکھیں چھوٹی ہو کر درز کی طرح دکھائی دیتی تھیں کھانے پینے کی چیزوں کی قیمتیں چڑھ جانے سے اس کے پو بارہ ہو گئے تھے۔ اس نے موقعے سے فائدہ اٹھا کر گندم کی کھتّیاں بھر لی تھیں اور اب دوگنے چوگنے فروخت کر رہا تھا۔ کبھی کبھی چوری چھپے بغیر چنگی اور محصول کے منگوایا کرتا اور ہر چیز پر اصل سے کہیں زیادہ منافع کماتا۔ اسی لیے وہ ہمیشہ انگریزوں کی طرف داریاں کرتا اور ان کے راج کو سراہتا۔ جب سب خاموش ہو گئے تو اپنی توند پر آسودگی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا:

"بات تو آپ کی نغد ہے مل اتنا میں بھی کہوں گا کہ اپنے ہی بادشا کے برخلاف اس طریوں سر اٹھانا اچھا نہیں۔"

مرزا اس جملے کو سنتے ہی بھڑک اٹھا اور کہنے لگا:

"بڑا حمایتی بن کر آیا ہے کہیں سے۔ یہ کافر ہوگا تیرا بادشا تیرے باپ دادا کا بادشا ہمارا بادشا ہمارے رب کے سوا اور کوئی نہیں۔"

صدیق بھی ذرا تن کر بولا:

"قسم ہے اگر ان چھلّے کی لو اور جو کچھ کہے ہم مان لیں گے مل بادشا بادشا ہوتا ہے۔

اور اللہ نے کنگ جارج کو ہمارا باشا بنایا ہے اور تم اللہ کے بنائے وے باشالی ذلت کرتے ہو تو کسی طریوں روا نہیں جس پتیلی میں کھاتے ہو وسی کے پیندے میں چھید کرتے تمہیں شرم نہیں آتی؟ ..... "

دوکان میں لٹکی ہوئی مٹی کے تیل کی کپی کی بتی کا گل جل جل کر جھڑ رہا تھا اور اس کی لہراتی ہوئی سرخی مائل زرد روشنی صدیق کے چہرے پر کچھ اس طرح پڑ رہی تھی کہ وہ کسی سوانگ کا بہروپیا معلوم ہوتا تھا۔ مرزا نے بدمزگی سے ٹکڑا توڑ کر جواب دیا:

"ہم اپنے مولا کا دیا کھاتے ہیں۔ اللہ نے اپنے کلام پاک میں رسول کو ہمارا بادشا بنایا ہے۔ ہمارا اور کوئی باشا واشا نہیں۔"

خریدار پورا دودھ پی چکا تھا اور اس نے آبخورہ دوکان کے سامنے پھینک دیا۔ تڑ سے ایک تڑاخا فضا میں لرزا اور آبخورے کے ٹوٹے ہوئے ٹھیکرے زمین پر بکھر گئے۔ تختے کے نیچے سے ایک بلی نکل آئی اور چھوٹے ٹکڑوں کو چاٹنے لگی۔

"اور تو بڑا رستم کا سالا نکل کے آیا ہے۔ اسو خت بڑا یار غار بن کر نمک حلالی نکھارا رہا ہے۔ بچو جب دھر لیں گے تو میا کو پکاروگے۔ وس وخت یاد کر لیجو کہ مرزا دودھ والا کہتا ..... "

بات بڑھتے دیکھ کر کالن بولا:

"ابے او صدیق! تانا شاہ کے سالے، پھر کسی دن یہ سبق پڑھا یو۔ ابھی تان۔"

یہ سن کر سب زور سے ہنس دیے۔ اور صدیق اپنا سا منہ لے کر رہ گیا، اور وہاں سے چلتا بنا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ کپی کی لو ادھر سے اُدھر لہرائی، بل کھایا اور بھڑک کر بجھ گئی پھر گلی میں مکمل اندھیرا ہو گیا۔

۹

ایک روز میر نہال نواب چھتن کے ہاں سے گھر واپس آرہے تھے۔ شام ہونیوالی تھی۔ بازار ہمیشہ کی طرح بارونق تھے۔ لوگ حسب معمول خرید و فروخت میں مصروف تھے اور سڑکوں پر تانگوں، بگھیوں اور اِکوں کا شور رہتا۔ ٹریم گاڑیاں آتیں، ٹھہرتیں اور چلی جاتیں۔ پہیوں کی گھڑ گھڑ اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی ٹکاٹک کے ساتھ کوچوانوں اور سائیسوں کی آوازیں ابھرتیں اور خونچے والوں کی مختلف صداؤں میں مل کر کھو جاتیں، اور فضا میں ایک مسلسل بھنبھناہٹ سنائی دیتی۔ مگر میر نہال زندگی کی بھاگ دوڑ سے بے پرواہ بھیڑ بھاڑ سے بچتے بچاتے پٹری پٹری چلے جا رہے تھے۔

چلتے چلتے انھوں نے یوں ہی گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔ آسمان پر اس وقت گنتی کے کبوتر اڑ رہے تھے۔ ان کو یہ تبدیلی اچانک محسوس ہوئی اور خاصا تعجب ہوا جنگ کی وجہ سے یوں تو بظاہر دلی کے حالات میں کوئی خاص فرق نہ پڑا تھا، مگر اناج کے بھاؤ بڑھ گئے تھے جس کی لپیٹ میں کم حیثیت والے لوگ آ گئے اور سہاشما اور غریب طبقہ لازماً متاثر ہوا۔ ان میں نائی، دھوبی، قصائی، سقے سے لے کر

ہر قسم کی چھوٹی بڑی صنعت و حرفت کے دستکار، جیسے زردوز، گوٹے ٹھپے اور کرن بنانے والے، چھیپی اور دبکیے ٹھٹھیرے، ساد ے کار اور قلعی گر، ریشمی اور بنارسی کپڑا بننے والے جلاہے، منہیار اور تار کش غرض ہر طرح کے لوگ شامل تھے۔ ہر چیز کی کساد بازاری بڑھ رہی تھی، اور روزمرہ استعمال ہونے والی معمولی معمولی چیزوں کے دام آگ مول ہوگئے۔ اس کے برعکس محنت کش لوگوں کی پونجیاں گھٹتی جا رہی تھیں اور وہ قلاش ہو گئے تھے۔ انگلستان اور جرمنی سے مشینوں کا بنا ہوا مال بازار میں ارزاں نرخ پر بکنا شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ ان پیشہ وروں کے روزگار مندے ہوگئے اور اب بلکہ انھیں اپنے ہی جان و تن کی پڑ گئی تھی تو بھلا شوق کیوں کر قایم رکھتے۔ یہ ان کی بساط سے باہر تھا کہ جانور پال کر انھیں اتنا مہنگا اناج کھلائیں۔ مجبوراً انھوں نے کبوتر پالنے چھوڑ دیے۔

دراصل یہ شوق ان ہی کارخانے داروں کا تھا۔ یہی وہ دلی کے دل والے تھے جن کے منہ چکنے اور پیٹ خالی تھے اور ان ہی کے دموں سے غدر کے بعد بھی دلی کا بچا کھچا، لٹا پٹا حسن کچھ نہ کچھ باقی تھا اور دلی کی پرانی شوخیاں کچھ برقرار تھیں۔ لہٰذا ان کے وجود غنیمت تھے جن کی زندہ دلی سے وہ جولانیاں اور دلی کے اوصاف وابستہ تھے۔ لیکن اب زمانہ کی کروٹ کے ساتھ یہ تمام رنگ رلیاں دم بدم مٹتی جا رہی تھیں، شوق اور ذوق فنا ہوتے جاتے تھے۔ البتہ کچھ کھاتے پیتے آسودہ حال لوگ باقی تھے جو باوجود مہنگائی کے اپنے شوقوں کو پورا کر سکتے تھے اور انھوں نے اپنی کبوتر بازی برقرار رکھی۔ لیکن یہ لوگ اتنے ہی تھے جتنا آٹے میں نمک۔ اور میر نہال کو اس وقت چند کبوتر دیکھ کر حالات کے اس طرح بدل جانے کا تلخ احساس ہوا اور وہ اپنے دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے راستہ طے کرتے رہے۔

چلتے چلتے اچانک ان کو ایک گھمیری آئی اور غشی کی سی حالت ہوگئی۔ وہ فوراً رُکے اور جلدی سے ایک دیوار پکڑ کر سہارا لیا۔ گہرے اور لمبے سانس لے کر انھوں نے اپنے کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ وہ خاصی دیر تک آنکھیں بند کیے کھڑے رہے اور جب سر کے چکر ذرا کم ہوئے اور آنکھوں کا اندھیرا دور ہوا تو آنکھیں کھول کر جھپکائیں۔ گو اندھیرا تو کم ہو چکا تھا مگر آنکھوں کے آگے تارے ناچ رہے تھے اور سر بھاری تھا۔ جب وہ چلنے کو بڑھے تو قریب کی موری میں ایک مرا ہوا کبوتر پڑا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے پھیلے ہوئے بازو نالی کے گندے پانی میں بھیگ کر کیچ ہو رہے تھے اور نیلی کچ ٹانگیں اکڑ کر اوپر کو اٹھی ہوئی نالی سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ایک آنکھ جو پھول کر بدنمائی سے باہر ابلنے کے قریب تھی اس کی پتھرائی ہوئی مردہ روشنی بہت بھیانک تھی۔ مردہ کبوتر کو دیکھ کر میر نہال کو اپنے کبوتر یاد آنے لگے۔ کبھی انھیں کبوتروں کا شوق عشق کی حد تک تھا اور اپنے پرانے شوق کی پرانی یادان کے ذہن میں اجاگر ہو گئیں۔ جب وہ ایک گلی کے نکڑ پر مڑنے والے تھے کہ سامنے سے لوگ کسی کا جنازہ کندھوں پر لیے ہوئے آہستہ آہستہ آتے دکھائی دیے۔

میر نہال نے منہ ہی منہ میں کلمہ پڑھا اور میت کے ساتھ چالیس قدم گئے۔ جس دم کافور کی تازی تازی یاس انگیز خوشبو ان کی ناک میں بھکا بھک گھسی ہے تو ان کو وحشت سی ہونے لگی۔ سر گھومتا ہوا معلوم ہوا۔ وہ قدم بڑھا کر یہ سوچتے ہوئے چلے کہ آج ہی اپنی بیاض میں سے کوئی قبض کشا نسخہ نکال کر تیار کریں گے۔

ادھر میر نہال ڈیوڑھی میں داخل ہوئے ادھر نثار احمد نے مغرب کی اذان دی۔ انھوں نے جلدی جلدی وضو کیا اور بیٹھک میں فرش پر جا نماز بچھا کر نیت باندھ لی۔ گو سر سیسے کی طرح معلوم ہوتا تھا اور چکر لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہے تھے مگر انھوں نے اسے اپنا واہمہ سمجھا اور نماز میں مشغول رہے۔ لیکن رکوع کے بعد وہ جب

سجدے میں گئے رہیں تو پھر سر نہ اٹھا سکے اور اچانک ایک طرف کو لڑھک گئے۔ ان کا پورا جسم بے جان معلوم ہوتا تھا۔ ہاتھ پیروں کی طاقت سلب ہو گئی تھی اور ان میں اتنی سکت باقی نہ رہی کہ خود اٹھ سکتے۔ انھوں نے کسی کو آواز دینی چاہی مگر نہ تو حلق سے آواز نکلتی تھی اور نہ زبان ساتھ دیتی تھی۔ وہ گنڈلی منڈلی بنے وہیں پڑے رہے۔

غفور جب ان کے لیے حقہ تازہ کر کے اندر لایا تو اس نے میر نہال کو اس عالم میں پڑا دیکھا۔ وہ گھبرا گیا اور انھیں اٹھانے دوڑا:

"سرکار کیسے ہیں؟ کیا ہوا؟"

لیکن میر نہال غفور کے سوالوں کا جواب دینے سے قاصر تھے۔ جب وہ نہ بولے نہ چالے تو غفور نے اکیلے ہی بڑی مشکل سے جیسے تیسے کھینچ تان کر انھیں پلنگ پر لٹایا اور رضائی اڑھا دی۔ پھر دیبین کو آواز دے کر بیگم نہال کو خبر کرائی اور خود سر پہ پیر رکھ کر حکیم اجمل خاں کو لینے بھاگا۔

حکیم اجمل خاں سنتے ہی غفور کے ساتھ آ گئے۔ میر نہال ابھی تک اسی کروٹ پڑے تھے۔ انھوں نے نبض دیکھی اور نسخہ لکھا، پھر بولے:

"میر صاحب پر فالج کا اثر ہے مگر شکر کی بات ہے کہ بخار نہیں ہے — انشاء اللہ جلدی صحت یاب ہو جائیں گے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں!"

دلّی کے حکیم اپنی وضعداریوں میں بے عدیل تھے۔ آدھی رات کو بھی اگر کسی کو ضرورت پڑے تو وہ بلا عذر اسی وقت آ جاتے تھے اور علاج معالجہ تشخیص و تجویز کا قطعی معاوضہ نہ لیتے تھے بلکہ اس کو اپنی کسر شان سمجھتے تھے۔ دلّی والوں سے خصوصاً کبھی انھوں نے ایک پھوٹی کوڑی قبول نہ کی۔ بلکہ غریب غربا کا علاج مفت کرتے، دوائی ٹھنڈائی، ناداروں محتاجوں کو یونہی فراہم کرتے بلکہ بیسیوں مفلس مریضوں کے نام وظیفے اپنی گرہ سے جاری کر دیتے تھے۔

اجمل خاں کے جاتے ہی گھر کے سب لوگ میر نہال کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ بیگم نہال بہت پریشان اور فکر مند تھیں پیشانی کی شکنیں گہری ہو گئی تھیں اور وہ غور سے میاں کے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد پوچھتیں:

"اب جی کیسا ہے؟"

میر نہال کا حال اس وقت ابتر تھا۔ ان کی بنی سنوری ڈاڑھی کے بال بکھر گئے تھے تکلیف اور تناؤ سے آنکھیں اندر کو کھنچتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور ان کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ وہ بیوی کی بات کا جواب دینے کی انتہائی کوشش کرتے مگر مفلوجی سے بے بس تھے۔ غنیمت ہے کہ فالج ایک حصہ پر گرا تھا اور وہ الٹے ہاتھ اور پیر کو حرکت دے سکتے تھے۔

کئی دنوں ان کی یہی کیفیت رہی ایک پہلو سے پڑے پڑے اعضا میں اور اینٹھن ہوتی اور کئی راتیں اور کئی دن ان کو بے چینی اور بے قراری میں گزر گئے۔ حکیم صاحب کا نسخہ برابر پلایا جا رہا تھا۔ انھوں نے غذا میں کبوتر کی یخنی بتائی تھی۔ غفور روزانہ چوک جاتا اور یخنی کے واسطے کبوتر خرید کر لاتا یا دالان کے کارنس میں جن کبوتروں نے گھونسلے بنا رکھے تھے انھیں مسرور پکڑ لیتا۔

مہینہ بیس روز بعد دواؤں نے اثر کیا اور وہ اس قابل ہوئے کہ ایک جملہ پوری طرح بول سکیں۔ مگر بات کر لینا ہی بڑی بات تھی گو ابھی وہ دوسروں کی مدد کے بغیر اٹھ بیٹھ تو نہ سکتے تھے۔ اس عرصے میں ان کے تمام ملاقاتی اور دوست احباب وقتاً فوقتاً آکر حال پوچھتے رہتے اور ہر آنے والا کوئی نہ کوئی آزمودہ نسخہ ضرور بتا جاتا۔

ایک دن کمبل شاہ آ نکلے اور انھوں نے کہا:

"حضرت حکیمی علاج تو بہت کر چکے۔ ہمارے پاس بھی ایک فقیری نسخہ ہے۔"

میر نہال بولے،

"قبلہ آپ جو کچھ بتائیں میں کرنے کو تیار ہوں۔"

کمبل شاہ بولے،

"میر صاحب حواصل منگوائیے، میں اس کا تیل خود تیار کروں گا۔"

اب اس کمبخت چڑیا کا دستیاب کرنا ہی ایک کارے دارد تھا۔ میر نہال نے غفور سے کہا اور وہ جا کر جامع مسجد کے تمام چڑی ماروں سے کہہ آیا۔ لیکن کئی دن چکر لگانے کے بعد بھی کوئی چڑی مار ایسا نہ تھا جو حواصل مہیا کر سکا ہو۔ کسی نے کہا موسم نہیں ہے، کسی نے کہا آدمی لانے کو بھیج رکھے ہیں۔ آخر کار حبیب الدین نے ہی نہ معلوم کہاں سے ایک حواصل پکڑوا کر منگوایا اور میر نہال کو کمبل شاہ کا انتظار رہنے لگا۔ کمبل شاہ فقیر آدمی تھے کوئی ان کا لگا بندھا ٹھکانہ تو تھا نہیں کہ حواصل آتے ہی ان کو بلوا لیا جاتا۔ لہذا ان کے انتظار میں حواصل کی ٹانگ میں غفور نے رسی باندھ کر صحن میں چھوڑ دیا اور بچوں کو ایک نیا اور دلچسپ کھیل ہاتھ آ گیا۔ وہ ادھر ادھر سے آتے اور اس کی لمبی چوڑی چونچ کو چھوتے۔ وہ اپنی زرد چونچ پوری کھولتا اور قرقر کی آواز حلق سے نکال کر چونچ زور سے بند کر لیتا۔ میر نہال اپنے پلنگ پر پڑے پڑے بچوں کو حواصل سے کھیلتا ہوا دیکھتے اور وہ اسی سے محظوظ ہو جاتے۔ انھوں نے زندگی بہ ہر عنوان ہنس کر گزارنا سیکھ لیا اور مفلوجی کے شکنجے میں پھنس کر اپنی دائمی قید پر صبر کر لیا تھا۔

حواصل کا تیل تیار ہوتے ہوتے وقت لگ گیا اور جب وہ تیار ہو کر آیا ہے تو میر نہال کو پلنگ پر پڑے تین ماہ ہو چکے تھے۔ شمو خاں پہلوان روز آ کر حواصل کے تیل کی مالش گھنٹہ سوا گھنٹے تک کرتے اور اپنے استادانہ ہاتھ دکھاتے اور میر نہال کو پورے وثوق سے یقین دلاتے کہ اب کی جمعرات آپ اپنے پیروں پہ کھڑے

ہو جائیں گے۔

"سرکار! آپ کی حالت تو کچھ بھی نہیں۔ میاں ایسے ایسے فالج والے جن کو حکیم اجمل خاں بھی جواب دے چکے تھے شمو خاں کی مالش سے چار دن میں قلانچیں بھرنے لگے۔"

مگر پہلوان کی استادی اور کمال سے بھی کچھ افاقہ نہ ہوا اور بعض وقت وہ نہایت خستہ دل اور بیزار ہو جاتے لیکن پھر امیدیں اپنے حلیہ و فریب میں مبتلا کرتیں اور ہر شب وہ اس امید و یقین میں سو جاتے کہ کل جب صبح ہوئی اور وہ اٹھیں گے تو پہلے کی طرح تندرست و توانا ہوں گے۔ لیکن جب صبح ہوتی تو نا امیدی کی وہی تازہ کاریاں ہوتیں اور ان کے صبر و شکیب غارت ہو جاتے۔ اپنے قریب رکھے ہوئے پانی کے بھرے کٹورے کو دیکھتے اور ان کے جذباتِ خودداری کو ٹھیس لگتی اور یہ احساس ان کے دل و دماغ میں چٹکیاں بھرتا کہ وہ زندگی بھر کسی کے احسان مند نہ ہوئے تھے اور اپنے بیٹوں سے بھی اپنے واسطے روپے پیسے کے روادار نہ تھے اور اب وہ اتنے مجبور و لاچار رہ گئے تھے کہ پانی بھی ہاتھ بڑھا کر خود نہ پی سکتے تھے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

مہینوں طرح طرح کے تیلوں کی مالشیں ہوتی رہیں تب جا کر اتنا ہوا کہ وہ پلنگ سے اتر کر کرسی پر بیٹھ جاتے اور لکڑی ٹیک ٹیک کر تھوڑا سا چل پھر لیتے۔ جس دن پہلی بار انھوں نے پلنگ سے پاؤں نیچے اتارا ہے تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ زندگی میں دوبارہ زمین پر قدم رکھنا کس قدر مسرت خیز اور ایک گام چل لینا کتنا امید افزا تھا۔ جس طرح ایک گھٹنیوں چلنے والا بچہ پہلا پہلا قدم اٹھا کر خوش ہوتا ہے اسی طرح وہ اس انوکھی مسرت کے احساس سے دنوں خوش رہے۔

لیکن وقت کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے تھے۔ ایک ایک پہر صدیاں بن کر گزرتا۔ دن کیا کاٹنا پہاڑ ہو جاتا۔ ہر نفس آزار تھا اور زندگی سنگلاخ۔ دن کے وقت

تو پردے کی وجہ سے بیگم نہال دیکھنے نہ آسکتی تھیں مگر رات کو ڈیوڑھی کے پھاٹک بند کرکے کنڈی لگا دی جاتی، اور بیگم نہال کے ساتھ جمال بیگم یا دوسری کنبہ کی بیویاں آ بیٹھتیں اور رات کا کچھ حصہ اس طرح باتوں میں کٹ جاتا۔

مگر بچھونے پر لیٹے لیٹے گرمیوں کے بے کیف لمبے لمبے دن کسی طرح کاٹے نہ کٹتے۔ دن بھر لو کے جھکڑ چلتے، خاک کے بگولے اٹھتے اور ان کے پلنگ کی چادر پر خاک کا بچھونا بچھ جاتا۔ ان کے پٹے بال خاک آلود ہو جاتے، آنکھیں مٹی گھس کر کھٹکتیں اور وہ اپنے معطل وجود سے بیزار تنہا پڑے ہوئے اپنے مرنے کی دعائیں مانگتے۔ یہ بیزاری اس قدر بڑھتی کہ ان کا دل یہی چاہتا کہ کپڑے پھاڑ کر کہیں نکل جائیں اور بے بسی سے آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہنے لگتیں۔

بیکار پڑے پڑے انھوں نے آخر کار اپنے لیے ایک مشغلہ ڈھونڈ نکالا اور گھونسیں پکڑنی شروع کر دیں۔ دلّی میں گھونسوں کی کمی نہ تھی۔ روز دو مارو تو دوسرے دن چار موجود۔ لہٰذا میر نہال نے اندر سے گھونس دان منگوا لیا۔ اس کی کھٹکی تو ٹوٹ چکی تھی لیکن دروازہ سلامت تھا۔ اس میں ڈوری بندھوا کر سرا اپنے پاس رکھتے اور غفور کھی چپڑی روٹی کا ٹکڑا یا ترکاری اس میں لگا کر گھونس دان موری کے قریب رکھ دیتا اور میر نہال بڑی محویت سے چپ چاپ گھونسوں کے انتظار میں لیٹے رہتے — جہاں گھونس اندر جاتی وہ ڈوری جلدی سے کھینچ لیتے اور پھٹاک سے گھونس دان کا دروازہ بند ہو جاتا اور میر نہال اپنی فتحمندی پر اس طرح مسکراتے گویا شیر ببر کو پھانس لیا ہے اور غفور کو آواز لگاتے اور خوش ہو کر کہتے: — "پکڑ لی"، غفور کبھی ہنس دیتا اور کبھی بے دلی سے سن کر خاموش ہو جاتا اور اپنے دل ہی دل میں کہتا کہ سرکار اب سٹھیاتے جا رہے ہیں۔ مسرور کو بلوایا جاتا اور وہ موٹا سا ڈنڈا لے کر گھونس کو مار دیتا۔ دلچسپی بھی

اندر سے آجاتی اور گھونس مارنے کا تماشا دیکھتی اور جب وہ ادھر ادھر بھاگتی تو ٹھٹھا لگاتی۔

گھونسیں دن کو تو بھولے بھٹکے نکلا کرتی تھیں۔ البتہ رات کو سارے گھر میں کھڑ بڑ کرتی پھرتیں۔ میر نہال کی راتیں تو مدتوں سے آنکھوں آنکھوں میں کٹ جایا کرتی تھیں لہٰذا وہ گھونس کے پھنس جانے کے انتظار میں لیٹے رہا کرتے اور جب کوئی شکار دام میں گرفتار ہو جاتا تو وہ خوش خوش سو جاتے۔ صبح کو عفور یا پھر مسرور اس کو مار دیتے۔ شمس تو ڈرتے تھے اور دور ہی سے تماشا دیکھا کرتے۔

ایک دن میر نہال حسب معمول لیٹے ہوئے تھے۔ دوپہر ہو چکی تھی اور بارہ کا عمل تھا۔ چلچلاتی دھوپ آنکھوں کو کھائے جاتی تھی خاک کے بگولے چکر کھاتے ہوئے ہر طرف دھما[illegible] اڑا رہے تھے۔ اس تپش اور جھلسی ہوئی فضا میں پھیری والوں کی آوازیں کانوں کے پار ہوئی جاتی تھیں اور زندگی کی کوفت بڑھ کر نامحرومیوں کا احساس کر دیتی تھی۔ آسمان پر کبوتروں کی دو چار ہی ٹکڑیاں اڑ رہی تھیں۔ انھیں دیکھ کر میر نہال کو گزرے ہوئے دن یاد آ گئے اور وہ خوشی جو اب جدا ہو چکی تھی۔ اتفاقاً ان کی نظر کھجور کے درخت پر پڑی۔ اس کے سارے پتے ایک ایک کر کے مرجھا کر گر چکے تھے اور محض پھننگ پر دو چار پتے جو موسم کے سرد و گرم کی بیداد سے محفوظ رہ گئے تھے ہوا میں ادھر ادھر ہل رہے تھے۔ اس کا تنا بدہیئت ہو گیا تھا اور اس کے وہ گہرے بد نما نشان جہاں کبھی سرسبز و شاداب پتے اپنی بہاریں دکھا کر رخصت ہو گئے تھے وقت و واقعات کی المناک پرچھائیاں بن کر پرانی یادیں تازہ کر رہے تھے۔

میر نہال گھونسدان کی ڈوری ہاتھ میں لیے لیٹے ہوئے تھے اور کبھی کبھی گھونسدان کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ مگر گھونسیں بھی اب ہوشیار ہو گئی تھیں اور

انھوں نے آنا کم کر دیا تھا۔ اتفاق سے ایک نیولن آ گئی، اور روٹی کے ٹکڑے کو باہر سے سونگھنے لگی۔ اسے دیکھ کر میر نہال کو اس رات کی بھولی بسری یاد آ گئی جب انھوں نے ایک ہی جھٹکے میں سانپ کو مار دیا تھا۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ وہ موذیوں کو ہاتھ سے ہلاک کر دیا کرتے تھے اور آج وہ اتنے معذور ہو گئے تھے کہ پنجرے میں گھونسلے میں پکڑ کر ایک بیکار و مجہول زندگی گزارنے پر مجبور تھے، اور یہ جینا بھی کوئی جینا تھا۔

وہ ان ہی غم و اندوہ کا شکار بنے لیٹے ہوئے تھے کہ نیولا بھی اپنے جوڑے کی تلاش میں آ نکلا اور اپنی گردن کے بال پھلا پھلا کر اپنی مادین کے ارد گرد چکر کاٹنے لگا محبت کی آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے نیولن گھونسدان میں گھس گئی۔ لیکن میر نہال نے ڈوری نہیں کھینچی۔ انھیں دفعتاً بنّن جان کا خیال آ گیا جس کو موت نے عشق و محبت کی عین بھری بہار میں اپنے جنگل میں جکڑ لیا تھا۔ جب نیولن گھونسدان کے باہر نکل آئی تو میر نہال نے ڈوری کھینچ کر دروازہ بند کر دیا اور اس ذرا سی لذت کے دروازے جو انھیں اس سعی بے حاصل میں ملتی تھی ہمیشہ ہمیشہ کو مقفل کر دیئے۔

اب سارے مشاغل ختم ہو کر غور و خوض کرنا ہی ان کا ایک مشغلہ رہ گیا اور وہ لیٹے لیٹے پہروں زندگی کے پہلوؤں پر غور کرتے۔ زندگی کے نشیب و فراز، عروج و زوال کے تانے بانوں میں الجھے رہتے اور پھر زندگی کی شفا و نیں انھیں اور زیادہ ستاتیں۔ وہ اس قدر بیزار ہو جاتے کہ ہر چیز وہم و گمان بن جاتی۔ کائنات کا وجود بے مقصد معلوم ہوتا اور کارخانۂ قدرت بے معنی اور نگاہ میں دنیا پھیکی پڑ جاتی۔ ہر شے بے مزہ ہو جاتی۔ آفاق کی گردشیں اور گیتی کی دھڑکنیں ان کے لیے بے کار تھیں۔ اور دہر کی اصلیت و ماہیت بے حقیقت۔ جب ہنگامۂ ہستی بے خروش ہو چکا تھا، احت و سرور جا چکے تھے اور زندگی کا سب حسن کسی نے نچوڑ لیا تھا تو پھر اس جینے میں

کیا لطف باقی رہا تھا اور یونہی سوچتے سوچتے صبح سے شام ہو جاتی اور شام سے صبح۔ دن کے اجالے پھیلتے اور رات کی سیاہی بڑھتی۔ شب کی تاریکیوں میں کہیں دور رفتہ خوشیوں کی جھلملاتی شمع سے دھواں سا اٹھتا ہوا دکھائی دیتا اور سنسان دوپہروں کا سکوت گزری ہوئی حسین و جمیل زندگی کا غمناک فسانہ کہتا۔ خاک کے بگولے اٹھتے رہتے اور ویران در و دیوار فضا میں زندگی کا ہر واقعہ خاک ہو جاتا۔ مگر وقت کے ہمراہ زندگی بھی چلتی چلی جا رہی تھی۔

۱۰

میر نہال پر فالج گرنا بیگم نہال کے لیے ایک سنگِ مصیبت سر سے گزر جانا تھا۔ میاں کے اس طرح معذور ہو جانے سے وہ کچھ ایسی بے کل اور خاموش ہو گئیں گویا دونوں ایک ہی ساز کے دو تار تھے اور ایک کے ٹوٹ جانے سے دوسرا بے مصرف ہو گیا۔ ان کے منہ سے غیر ارادی طور پر سرد آہیں نکلتیں اور وہ پہروں جانماز پر بیٹھی ہوئی اپنے میاں کے اچھے ہونے کی دعائیں مانگتیں۔ وقت کے ساتھ اعضا بھی انسان کی رفاقت چھوڑ دیتے ہیں۔ میر نہال کے دانت بھی جواب دے گئے۔ اور بیگم نہال ان کے واسطے روغنی روٹی یا نرم پھلکے خود پکاتیں اور قلیے میں چور کر کے بھیجتیں تاکہ وہ آسانی سے کھا سکیں۔ کہتے ہیں کہ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ اب بیگم نہال کی اپنی آنکھیں جواب دے رہی تھیں۔ ایک دن رات کو چبوترے سے سیڑھیاں اترتے ہوئے ان کا پاؤں پھسل گیا اور وہ لڑھکتی ہوئی نیچے چاروں خانے چت جا کر گریں۔ دلہن اور جمال بیگم نے دوڑ کر ان کو اٹھایا۔ جمال بیگم نے کہا:

"ہے ہے دلہن، اللہ نے بڑی خیر کر لی۔ کچھ لیا دیا سامنے آ گیا۔ ارے بی چوٹ تو زیادہ نہیں آئی؟"

دلچین ان کی پیٹھ اور ٹانگیں جلدی جلدی سہلاتے ہوئے بولی :
"بیگم صاحب میں کل ہی حکیم کریم الدین بقا والے کو لے کر آؤں گی ۔"
اور بیگم نہال نے کہا :
" نہیں بوا چوٹ تو نہیں آئی ۔ اب تو میں سچ مچ بٹم ہوگئی ۔ اندھی دھندی زندگی دوزخ سے بدتر ہے ۔"

دوسرے دن دلچین حکیم لقا والے کو بلالائی ۔ انھوں نے موتیوں کا سرمہ اور سفید گولیاں دیں جو روز سنگ مرمر کی کھرل میں گھسی جاتیں اور گلاب میں حل کر کے سلائی آنکھوں میں پھرائی جاتی ۔ لیکن علاج کے باوجود بیگم نہال کی بینائی گھٹتی گئی چارو ناچار وہ لکڑی لے کر چلنے لگیں ۔ اب ان کا زیادہ وقت دالان میں بیٹھے بیٹھے گزر جاتا اور وہ کسنے پھیلائے کتا کٹ چھالیہ کترا کرتیں اور بے نور آنکھوں سے سامنے تکتی رہتیں ۔ آنکھیں کیا گئیں کہ دنیا سے ناتا اور میل ملت ختم ہوگیا بس کبھی کبھار اصغر کے ہاں چلی جایا کرتیں جہاں آرا پانچ سال کی ہوگئی تھی اور ناک نقشہ اکھر کر بہت پیاری معلوم ہوتی تھی ۔ بلقیس کو کئی مہینے سے مستقل حرارت رہنے لگی تھی اور وہ اس عرصہ میں بہت لاغر اور دھان پان ہوگئی تھی ۔ اصغر کی اب بھی وہی پرانی روش تھی اور وہی بے اعتنا ئیاں ۔ مگر وہ پہلا سا چڑچڑا پن اور بے دردی سے پیش آنا کم ہوگیا تھا اور اس کی جگہ سرد مہری نے لے لی تھی ۔ اس نے گھر سے باہر دلچسپیاں ڈھونڈلی تھیں ۔ نئے نئے جسموں کے چسکے پڑ گئے تھے اور دوسری عورتوں سے تعلقات پیدا کر لیے تھے ۔ چونکہ اسے اپنی بیٹی سے درحقیقت اُنس تھا لہٰذا بلقیس کو جہاں آرا کی ماں سمجھ کر اس طرح قبول کر لیا تھا جیسے کوئی چیز نہ تو قابلِ توجہ ہو اور نہ اس کو پھینکا جا سکے ، بس بیوی کی قدر و قیمت اتنی ہی تھی جو کسی انا دوا کی ہوتی ہے ۔
بیگم شہباز کو ایک طرف داماد کے طرزِ عمل سے رنجش تھی تو دوسری طرف بیٹی کی

وجہ سے فکر و تردد اور انھوں نے اپنے امکان بھر بلقیس کی پرسش غم کی۔ ایک ماں جہاں تک اور جس طرح چارہ جوئی کر سکتی ہے۔ اس میں کمی نہ کی اور علاج معالجہ، تعویذ گنڈے، ٹونے ٹوٹکے، سب ہی کچھ کرتی رہیں۔ ان کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ اصغر نے بیوی کا پاپ کاٹنے کو جادو کروایا ہے تاکہ وہ مر جائے اور بیوی سے چھٹکارا پاکر تمام ذمہ داریوں سے بے نیاز آزادی سے رنگ رلیاں مناتا پھرے اور نئی جورو لے آئے۔

بیگم بہاں کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ اصغر اور دلہن میں ان بن ہے مگر وہ بیٹے کو مورد الزام نہ سمجھتی تھیں بلکہ جب بھی میاں بیوی میں ناچاقی کا ذکر آیا انھوں نے ہمیشہ یہ کہہ کر بہو کو قصوروار ٹھہرایا کہ "بی مرد تو سب ایسے ہی ہوتے ہیں مگر عورتیں ان کو بھگتی ہیں۔ اور تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے۔ بیویوں کی طرح بلقیس نے میرے بچے کا کونسا خیال رکھا اور خدمت کی۔ اس نے تو بہتیرا بیوی کو ہتھیلی کا پھپھولا بنا کر رکھا مگر بلقیس ہی کوری بنی رہیں۔ ان کا کیا گیا میرا اصغر تو کہیں کا نہ رہا۔ بیوی کے کارن اس کی زندگی اکارت ہو گئی"۔ لیکن پھر بھی وہ بہو کو دسویں پندرھویں دن دیکھ آتیں اور سمدھن کو رائے دیتیں کہ فلانے حکیم کو بھی دکھا کر دیکھ لو۔ سنا ہے فلاں طبیب اچھا ہے اس کا نسخہ بلواؤ۔

بلقیس اندر ہی اندر گھل کر پہلے سے آدھی بھی نہ رہی تھی۔ رہی سہی قوت و ہمت بیماری نے چھین لی اور پچھلے چند دنوں میں وہ اس درجہ نحیف و کمزور ہو چکی تھی کہ اس کو ہاتھ ہلانا بھی دوبھر معلوم ہوتا۔ ہر وقت جسم بے جان اور ٹوٹا ٹوٹا رہتا اور اصغر اس کو لیٹا ہوا دیکھتا تو اب بھی اکثر پہلے کی طرح بگڑتا۔

"خوب — تم نے یہ اچھا ڈھونگ رچایا ہے نہ وقت نہ ویلا تخت چڑھی خیلا۔ نہ اٹھ کے گھر کو دیکھو نہ بچی کو۔ سر جھاڑ منہ پھاڑ اور گھر میں ہر چیز الٹی پلٹی جیسے گدھے لوٹ رہے ہیں۔ آخر پھوہڑ پن کی حد ہوتی ہے۔ میاں کی خبر تو تمہارے دشمن لیں۔ شادی

کر کے میں یہ سمجھا تھا کہ چلو آرام و خوشی ملے گی۔ یہ کیا معلوم تھا کہ رہا سہا سکون بھی جاتا رہیگا۔"
اور پھر وہ حسب عادت اپنی قسمت کا مزید شکوہ کرتا اور اپنے کو کوستا۔ بلقیس
دم سادھے ساری ترش و تلخ سنتی رہتی۔

بلقیس سارا سارا دن دالان میں تنہا پلنگ پر پڑی کڑیوں کو گنا کرتی۔ دیواروں پر ڈراؤنی چھپکلیاں چپکی رہتیں اور ان کے لجلجے جسم دیکھ کر بلقیس کو وحشت ہوتی اور اس کو اکیلے گھر میں تنہا رہنے سے ڈر لگنے لگتا۔ اور شام کو جب سورج رخصت ہونے لگتا تو اس کی نحیف اور تھکی ماندی شعاعیں دروں میں سے ہوتی ہوئی پلنگ تک آجاتیں اور زرد زرد پھیکی دھوپ اس کے چہرے پر پڑتی اور دن کی آخری منزل کے ساتھ اس کو موت کا بھیانک خیال آجاتا اور وہ خوف سے پسینے پسینے ہو جاتی۔ ویسے اب تو اس پر موت کا خیال اکثر و بیشتر حاوی رہنے لگا تھا اور موت ہی اس کے لیے ایک ایسی امید تھی جو اس کے رنج و الم کو مٹا سکتی۔ لیکن جب اس کو جہاں آرا کا خیال آتا تو وہ مرنا بھی نہ چاہتی تھی۔ رہ رہ کر وہ یہی سوچتی رہتی کہ میرے مرنے کے بعد آخر اس معصوم جان کا کیا ہوگا۔ اصغر دوسری شادی کر لے گا اور سوتیلی ماں آ کر اس پر ظلم و ستم توڑے گی۔ کون اس کا ذرد مند ہو کر محبت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرے گا، اور میری غریب بچی ماما کے لیے ترس جائے گی۔ کم از کم میری زندگی میں ماں باپ کی محبت شامل رہی ہے۔ اسے اپنے مرنے کا اتنا رنج نہ تھا جتنا بیٹی کی محرومیوں کا خیال اور ان افسردہ گھڑیوں کے درمیان اسے وہ حسین زمانہ یاد آجاتا جب شروع شروع اس کی شادی ہوئی تھی اور اصغر اسے چاہتا تھا۔ اسے چاہت کے مزے یاد آتے اور اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آجاتی اور وہ آنکھیں بند کر کے ماضی کے خیالوں میں سرگرداں ہو جاتی اور تلاش کرتی کہ محبت میں اسے اور کیا کیا ملا تھا۔ اسے اصغر کے محبت بھرے بوس و کنار یاد آنے لگتے اور اس لطف [illegible] شدہ کہیں سے باپ کی

شفقت بھی آکر چپکے سے کھڑی ہو جاتی۔

وہ پلنگ پر لیٹی ہوئی بھولے بسرے خوابوں کے تصور میں کھوئی رہتی۔ سورج چھپ جاتا اور رات بھی آجاتی۔ ستارے چمکتے اور ساری فضا ساکت ہو جاتی، اور اس سکوت میں بلقیس جہاں آرا کو بھینچ کر کلیجے سے لگا لیتی، اور رات کے سناٹے میں شب کے کناروں سے اس پار کہیں دور سکون و راحت کے نغمے آتے ہوئے سنائی دیتے۔ خوابوں میں اس کو ہنستے مسکراتے ہوئے لوگ نظر آتے جو اس سے نشاط و انبساط اور مہر و محبت کی باتیں کرتے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گل پوش مرغزاروں میں لے کر جاتے اور نغمہ ریز نہروں کے کنارے کنارے ٹہلتے۔ چونک کر اس کی آنکھ کھل جاتی۔ رات کی تنہائیوں میں وہ تنہا ہوتی۔ جاگتے ہی وہ جہاں آرا کو اپنے سینے سے لگا لیتی اور شب کے سناٹوں کی سرگوشیاں اور اپنے دل کی دھک دھک سنتی رہتی۔

ایک رات کو اس نے بڑا بھیانک خواب دیکھا کہ وہ دریا میں نہا رہی ہے۔ اس کے ساتھ اور لوگ بھی ہیں جن کو وہ نہیں جانتی۔ وہ کنارے پر کھڑی ہو کر پانی میں غوطہ لگاتی اور پھر مزے سے خوشگوار لہروں کے بہاؤ پر مچھلی کی طرح تیرتی پھرتی، کبھی موجوں سے کھیلتی، ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کے چھپکے لیتی، کبھی چلو بھر بھر کر چھینٹے اڑاتی۔ وہ بے فکری سے نہا رہی تھی کہ اس کو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی اس کو پکار رہا ہے: "بلقیس بلقیس!" اس نے پلٹ کر دیکھا تو ایک شخص کھڑا ہوا اس کو انگلی کے اشارے سے اپنی طرف بلا رہا ہے جب وہ اس کے قریب گئی تو دیکھا کہ اصغر کھڑا ہوا ہے۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اصغر کی شکل ایک بڈھے کی صورت میں بدل گئی جس کے چہرے پر جھریاں ہی جھریاں پڑی ہوئی تھیں اور موٹی کھال بالکل خشک اور گھناؤنی تھی۔ اس کی ناک پپا ہوا ٹماٹر کی طرح الگ رکھی ہوئی تھی اور دونوں نتھنے خوفناک غاروں کی طرح اندر کو دھنس کر عمیق اور تاریک نظر آرہے تھے۔ اس نے اپنی ایک آنکھ جو انتہائی

ڈراونی اور غضبناک تھی بلقیس کے چہرے پر جما دی اور ٹکٹکی باندھ کر لگاتار اس طرح گھورا کہ بلقیس کا دل دہل گیا، دہشت سے اس کے تن بدن میں سنسنیاں دوڑ گئیں ہاتھ پاؤں برف ہو گئے اور وہ خوف سے بھنبھیری کی طرح تھر تھر کانپنے لگی۔ وہ ایکدم جاگ گئی۔ قلب کی رفتار تیز تھی اور دل کی دھڑکن کانوں میں صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس نے فطری جذبۂ حفاظت سے جہاں آرا کو اپنی دلائی میں گھسا لیا اور اپنی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اندھیرے میں چاروں طرف ہر چیز کو دیکھا۔ سکوت گہرا اور بے پایاں تھا۔ اس کی نیند اچاٹ ہو گئی اور خواب کی ڈراونی صورت اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہی تھی۔ ہیبت سے اس نے اپنی آنکھیں بھینچ کر بند کر لیں۔ لیکن وہ خوفناک آدمی پھر اسی طرح نمودار ہو گیا۔

بلقیس سہم گئی اور ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول کر ماں کو آواز دی:

"اماں، اے بی اماں"۔

بیگم شہباز جو بلقیس کی پٹی سے پٹی ملائے سو رہی تھیں، اٹھ بیٹھیں اور بولیں:

"کیا ہوا بیٹی! خیر تو ہے"؟

"اماں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میرے پاس آ جائیے"۔

بیگم شہباز کہنے لگیں:

"اے ڈرنے کی کیا بات ہے۔ میں تمہارے پاس ہی تو ہوں۔ آج شاید تم پڑھ کر نہ سوئی ہو گی"۔ اور اٹھ کر انھوں نے صراحی سے پانی کا کٹورہ بھرا اور بیٹی کو لا کر پانی پلایا۔ بلقیس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ہتھیلیاں ابھی تک بھیجی ہوئی تھیں اور پیشانی پسینے سے تر تھی۔

اور اس خواب کے بعد دنوں وہ مہیب صورت سوتے جاگتے بلقیس کا تعاقب کرتی۔ جہاں اس کی آنکھ جھپکتی وہ غضبناک آنکھ اس کو گھورتی اور پہاڑ سی ناک۔

اور غاروں جیسے پر ہول نتھنے اس کو ڈراتے اور بلقیس کو یہی معلوم ہوتا کہ اس نے موت کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیا ہے جو اس کی گھات میں ہے اور کسی دن اپنے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں لے کر اپنے آہنی اور خاردار پنجے اس کے جسم میں پیوست کر دے گی اور اسے اپنی بھیانک آغوش میں دبوچ کر لے جائے گی۔

بیگم شہباز نے پیر جی کو بلوایا۔ وہ بوڑھے آدمی تھے۔ ان کی ڈاڑھی میں چند بال تھے جو ٹھوڑی کے بالکل نچلے حصے میں اُگے ہوئے تھے جن کی نوکیں بڑے بکروں کی ڈاڑھی کی طرح مڑی ہوئی تھی۔ وہ ہمیشہ نیلی لنگی پہنتے تھے اور سر پر نیلے رنگ کی پگڑی بندھی رہتی تھی۔ وہ روزانہ آکر سورۂ جن اور سورۂ مزمل پڑھ کر دم کرتے اور ڈاڑھی کے بالوں کو بل دے کر انگلی پر لپیٹتے ہوئے پورے یقین سے کہتے:

"ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ دنیا میں ہر طرح کی مخلوق بستی ہے۔ یہ خبیث روحیں ہوتی ہیں جو خواب میں آکر ستایا کرتی ہیں۔ لیکن سورۂ جن کے جلال کے آگے نہ بھوت ٹھہرے نہ پریت اور تم انشاء اللہ جلدی تندرست ہو جاؤ گی۔ وہ بڑا جبّار و قہّار ہے اور اللہ کے کلام میں بڑی تاثیر ہے۔"

پیر جی نے زعفران سے لکھ کر طشتریاں دیں جو بیگم شہباز کورے مٹکے کے پانی سے دھو کر روزانہ صبح شام بیٹی کو پلاتیں اور پھر دلاسے دے کر ہمت بندھاتیں:

"بیٹی اپنا اعتقاد ٹھیک رکھو۔ انشاء اللہ اس کے پینے سے دل ٹھہر جائے گا اللہ پہ بھروسہ رکھو۔ وہی شفا دینے والا ہے۔"

جھاڑ پھونک اور علاج معالجہ ہوتا رہا، مگر بلقیس کو معلوم تھا کہ یہ سب باتیں بے سود ہیں۔ اس کا مرض لا دوا ہو چکا تھا اور کسی کے پاس اس کے دکھ کا درماں نہ تھا۔ اس کو زندہ رہنے کی کوئی خواہش بھی نہ رہی تھی۔ موت اس جینے سے بدرجہا بہتر تھی۔ نہ اس دنیا میں ہوں گے نہ یہ رنج و غم رہیں گے۔ دوسری دنیا میں کم از کم زندگی

کی ابتلا اور پریشانیاں اور دنیا کی صعوبتوں سے تو نجات ہوگی۔ مگر اس کے مر جانے کے بعد اس کی بچی کا کیا حشر ہوگا؟ تمنائے مرگ اور زیست کے درمیان جہاں آرا کا خیال حائل ہو جاتا اور شاید بچی ہی وہ سپر تھی جس کے سہارے بلقیس اب تک موت کا مقابلہ کر رہی تھی اور حیات کی تمام مایوسیوں اور ترشیوں کے باوجود زندہ رہنا چاہتی تھی۔

اکثر جہاں آرا کھیلتے کھیلتے اس کے پاس آتی اور گلے سے لپٹ جاتی اور منہ سے منہ ملاکر پوچھتی:

"امی آپ ہر وقت کیوں لیٹی رہتی ہیں؟ آپ مجھ سے کیوں نہیں کھیلتیں؟"

بلقیس کے دل میں ایک خنجر سا آر پار ہو جاتا۔ وہ بیٹی کے گال کو چومتی، ننھے ننھے ہاتھ آنکھوں سے لگاتی اور اس کا سر محبت سے تھپتھپا کر کہتی:

"امی کا جی اچھا نہیں ہے چاند جب امی اچھی ہو جائیں گی تو اپنی رانی بیٹی سے ہر وقت کھیلیں گی اور بہت سی گڑیاں سی کر دیں گی۔ سمجھیں؟" اور پھر وہ اس کو پیار کرتی اور پیٹھ سہلا کر سمجھاتی: "میری بنّو بہت پیاری ہے۔ اور دیکھو تو بیٹی تم ابا کو مت ستایا کرو۔ تم بڑی سمجھدار اور نیک بچی ہو۔ اچھے بچے ابا کو بہت پیار کرتے ہیں اور ان کا کہا مانتے ہیں۔"

اور پھر اپنی طرف سے بچی کا دھیان ہٹانے کو وہ اسے بہلا کر کسی کھیل میں لگا دیتی اور جب جہاں آرا کھیل میں مصروف ہو جاتی تو اس کو دیکھ دیکھ کر گھنٹوں روتی رہتی۔ اور اس عرصہ میں کون کون جان لیوا خیال آکر اس کی ہمت اور قوت کو توڑ دیتے۔ اور جب بیٹی کو چھوڑ جانے کا ملال موت کے خیال سے زیادہ سخت اور آزار جاں ہو گیا تو ایک دن اس نے اپنی ماں سے کہا:

"اچھی اماں میں ایک بات کہوں مانو گی؟"

بیگم شہباز بولیں،

"کہو تو سہی ماننے کی ہوئی تو مان لوں گی۔"

بلقیس نے جواب دیا؛

"نہیں پہلے تم مجھ سے پکا وعدہ کرو۔"

بیگم شہباز بولیں؛

"بیٹی تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو۔ کیا قرآن اٹھواؤ گی؟ میں نے کب تمہارا کہا نہیں کیا۔"

"اماں تم مجھ سے وعدہ کرو کہ میں اگر مر گئی تو تم جہاں آرا کو اپنے پاس رکھو گی۔"

بیگم شہباز کو یہ سان و گمان بھی نہ تھا کہ بیٹی اس قسم کی التجا کرے گی اور وہ اچانک گھبرا کر بولیں؛

"ہے ہے بلقیس! بیٹی تم کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ اپنے حواسوں پر سے صدقہ دو۔ اللہ تمہیں رکھے، اپنی بچی کی خوشیاں دیکھو۔ اوئی ذرا سے بخار میں دل چھوٹا کر بیٹھیں۔ ذرا، مریں تمہارے دشمن اور برا چاہنے والے۔"

"اماں! مرنا تو سب کو ایک دن ہے۔ زندگی کا کیا بھروسہ پانی کا بلبلہ ہے۔"

"پرے ہٹاؤ ایسے نامراد خیالوں کو۔ تمہیں آخر ہوا کیا ہے۔ خاصی اچھی بھلی چنگی ہو۔ ذرا سی کمزوری ہے جاتی رہے گی۔"

مگر بلقیس نے ان کی سنی ان سنی کرتے ہوئے پھر زور دے کر کہا:

"اچھی میری اماں! بس تم مجھ سے وعدہ کر لو۔ میں چین سے مر جاؤں گی ورنہ بچی میں دل پڑا رہے گا اور میری روح تڑپتی رہے گی۔"

بیگم شہباز یہ تو نہیں کہ جذبات سے بالکل عاری تھیں اور خاص کر بلقیس کو

بے حد چاہتی تھیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ بلا وجہ اپنی جان کو روگ لگانے کی قطعاً روادار نہ تھیں۔ آئی کو تو کوئی ٹال نہیں سکتا، پھر ہلکان ہونے سے فائدہ؟ دو روز کی زندگی میں کیوں اپنی زندگی اجیرن کی۔ اس نظریہ کے تحت جب ان کے میاں مر ے اور وہ بیوہ ہو گئیں جب بھی انھوں نے چوڑی چھلّے اور اچھے کپڑے پہننے میں کوتاہی نہ کی اور ہمیشہ یہی کہا کہ مرنے والے کے ساتھ کوئی خود مر تو نہیں جاتے، کیا کوئی دنیا کو تیاگ دے؟ اپنی ذات ان کو دنیا میں سب سے زیادہ پیاری تھی اور اپنے سود و زیاں، آرام و آسایش کے آگے آگے کسی کی پرواہ نہ تھی۔ مگر چاہے وہ خود سے کتنی ہی محبت کرتی ہوں، تھیں تو ماں۔ اور ماں کا دل پھر ماں کا دل ہے۔ وہ بیٹیوں کا کسی حالت میں دل توڑنا نہیں چاہتی تھیں، نہ آزردہ کرنا۔ اب ان کے پاس رہ کون گیا تھا۔ ایک بڑی بیٹی پردیس باسی تھی، ہندوستان میں اور زہرہ کم عمر تھی۔ بیٹیوں شادی کے بعد سے اب تک ان کے پاس رہی اور اماں سے بے پناہ محبت کرنے کے علاوہ وہ ان کی ہر بات کا خیال رکھتی تھی اور انھیں یہ علّت تھی کہ یا تو کوئی ان پر چھایا رہتا رہے یا پھر کوئی ان کی توجہ کا محتاج رہے۔ اس بنا پر وہ اکثر جھوٹ موٹ مرض گھڑ لیا کرتی تھیں تاکہ لوگ انھیں اسی بہانے پوچھ لیا کریں اور ہمدردیاں جتائیں۔ اور ایک ذرا سا وعدہ کر لینے میں حرج بھی کیا تھا وہ مزید فکر و پریشانی کی دردِ سری سے بچ جاتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے بیٹی سے وعدہ کر لیا۔

"بیٹی! تم مت گھبراؤ۔ میں آخر کو نانی ہوں۔ نواسے نواسی اپنی اولاد سے پیارے ہوتے ہیں۔ مگر میں کہتی ہوں تم یہ وہم دل سے نکالو۔ انشاء اللہ چلتے ہاتھ پیر عمل سے گھر کی ہو کر خود بچی کا سب کچھ کرو گی۔ تم اطمینان رکھو جہاں آرا مجھ کو جان سے عزیز ہے۔ جب تک دم میں دم ہے اس کا بال بیکا نہ ہوگا۔ اپنے سینے سے لگا کر رکھوں گی۔"

۱۱

جنوری کا مہینہ تھا۔ مہاوٹیں شروع ہو گئی تھیں۔ بارش ابھی تھمی تھی۔ باہر خوب تیز اور برفانی ہوا چل رہی تھی۔ جہاں آرا دن بھر کھیل میں تھک کر سرِ شام ہی سے سو چکی تھی۔ بیگم شہباز دوسرے دالان میں عشاء کی نماز پڑھ رہی تھیں اور بلقیس اپنے پلنگ پر لیٹی ہوئی خاموشی سے چھت کو تک رہی تھی۔ سرہانے رکھی ہوئی لالٹین کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور پلکوں کے دراز سائے میں نقاہت سے ڈگر ڈگر کرتی ہوئی اس کی بڑی بڑی آنکھیں نرگس کی طرح سفید دکھائی دیتی تھیں۔ اتنے عرصے کی بیماری سے وہ ناتواں ہو گئی تھی اور اس کا گدرایا ہوا خوبصورت جسم کملا گیا تھا۔

نہ معلوم آج اصغر کے جی میں کیا آئی کہ وہ اپنے کمرے میں سے اٹھ کر بلقیس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ نکھرے ہوئے دھلے دھلائے شفاف آسمان پر ابر کے ٹکڑے دھنکی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح ادھر سے ادھر دوڑتے تھے۔ ماہِ نو ان سے اٹھکھیلیاں کر رہا تھا، کبھی بادلوں کے دامن میں چھپ جاتا اور کبھی باہر نکل آتا۔ کہیں

کہیں جگمگاتے ہوئے ستاروں کے جھرمٹ بھاگتے ہوئے بادلوں میں سے مسکراتے ہوئے نظر آجاتے جو مہاوٹ کی بھیگی ہوئی رات کو درخشاں و دلفریب بنارہے تھے۔

قریب ہی گلی میں کوئی لڑکا نئی غزل مزے لے لے کر گا رہا تھا :

مجھے مسیحا کے احسان سے بچالینا
تم ہی نے درد دیا ہے تم ہی دوا دینا
میری لحد پہ کوئی پردہ پوش آتا ہے
چراغِ گورِ غریباں صبا بجھا دینا

گانے کی آواز ہواؤں کے ساتھ دور جاکر رات کی فضاؤں میں ڈوب گئی۔
اور ایک زمانہ گزر جانے کے بعد آج اصغر کے دل میں محبت کی وہی پرانی کسک تھی اور عشق کی وہی چبھن اور روح کسی رفتہ درد و خلش کو لے کر پھر بیدار ہو گئی تھی اور گم گشتہ محبت والفت کی دیرینہ یادیں تحت الشعور کے پردے چاک کرتی ہوئی ایک ایک کر کے اس کے سامنے سے گزرنے لگیں۔ اس نے بلقیس کے کملائے ہوئے چہرے کو نظر بھر کے دیکھا اور اس کے ضمیر نے چیخ کر اس کی زیادتیاں اور بے انصافیاں جتا کر اسے قصوروار ٹھہرایا اور اصغر اپنی سنگدلی پر پشیمان ہونے لگا، لیکن دل محبت سے خالی تھا۔ اور اصغر سوچنے لگا کہ وہ بلقیس سے محبت کیوں کرنے لگا تھا اور جب محبت کی تھی تو پھر کس واسطے اتنے تغافل اور بے رخی سے پیش آیا۔ حالانکہ وہ مجھ کو دل و جان سے چاہتی ہے مگر میں نے اس کی محبت کا جواب محبت سے کیوں نہ دیا؟ جب محبت کی لگن بلقیس کے دل کو جلا رہی تھی تو اس کے شعلوں نے مجھے کیوں نہ جلایا؟ یہ عشق کے جواز کیا ہیں اور محبت کے رمز کیسے؟ کیا عشق کو بھی اظہارِ عشق کی ضرورت ہے اور ایک عورت سے

محبت صرف اس کے جسم کی خاطر کی جاتی ہے اور اس کے حسنِ باطنی و زیبائی اور غمزہ و ناز سے محبت کو سروکار نہیں ہے اور عشق محض داستانِ ہجر و فراق دہرانے تک ہے؟ مگر پھر یہ پروانے جو شمع کے گرد دیوانہ وار طواف کرتے ہیں اور وارفتگیٔ شوق میں فنا ہو جاتے ہیں تو کیوں؟ حسن کی تمنا کس کو نہیں ہوتی اور وہ بھی طالبِ نور و ضیا ہیں اور حسن کے عاشق اور حسن ہی پر اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں۔ کیا بلقیس بھی مجھ پر پروانہ وار عاشق نہ تھی اور میرے لیے اس نے اپنے کو مٹایا نہیں؟ اس وقت وہ اپنی بے مہریوں پر منفعل اور نادم بیٹھا سوچ رہا تھا کہ بلقیس کا یہ حشر اس کی غفلتوں کا نتیجہ ہے اور اب وہ اپنی بے پرواہیوں کے بدلے بلقیس کی محبت کا صلہ خلوص و وفا سے چکائے گا۔

بلقیس اسی طرح لیٹی رہی۔ غزل اس کے اتنے حسبِ حال تھی کہ اس کو اپنی زبوں حالی پر رونا آگیا۔ اور دھیرے سے اصغر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کہیں دور خیالوں میں کھوئی ہوئی بولی:

"آپ میرے لیے مطلق پریشان نہ ہوں۔ اب میں زیادہ نہیں جیوں گی۔ میں اپنے مہر سے آزاد کرتی ہوں۔ میرے بعد آپ ضرور شادی کر لیجیے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے اصغر کا ہاتھ محبت سے دبایا پھر رسان سے چھوڑ دیا اور اصغر کو کچھ اس طرح پرستارانہ نگاہوں سے دیکھا کہ اس کا دل بھر آیا اور ہونٹ جذبات سے کانپنے لگے اور وہ اس کے ہاتھ کی پشت تھپتھپاتے ہوئے بولا:

"تم ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہو۔ تم جلدی تندرست ہو جاؤ گی اور پھر ہم تم دونوں مل کر ہنسی خوشی رہیں گے۔ کل صبح میں ڈاکٹر کو لا کر دکھاؤں گا۔ گھبرانے اور دل چھوڑنے کی بات نہیں۔"

اس نے بلقیس کی طرف سے اپنا رخ پھیر لیا اور دو گرم گرم آنسو اس کے

گالوں پر گر گئے۔ بادلوں کے پیچھے بجلی کوندی اور اس کی چمک سے آسمان روشن ہوگیا۔
اصغر نے بلقیس کو دیکھا۔ وہ اپنے خیالوں میں غرق تھی۔ اس بیماری اور لاغری کے باوجود وہ کتنی حسین تھی۔ اس کے خط و خال کتنے سبک اور نازک تھے اور اس کی سادگی میں اب بھی تیکھا پن تھا۔ اور اصغر کو یہ محسوس ہوا کہ دراصل اسے بلقیس سے محبت آج بھی ہے اور محبت کے خیال کے ساتھ یہ خدشہ اس کا کلیجہ نوچنے لگا کہ اگر بلقیس نہ رہی تو اس دنیا میں وہ اکیلا رہ جائے گا۔ اور اس نے بہت عاجزی اور راست بازی سے کہا؛

"بلقیس تم میری کوتاہیوں کو معاف کر دو۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے تم پر سراسر ظلم کیے ہیں۔ تمہارا میں سزاوار ہوں۔"

بلقیس نے کٹٹورہ سی آنکھیں اٹھا کر جو محبت کی نرمی اور گرمی سے مسکرا رہی تھیں اصغر کو دیکھا۔

"آپ ایسی باتیں کر کے مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔ آپ نے کوئی ظلم نہیں کیے آپ بے قصور ہیں۔ یہ سب میری خطائیں تھیں۔۔۔۔"

عشق کے اعجاز انوکھے ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ذرا سی پرسشِ غم محبت میں ہار جانے والوں کی یوں مسیحائی کر دیتی ہے کہ مدتوں کے بگڑے ہوئے دل کے گھاؤ خود بخود بھر جاتے ہیں۔ اور اصغر کا تجدیدِ محبت کرنا تھا کہ بلقیس کے جی کی ساری جلن مٹ گئی اور اس کے قلب میں زندہ رہنے کی خواہش تڑپنے لگی اور اس وقت اس کا دل یہی چاہتا تھا کہ کسی دیوداسی کی طرح وہ اپنے دیوتا کے چرنوں میں گر جائے۔۔۔۔۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

صبح اصغر ڈاکٹر مترا کو لے کر آیا۔ ڈاکٹر نے بلقیس کا اچھی طرح سے معائنہ کیا اور اصغر سے انگریزی میں کہنے لگا کہ یہ تپِ دق کی مریضہ ہیں، لیکن مرض ابھی پرانا نہیں

ہوا ہے اگر مریض کی صحیح دیکھ بھال ہو اور اچھی غذا اور آرام ملے تو ضرور ٹھیک ہو جائیں گی
تپ دق کا سن کر اصغر کا منہ ذرا سا نکل آیا۔ ڈاکٹر نے مزید ہدایتیں دے کر دواؤں
کا لمبا چوڑا نسخہ لکھ کر اصغر کے ہاتھ میں تھما دیا۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں اور بیگم شہباز نے میاں بیوی کا میل ملاپ دیکھ کر
شکرانے کے دوگانے ادا کیے۔ بیگم شہباز ابھی تک معمولی بخار کا حکیمی نسخہ پلا رہی تھیں
مگر جب ڈاکٹر کے ہاں سے دوائیں لے کر اصغر واپس آیا تو اس نے اس کو بلقیس کے مرض کی
نوعیت بتائی۔ سنتے ہی ان کا دل سن سے رہ گیا اور انھوں نے اسی شام کو پیر جی کو
بلوا کر اور نئے تعویذ لکھوائے اور سارے بزرگوں کی نذر و نیازیں مانیں اور خدا کی
بارگاہ میں گود پھیلا پھیلا کر حبیب کے واسطے دیتیں اور بیٹی کے تندرست ہو جانے کی
التجا کر رہیں۔

بلقیس کی عیادت کو جو ملنے جلنے والی اور رشتہ دار بیویاں آتیں کوئی نہ کوئی
چٹکی بٹکی بتا جاتیں۔ کوئی رائے دیتی :

"اے بی حکیم بھینسوں والے کو بلا کر دکھاؤ، ان کے ہاتھ میں اللہ نے بڑی
شفا دی ہے۔ ہمارے محلّے میں جو شاہ جی رہتے تھے ان کی بہو تو بس کھٹیا سے لگ
گئی تھیں، آدھے دھڑ کی جان نکل چکی تھی ان کی دو روز کی ٹھنڈائی سے سارا دکھ جاتا رہا
لو وہ اب تک ایسی ہٹی کٹی ہے کہ آج تک چھینک بھی نہیں آئی۔"

ایک کہتیں: "بوا ان ڈاکٹروں کی باتوں میں کیا دھرا ہے۔ رائی کا پربت
بنا دیتے ہیں۔ بس ٹیکے سیدھے کرنے کو رنگ گھولا اور شیشی میں دے دیا۔ اب تم
یقین کرنا میری سمدھن کے بھائی کی سالی کی بیٹی کو بھی موئے حکیم ڈاکٹروں نے یہی نگوڑی
ماری ٹی بی بیماری بتائی تھی۔ لیکن خدا کی قدرت ایک فقیر آ نکلے۔ انھوں نے بس جو برابر
ایک دوائی کھلوائی۔ لو بیوی اس کا کھانا تھا کہ اس لڑکی کا جی برا ہوا اور وہ قے

ہوئی کہ پسلیچیاں کی پسلیچیاں بھر گئیں اور پتے کا پانی تک نکل گیا۔ اب جو آخری ابکائی آئی اس کے ساتھ کِلبِل بِلبِل کرتا ہوا دق کا کیڑا باہر آگیا۔ ہم سب نے دیکھا تھا اور پھر تو اس لڑکی کے چہرے پر وہ رنگ دوڑا کہ دیکھنے سے نظر لگتی تھی۔"

بیگم شہباز کی تو جان پر بنی ہوئی تھی اور ان کا بس چلتا تو کوئی اگر جو کچھ بتا جاتا سب بلقیس کو کھلا دیتیں۔ ممکن ہے کوئی دوا لگ جائے۔ لیکن اصغر نے منع کر دیا تھا کہ سوائے ڈاکٹر مترا کے علاج کے اور کسی کی بتائی ہوئی کوئی دوا دوا نہیں دی جائے گی۔ رہے تعویذ گنڈے تو وہ اور بات تھی۔

فروری سے لے کر مارچ تک موسم بہت خوشگوار اور گلابی رہا۔ بلقیس کو اچھی غذا اور پورا آرام ملا اور پھر اصغر پوری توجہ سے اس کی تیمارداری میں لگا رہتا تھا ایک مہینہ ہی میں دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چہرے پہ پانی پھر گیا اور بیماری آدھی بھی نہ رہی۔ نقشہ بدل چکا تھا، فضا سازگار تھی اور محبت کے فیض و کرم شامل حال۔

حصّہ چہارم

بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

— نورجہاں

سنہ ۱۹۱۸ء کی گرمیاں تھیں یا دوزخ زمین پر اتر آئی تھی۔ گرمی کہتی تھی اب کے برس
پڑ کر پھر کبھی نہ پڑوں۔ آسمان سے گر آگ برستی تو زمین سے شعلے نکلتے تھے اور لو تھی کہ
کسی وقت تھمنے کا نام نہ لیتی اور دن بھر خاک برستی۔ شہر پناہ ڈھائی جا چکی تھی۔ ہوا
تپتے ہوئے چٹیل میدانوں سے گزرتی ہوئی شہر میں زناٹے بھرتی، خالی بازاروں
اور تنگ گلی کوچوں میں درّانہ پھرا کرتی، اور کتے ساری ساری رات بھیانک کو۔ کو
کو۔ کو کر کے روتے رہتے گویا ان کو موت نظر آتی تھی۔ اور ساری بلیاں خدا معلوم
آپ ہی آپ کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ دو چار جو دکھائی دیتی تھیں ان کے بھی دم دمے
گھٹ گئے تھے۔ وہ گوشوں میں چھپی چھپائی ڈری سہمی، دبکی رہتیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ
قدرت بھی تن کے بیٹھی ہے اور ہندوستان کے خلاف تعذیب و سرزنش کے لیے
آمادۂ بغاوت۔ ہزاروں جانیں جنگ میں ضایع ہو چکی تھیں۔ لاکھوں انسان جرمن
کی توپوں کا چارہ بن کر کھپ چکے تھے، پھر بھی قدرت ان ہلاکت آفرینیوں پر مطمئن نہ
تھی، اور اپنے غیظ و غضب میں انسان کی حیوانیت اور بربریت کو نیست و نابود

کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہی تھی۔ طرح طرح کے وبال آتے قہر نازل ہوتے۔ قدرت اپنی طاقت ہر طرح سے منوانا چاہتی تھی۔ اور اس لگی میں لگانے کو لنگڑے بخار کی وبا پھوٹ پڑی۔ محلّے بھر میں گھر گھر سے دن و رات آہ و بکا اور نالہ و شیون کی دل ہلا دینے والی صدائیں اٹھتیں اور ہوش کافور ہوئے جاتے۔ شہر میں کوئی گھر ایسا نہ بچا تھا کہ جہاں حضرت عزرائیل نہ پہنچے ہوں اور موت بے لیے ٹل گئی ہو۔ اسی وبا میں شمس کی دلہن بھی ملک عدم کو سدھار گئیں اور ان کے غم میں وہ پہلے سے زیادہ اللہ کے قائل ہو گئے۔ نمازیں زیادہ خشوع و خضوع سے پڑھی جانے لگیں۔ دونوں وقت وہ قبرستان جاکر بیوی کی تربت پر پھول چڑھاتے اور تکیے سے لگ کر گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ دن ختم ہو جاتا اور رات ڈیرے ڈال دیتی، سائے پھیل جاتے شہر خموشاں تاریک ہو جاتا۔ اس کی ویرانی سنسانی اور بڑھ جاتی۔

جوق در جوق، ہجوم در ہجوم لوگ کاندھوں پر اپنے جنازوں کو رکھے ہوئے ناشاد و برباد آتے رہتے۔ کوئی گھڑی کوئی پل ایسا نہ گزرتا جب مردے دفن ہونے نہ آتے ہوں۔ مہندیاں، خواجہ باقی باللہ اور نظام الدین اولیا میں تازی تازی قبریں نظر آتیں۔ مرد عورت، بچے بوڑھے، طاقت ور اور ناتواں، شاہ اور گدا، بلا تخصیص موت کا ذائقہ چکھ رہے تھے۔ اور پھر تو یہ حالت ہوئی کہ قبرستانوں میں چپہ چپہ بھر گیا۔ مر کر دو تین گز زمین بھی نہ ملتی تھی، اگر زندگی میں کوئی آرام و سکون نصیب نہ ہوا تھا تو موت کے بعد بھی چین و راحت کی امید نہ تھی۔ نیا قبرستان آباد ہو گیا جہاں لوگ اپنے جگر گوشوں اور چہیتوں کو لا لاکر دفن کرنے لگے۔ ان کا کوئی حساب تھا نہ گنتی شمار۔ اس معاملے میں ہندو خوش قسمت تھے کہ ادھر جان نکلی ادھر جمنا مائی کی پرشور لہروں نے بڑھ کر آغوش میں لے لیا۔ جن کی ارتھیاں پھکیں وہ کچھ جلے کچھ بجھے اور جسدِ خاکی پورا خاک بھی نہ ہوا کہ نیم جلی ہڈیاں پانی میں

بہہ گئیں اور راکھ ہو کے ساتھ اُڑ گئی۔ لیکن غریب تو مر کر بھی غربت کا نشان اپنی جبیں سے نہ مٹا سکا۔ ان کے مردے عریاں جمنا کے سینے پر مچلتی ہوئی موجوں پر بے ٹھکانہ جھکولے کھاتے پھرتے جن کی نہ کہیں سمادھی بنی نہ کہیں مزار تھا۔ لیکن جب قفسِ عنصری سے طائرِ روح پرواز کر چکا تو یہ باتیں بے کار ہیں۔ جب اپنا ہی وجود نہ رہا تو پھر اس تن کے لیے یہ رسم و تکلیف عبث اور خیالِ خام ہے بلا سے جلے یا بہے، چاہے دبے اور بے گور و کفن پڑا رہے اور حشرات الارض کی خوراک بنے۔ کون قابلِ تعزیر ہوتا ہے۔

لیکن مسلمانوں کی یہ بے نصیبی تھی کہ روزِ جزا سے پہلے ناکردہ گناہوں کی سزا اس طرح بھگتتے رہے تھے کہ مرنے کے بعد قبر میں بھی چین سے سونے نہ پائے اور کفن چور ان کے دو گز کفن بھی جسم پر رہنے نہ دیا بھوکے پیٹوں نے روٹی پیدا کرنے کے وسیلے اور ذرائع ڈھونڈ نکالے تھے۔ یہ رات کو کدال اور آنکڑے لے کر جاتے نئی قبروں کو کھودنا مشکل بھی نہ ہوتا تھا۔ ذرا سا قبر کا منہ کھولا اور آنکڑے سے کفن گھسیٹ لیا۔ نہ ہلدی لگی نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا۔ گئے اور بازار میں بیچ کر ٹکے کھرے کر لیے۔ ننگ دھڑنگ لاشوں کو بجو اور گیدڑ ٹھکانے لگا دیتے۔ لنگڑے بخار کی وبا اور اس نوع کے سہل ذریعہ معاش جنگ میں استعمال ہونیوالی زہریلی گیسوں کے مہلک اثرات اور بڑھتی ہوئی گرانی کے نتائج تھے۔

گورکنوں کے بھی دن پھر گئے۔ اور جب ہزاروں کی قسمت سو رہی تھی ان کی قسمت جاگ اٹھی۔

ان کی روزی چھپر پھاڑ کر جنگل اور ویرانوں میں پھوٹ رہی تھی اور اُن کے گھروں میں دھن برسنے لگا ——— مانگ کے حساب سے

انھوں نے بھی اپنے نرخ چوگنے اور پچ گنے کر دیے تھے۔ آٹھ آنے کی قبر سے بارہ آنے ہوئی پھر تو نوبت چار اور پانچ روپیوں پر پہنچ گئی۔ گورکنوں کے خنّاس ایسے بگڑے کہ آدھی ادھوری قبر کھودی اور چل میرے بھائی، مردے کو دبا دیا۔ اگر کسی نے کہا: "میاں ذرا سی تو گہری کر دو" تو وہیں ٹکا سا جواب سُن لو: "ایسا ہی ہے تو خود کھود لو۔ ہم اس سے اچھی نہیں کھود سکتے۔ ایک تمہارا ہی مردہ تو ہمیں عزیز نہیں آخر اور بھی تو ہماری جان کو رونے والے کھڑے ہیں۔" بہتی گنگا میں کون ہاتھ نہیں دھوتا۔ نہ مردے ٹھیک سے دفن کرتے نہ قبروں کو پاٹتے، بلکہ پرانی قبروں کو کھود کھود کر سلیں الگ نکال لیا کرتے اور ان کے منہ مانگے دام لیتے۔ دو روز بعد ہی قبر بیٹھ جاتی اور مردے کے سینے پر مٹی کا ڈھیر ہوتا۔ عزیز و اقربا بے بسی سے یہ حال دیکھتے اپنے رنج و غم میں یہ اذیت اور سہتے مگر وقت ہی ایسا تھا، کسی سے کہتے بھی تو کیا کہتے۔ اول تو اپنی مصیبتوں کے آگے اوسان ہی کیسے تھے اور پھر گورکنوں کے ٹیپ کا بند یہ تھا: "ہم کیا کریں۔ پتھر سونگھنے کو بھی نہیں ملتا۔ یہ تو تمہاری خاطر معلوم نہیں اتنا بھی کہاں سے کر دیا۔ جنگ کی وجہ سے بازار مندا ہے، بیوپاری دکانداروں کے ہوش اُڑ گئے ہیں، چیزوں کو آگ لگ رہی ہے۔" اور مرنے والا مر کر بھی زندگی کی آخری افتاد دنیا والوں کے ہاتھ اس طرح سہتا۔ موت کو دیکھتے دیکھتے ان کے دل پتھر سے زیادہ سخت اور موت سے زیادہ بے حس ہو گئے تھے۔ کمال بیدردی سے جبکہ ایک لاش خراب و خستہ بھی نہ ہونے پاتی کہ نیا مردہ اسی قبر میں رکھ دیتے۔ اگر وہ شخص جو شام کو اپنی بہن کو دفنا کر گیا تھا اور صبح بیوی کو دفنانے لے کر آیا اور اس نے کھدی ہوئی قبر کو دیکھ کر باز پرس کی تو وہ اکڑ کر جواب دیتے:

"میاں اپنا مردہ یہاں رکھوانا ہے یا نہیں؟ دماغ بھی درست ہیں۔"

اتنی بڑی تہمت ہم پر دھر دی ۔ خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے ......"

شہر میں بنیے بزازوں کی بن آئی اور پانچوں گھی میں تھیں ۔ لٹھا تو سرے سے ناپید ہو گیا تھا۔ گھی، شکر، گاڑھا گزی کی قیمتیں من مانی کر دی تھیں ۔ اوّل تو کسی کے کہنے کی جرارت ہی نہ ہوتی ۔ ہاں اگر کوئی بہت ہی جی دار ہوا اور اس نے ٹوکا تو صاف جواب دیتے :

"میاں جنگ نے آفت توڑ رکھی ہے ۔ ہمیں تو دو پیسے بھی نہیں بچتے ۔ کیا مرنے والے کے لیے اتنا بھی نہ کرو گے ۔ آخر اس کا بھی تو تم پر کچھ احسان ہوگا ۔"

یہ کہہ کر وہ کوئی جھر جھرے کپڑے کا تھان سامنے رکھ دیتا ۔ کفن لینے والا کپڑے کو دیکھتا اور دل ہی دل میں کہتا کہ ایسا کفن دینے سے تو نہ دینا اچھا اور چار و ناچار اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر مہنگا کپڑا خرید لیتا اور ہمیشہ کے بچھڑ جانے والے کو اچھا کفن دے کر اپنا آخری حق ادا کر دیتا ۔

غسالوں کا تو پوچھنا ہی کیا ۔ ان کے پاؤں میں بلی بندھ گئی ۔ ابھی ایک گھر میں گھسے اور میت کو نہلانا شروع کیا تھا کہ دوسرے گھر سے بلاوا آ گیا اور وہ ہوائی گھوڑے پر سوار جیسے تیسے دو چار آدھے ادھورے پانی کے لوٹے بہاتے، میت کچھ تر ہوئی اور کچھ نہ ہوئی اور کفنا دیا ۔ مردے کے جسم سے جو ہاتھ لگا وہ کسی کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی، وہ ان کا اور ان کے باپ دادا کا ۔ انگوٹھی، چھلے، تعویذ، بٹن، چوڑیاں جو ہاتھ لگا اپنے نیفوں میں اڑس لیا ۔ مردوں کو نہلاتے نہلاتے ان کو اتنی بھی فرصت نہ تھی کہ دو چلو پانی لے کر اپنے پنڈے پر ڈال لیں ۔ چونسٹھ گھڑی مردوں کو نہلانے کا شگون کرتے ۔ ایک گھر سے نکل دوسرے میں اور دوسرے سے نکل تیسرے میں گھس جاتے ۔

آخر میں روحوں کی کثافتوں کو بڑی بڑی گندہ داڑھیوں کی اوٹ میں

چھپائے ہوئے پارسا بنے پھرتے اور کلمے کا وِرد کرتے رہتے۔ زباں پر نام خدا ہوتا اور دل میں سیم وزر کے بُت۔ روپیوں کی بھری تھیلیاں کمر کے گرد مضبوطی سے بندھی ہوتیں اور اپنے بھرے پیٹوں پر اطمینان سے ہاتھ پھیرتے، وہ ہاتھ جو ہوسناک اور گنہگار تھے۔

دلّی میں ڈال ڈال اور پات پات صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی، اور ہر طرف موت کا دور دورہ تھا۔ مگر دلّی والوں نے اپنی قدیم روایات کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ وہ جولانیٔ طبع جو وہ اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوئے تھے اس موقع پر بھی زندہ دلی دکھا گئی اور لنگڑے بخار پر سینکڑوں گیت، غزل اور نظمیں موزوں ہو گئیں، اور اس نفسی نفسی کے حشر خیز دنوں میں بھی گرم جنوں کی طرح ہاتھوں ہاتھ بک گئیں۔ ہر طرف سے ان کے گا گا کر بیچنے کی آوازیں سنائی دیتیں:

کیسا ظالم یہ لنگڑا بخار ہے   جس کو دیکھو وہ زار و نزار ہے
لکڑیاں ٹیک کر لوگ چلنے لگے   بیٹھ کر ڈولیوں میں نکلنے لگے
اسپتالوں میں آئی بہار ہے   کیسا ظالم یہ لنگڑا بخار ہے

مگر گانے سے بھی بگڑے حال احوال نہ سُدھرے اور خالی خولی جھوٹی تسلیوں سے انسان کی بے چین روحوں کو راحت نصیب نہ ہوئی۔ گھروں اور مسجدوں میں زور زور سے اذانیں دی جانے لگیں۔ جامع مسجد میں نمازِ خوف اور دفعیہ بلیات کی خاص نمازیں ادا کی جاتیں۔ لیکن شاید کوئی خدا نہ تھا جو مضطر و برباد دنیا پر نظر کرتا اور بے کس و مظلوم انسانوں کے درد بھرے نالے اور ان کی ناتواں فریادیں سنتا۔ ان کی صدائیں بلند ہوتیں مگر عرش کے کنگورے سے ہلا کر ناکام لوٹ آتیں۔ نہ اذانوں نے اثر دکھایا نہ دعائیں ہی قبول ہوئیں۔ خدائے جبار و قہار، سمیع و بصیر اپنے عرش پر بے نیاز و مستغنی بیٹھا رہا، اور موت مطلق العنانی سے بستی بستی گھر گھر پھاگ کھیلتی پھری۔ اس کا کھیل انسانوں کو بہت بھاری پڑا۔ جیتے جاگتے،

ہنستے کھیلتے انسان پل میں چٹ پٹ ہو جاتے اور وہ مُردوں کو پہلو بہ پہلو سلاتی رہی۔

ڈھائی دن کی سنی تھی مگر یہاں تو لنگڑا بخار ڈھائی پل کی مہلت بھی نہ دیتا تھا۔ آدمی جھینگوں کی طرح مر رہے تھے۔ وہ کونسا گھر تھا جہاں ملک الموت کی رسائی نہ ہوئی اور وہ کونسا مکیں جس سے ان کی شناسائی نہ تھی۔ ان دنوں انھیں فرصت یک لحظہ نہ تھی۔ وہ تیر کی طرح ایک دروازے سے نکل کر دوسرے مکان میں داخل ہو جاتے اور انسانوں کی روح قبض کر لیتے، وہ انسان جو بخار کی تپ میں جل بھن رہے تھے مگر جن کو زندگی کی تمنا اب بھی تھی، اسی زندگی کی جس نے کبھی ان کے ساتھ وفا نہ کی جب تک زندہ تھے تو موت کی دعائیں کرتے تھے اور اب جب کہ موت ان کو دنیا کی تمام صعوبتوں سے نجات دلانے ان کے سرہانے محسن بنی کھڑی تھی، تو جو کچھ بھی تمنا ان کو تھی وہ اسی دنیا میں کچھ اور جینے کی جہاں نہ عشرتیں پائی تھیں نہ آرام، اور مسکراہٹیں بھی مستعار تھیں۔

۲

جس طرح اوس کھائی ہوئی گلاب کی کلی آفتاب کی حرارت پاکر تر و تازہ ہو جاتی ہے اسی طرح بلقیس کے سوکھے پیاسے ارمان بھی محبت کی حدتیں پاکر شاداب ہو گئے اور اس کی آنکھوں کے نرگسی پیالے رس بھرے دکھائی دینے لگے۔ جنوری کے بعد چار، پانچ مہینے روبہ صحت ہو کر وہ خاصی بھلی رہی اور یہ زمانہ ہنسی خوشی میں باد صرصر کی طرح گزر گیا۔ مگر گرمیوں کے شروع ہوتے ہی اس کی طبیعت پھر مضمحل رہنے لگی۔ شہر میں وبا کا زور ابھی تک نہ ٹوٹا تھا اور چاروں طرف سے گریہ و زاری کی دردناک آوازیں آتی رہتی تھیں، وہ ابھی تک اپنی ہمت اور ارادوں کے بل بوتے پر جی رہی تھی مگر یہ آوازیں بار بار اس کو موت کی یاد دلاتیں جسے اس نے ایک مدت تک بھلا دیا تھا، اور موت کا وحشت ناک خیال آتے ہی اس کی ہمت پست ہو جاتی۔

جون کا آخر تھا چاند تھا اور ایک روز اچانک بلقیس کو بخار نے آ لیا۔ اصغر نے فی الفور ڈاکٹر مسترا کو بلا کر دکھایا۔ اس نے بظاہر یہی کہا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں

لیکن دلّی کا موسم آجکل بہت خراب ہے۔ جب میر نہال نے ملقیس کے بخار کا سنا تو خاصے فکرمند ہو گئے۔ بیگم نہال ڈولی منگوا کر بہو کو دیکھنے گئیں، بینائی جاتی رہنے سے کسی مدد کے قابل تو نہ رہی تھیں اور ایک دو دن ٹھہر کر گھر واپس آگئیں۔ میر نہال کو بھی تو اس حالت میں اکیلا نہ چھوڑ سکتی تھیں حالانکہ ملقیس کا بخار ابھی تک نہ اترا تھا۔

بیگم نہال کے چلے آنے کے بعد ملقیس کی حالت نازک ہو گئی۔ بیگم شہباز اور اصغر دونوں ملقیس کی تیمارداری میں لگے رہے۔ دو دن اور دو راتیں آنکھوں آنکھوں میں کٹ گئیں۔ بیگم شہباز دل کی بودی تھیں لہٰذا اپنے ساتھ اصغر کو بھی جگائے رکھتیں۔ پانچویں روز بھی جب ملقیس کی حالت کسی طرح نہ سنبھلی تو اصغر ماں کو خبر کرنے گیا۔ بیگم نہال نے جو بہو کی کیفیت سنی تو اصغر کے ساتھ چلنے کو تیار ہوئیں، مگر اصغر نے یہ کہہ کر انھیں روک دیا:

"امّاں تم جا کر کیا کرو گی۔ تم کو خود سجھائی نہیں دیتا، خواہ مخواہ حیران ہو گی، اور پھر ابّا بیچارے اکیلے پڑے رہیں گے۔ ویسے خدانخواستہ کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ آج رات میں مسرور کو اپنے ساتھ لیے جاتا ہوں۔ وہ وہیں سو رہے گا۔"

بہو کی حالت تشویشناک تھی۔ بیگم نہال موقع محل سمجھتی تھیں اور انھوں نے زبردستی دلچین کو بھی اصغر کے ساتھ کر دیا۔ اصغر کئی راتوں کا جاگا ہوا تھا پڑتے ہی سو گیا۔ بیگم شہباز نے مسرور کا پلنگ اپنے اور ملقیس کے بیچ میں بچھوا لیا۔ دلچین انگنائی کے ایک کونے میں پڑ رہی۔ اندھیری رات تھی اور نزع کا سا سکوت سارے گھر پر پھیلا ہوا تھا۔ مسرور لیٹتے ہی سو گیا۔ بیگم شہباز بیگ کو ڈر کے مارے نیند نہ آئی۔ تھوڑی دیر تو وہ چپکی پڑی رہیں، خاموشی اور اندھیرے میں گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا اور انھیں تاریک دروازے کے

پیچھے کوئی کھڑا ہوا نظر آتا۔ پرچھائیاں چلتی ہوئی معلوم ہوتیں اور یہی ڈر ہوتا کہ موت کا فرشتہ اندھیرے میں کہیں غلطی سے ان کی روح قبض نہ کر لے۔ انھوں نے پاؤں کے انگوٹھے سے مسرور کے زور سے چٹکی لی۔ مسرور جاگ گیا۔ سب پڑے سو رہے تھے، وہ پھر کروٹ بدل کر سو گیا۔ بیگم شہباز کو پھر وہی سہم چڑھا اور انھوں نے مسرور کے پھر چٹکی بھری۔ وہ پھر جاگ گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، مگر سب گھر والے اسی طرح بے خبر سو رہے تھے۔ وہ حیران تھا کہ آخر کون ہے جو اس کے چٹکیاں بھر رہا ہے۔ جب بیگم شہباز نے تیسری مرتبہ پھر یہی حرکت کی تو مسرور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور آواز دی:

"کون ہے؟"

مگر کوئی جواب نہ ملا۔ بیگم شہباز ایسی مگری بنی پڑی رہیں جیسے وہ سو رہی ہوں۔ بلقیس کے اوپری اوپری سانسوں کی بھاری آواز آ رہی تھی۔ زمین سے آسمان تک ایک غیر ارضی سکوت چھایا ہوا تھا اور کہیں دور کوئی کتا منہ اٹھا کے رو رہا تھا۔ لیکن گھر میں کوئی بات خلافِ معمول نہ تھی۔

آخر کار بیگم شہباز کو بھی جھپکی آ گئی۔ پچھلا پہر ہو رہا تھا۔ بلقیس کا سانس اٹک اٹک کر چلنے لگا اور اس نے گھبرا کر آواز دی:

"ذرا کوئی آنا۔"

اس نے کسی کا نام لے کر نہیں پکارا۔ جب کوئی نہ اٹھا تو اس نے دوبارہ آواز دی۔ تیسری آواز پر مسرور کی آنکھ کھل گئی اور وہ جلدی سے اٹھ کر پوچھنے لگا:

"کیا ہے بھابی دلہن؟"

"اپنے بھائی کو بلا دو۔"

مسرور کو بلقیس کی آواز غیر مرئی معلوم ہوئی۔ اس نے جا کر اصغر کو جگایا۔

اصغر چونک کر اٹھ بیٹھا اور پوچھا:

"کیوں کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟"

مسرور نے جواب دیا:

"بھابی دلہن آپ کو بلا رہی ہیں!"

اصغر سراسیمہ ہو کر ننگے پاؤں دوڑ کر بلقیس کے پاس آیا۔ سارے عالم پر نیند کا غلبہ تھا اور در و دیوار پر ایک مہیب خاموشی چھائی ہوئی تھی اور اس مکمل سکوت کی سائیں سائیں میں جیسے ارواحیں چپکے چپکے بول رہی تھیں اور سارے گھر میں ایسی وحشت ناک تنہائی تھی کہ جی اُڑا جاتا تھا۔ اصغر نے جھک کر بلقیس کو دیکھا۔ اس کی زندگی کا پیالہ لبریز ہو چکا تھا۔ چہرہ پر زردی پھیل گئی اور دم کھنچ کر آنکھوں میں آ گیا تھا۔ اس نے اٹک اٹک کر بہت وثوق اور انتہائی سکون اور اطمینان سے کہا جیسے سارے احساسات نے مل کر سب خساروں اور مصائب پر فتح حاصل کر لی ہو۔

"لو ہم تو جاتے ہیں۔ کہا سنا معاف کرنا۔ اپنی جہاں آراء تمہیں سونپی!"

"بلقیس! بلقیس!!۔ کیا کہہ رہی ہو؟" اصغر نے بلقیس کو ہلکے سے جھنجھوڑا۔ اور ڈر اور گھبراہٹ میں کہا:

"دیکھو تو صبح ہونے والی ہے......!"

طول طویل شب غم تمام ہو چکی تھی اور ہلکا ہلکا نور سحر کا پتا دیتا تھا۔ لیکن اصغر نے اچانک محسوس کیا کہ پہلو میں ایک پرواز سی ہوئی اور اس کے وجود میں سے کوئی کشش غائب ہو گئی۔ ہوا سائیں سائیں کر کے زمین کی آہیں آسمان تک لے جا رہی تھی۔ سانس کی آخری غرغر ختم ہوئی، بلقیس کی آنکھیں

اوپر چڑھ گئیں جیسے کسی عظیم و جبّار غیبی طاقت نے جو ناقابلِ شکست تھی ان کو کھینچ لیا ہو۔ اصغر نے بلقیس کا ہاتھ پکڑ لیا جو اس طرح تھر تھرا رہا تھا جیسے کوئی برقی لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ رہی ہے۔ اصغر نے سرہانے بیٹھ کر لیسین سنانی شروع کردی۔ لیکن اب وہ اس دنیا کے ہر تکلفات سے بے نیاز، اندیشوں سے بے خطر، اذیتوں سے مبرا ایک دنیائے سرمدی میں پہنچ چکی تھی، جہاں سرودِ ابدی اور راحتِ جاودانہ کی سلطنت ہے۔

۳

بلقیس کی موت کے بعد اصغر دنوں مغموم اور خاموش رہا۔ وہ روز بیوی کی لحد پر فاتحہ پڑھنے جاتا، قبر پر پانی چھڑکتا، اگربتیاں سلگاتا، گلاب اور موتیا کے پھول چڑھاتا۔ چالیسویں کے بعد اپنے سامنے بیٹھ کر قبر پکی کرائی اور اس کے چاروں طرف سبز حاشیہ بنوایا۔

ایک دن شام کو بڑی گرمی تھی، حبس ہو رہا تھا۔ اصغر نے قبرستان جانے کے لیے تانگہ کیا اور جب تانگہ شہر سے نکل کر قبرستان جانے والی سڑک پر پہنچا تو تانگے والا ایک چلتی ہوئی غزل الاپنے لگا۔ اس کی آواز بھاری ہونے کے علاوہ پُرسوز تھی:

جاؤ سدھارو میری جاں تم پہ خدا کی ہو اماں
بچھڑے ہوئے ملیں گے پھر قسمت نے گر ملا دیا
جور و ستم دیا اس نے قسمت ناسپاس نے
عاشق نامراد پر خنجرِ غم چلا دیا

پھر نہ کسی سے کہیے گا دعوۂ عشق ہے غلط
ہم نے تمہارے عشق میں مر کے تمہیں دکھا دیا

سڑک سنسان تھی ہر طرف ایک اداسی کا عالم تھا۔ اس وقت اصغر کو اپنی ساری کی ہوئی زیادتیاں ایک بار یاد آئیں۔ بلقیس کا ایثار اور اس کی بے زبان محبتیں اس کے دل کو تڑپانے لگیں۔ وہ قبر پر گھٹنوں بیٹھا ہوا اپنی خطاؤں کی معافیاں مانگ مانگ کر آنسوؤں کی لڑیاں پروتا رہا۔

دھیرے دھیرے سورج ڈوب گیا حتیٰ کہ ہر چیز سیاہ پوش ہو گئی اور آسمان کی شفاف نیلا ہٹوں میں ستاروں کے دیے جلنے لگے۔ صبا آہستہ آہستہ چلنے لگی اور اس خاکداں میں نہ اس کو قلبِ گیتی کی دھڑکنیں سنائی دیتی تھیں اور نہ زندگی کائنات میں روح کارفرما معلوم ہوتی تھی۔ اور وہ نظامِ ہست و بود سے بلند و بالا ہو کر زہرہ و مریخ کو عبور کر کے لامکان سے بہت دور پہونچ گیا۔

۴

مرنا کوئی دار و رسن پر ہی موقوف نہیں ۔ میر نہال اپنے پلنگ پر لیٹے رہا کرتے۔ ان کی زندگی بس یادِ ماضی بن کر رہ گئی تھی اور وہ رات دن ان ہی پرانے تاروں سے تانے بانے بُنا کرتے۔ وہ دلنشین زمانے خواب ہوئے، وہ محفلیں جو برہم ہوئیں اب اُن کی یاد ہی فقط میر نہال کا سرمایۂ حیات تھی۔ نہ وہ صبحِ عشرت تھی نہ وہ شامِ رنگیں محض ماضی کے کھنڈر تھے اور یادوں کے انبار۔ جسم مفلوج اور بیکار ہو چکا تھا اور زندگی درماندہ۔ اب تو انھیں سر بھی بارِ دوش معلوم ہوتا تھا۔ قیدِ حیات اور بندِ غم سے رہائی پانے کے لیے ان کی روح پھڑپھڑاتی، دل ململاتا، اور وہ کلیجہ مسوس کر رہ جاتے اور ٹکر ٹکر بزمِ گیتی کو دیکھتے جس کی رونقیں دم بدم ماند ہوتی جا رہی تھیں۔ جس طرح بن کے پنکھ پکھیرو اُڑ جاتے ہیں ایک ایک کر کے ان کے سب ساتھی بھی ان کو اکیلا چھوڑ کر رخصت ہوتے جا رہے تھے اور ان کے سامنے کے بچّے جن کے ابھی مرنے کے دن نہ تھے وہ دامِ زندگی سے رہائی پا کر زندگی کی شقاوتوں سے آزاد ہو رہے تھے۔ میر سنگی کا وصال ہو چکا تھا۔

لال شاہ بچّا پان تھے اور اپنی ضعیفی سے لاچار اور مجبور، پھر بھی حقِّ دوستی اور وضعداری نباہتے اور دو چار مہینے میں آکر میر نہال کی خیر و عافیت پوچھ جاتے۔ کمبل شاہ تو ایسے غائب ہوئے تھے کہ آج تلک اُن کا اَتا پتا کسی سے نہ مل سکا۔ صرف ایک میر نہال ہی لوحِ جہاں پر مٹتے ہوئے حرف کی طرح باقی رہ گئے تھے اور اس گزرے ہوئے زمانے کے شاہد اور اس قدیم خزینے کے تنہا وارث۔ ہر واقعہ یاد آکر داستان دَر داستان بن جاتا اور میر نہال صحرا بہ صحرا بھٹکتے ہوئے ماضی کے بے کنار سمندر میں غوطہ زن ہو کر یادوں کے کچھ انمول موتی نکال لاتے اور محبت کے پچھلے خروش اور ہنگامِ عشق کی ان شعلہ سامانیوں کو جب ذرّہ ذرّہ زندگی کی گوناگوں مسرتوں سے گوہرتاب تھا پھر صحبتِ شب کی خموشیوں کو یاد کر کے دو آنسو بہا لیتے۔

ایسی دارو کے بے ہوشی کہاں تھی جوان کی یادداشت کو کھو دیتی۔ ہر وہ چیز جس کو انھوں نے چاہا تھا بے برگ و ساز ہو گئی۔ ہر وہ شے جس کے وہ علمبردار تھے تنشیہ۔ وقت نے چُور چُور کر دی۔ ہندوستان کیا تاراج ہوا کہ ان کی دلّی بھی عہدِ پارینہ کا ورق بن گئی۔ گزشتہ سال پھر جذبۂ آزادی نے ہندوستان کے سینے میں لہریں لے کر ان بیتاب دلوں کو بیدار کر دیا جو اپنی آزادی کے ناموس پر فدا تھے اور انگریزوں سے اپنی میراث واپس لینا چاہتے تھے اور تحریک ہوم رُول برق و باد بن کر ملک بھر میں اس طرح چھائی کہ آنے والے طوفانوں کا پیش خیمہ بن گئی۔ لیکن میر نہال جانتے تھے کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے ہاتھ میں برہنہ تلوار لے کر فیصلے کیے جاتے ہیں، سر دیا سر لو کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ مگر اب تو نوجوان زبانی جمع خرچ اور نعرے لگانے کے قائل تھے۔ میر نہال کے نزدیک ڈھول پیٹ پیٹ کر بھڑکانا، اُکسانا اور تہلکے مچانا

کوئی فوقیت نہ رکھتا تھا اور اب کوئی وطن پر نثار ہوا تو کیا؟ یہ قربانیاں یہ فخر و افتخار میر نہال کے لیے نہ تھے۔ یہ نئی نسل کی اپنی کاوشیں اور دردسری تھی یہ نئی سحر جو طلوع ہو رہی تھی اس کی روشنی اور اجالے صرف ان ہی کے لیے تھے، میر نہال کو بھلا ان سے کیا واسطہ؟ اور جب ان کی اپنی دنیا لٹ لٹا کر مسمار ہو چکی تھی تو اب دنیا کے رہنے والے خود اپنی دنیا آباد کریں یا برباد، انھیں اس کے عروج سے مطلب تھا نہ زوال سے سروکار۔ نئے نئے طریق نئے قانون، نئے رنگ ڈھنگ رواج پا رہے تھے۔ ہر سمت جدّت کی اجارہ داری تھی۔ مغرب سے مربوط اور مخلوط ہو کر نظریات بدل چکے تھے اور ہندوستان کی اپنی تہذیب آدھا تیتر آدھا بٹیر ہو کر رہ گئی تھی اور میر نہال کے نزدیک اس نئی تانتی کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے دھوبی کا کتّا جو گھر کا رہا ہو نہ گھاٹ کا۔ تمرکوں نے گیلی پولی میں انگریزوں کو شکست دے دی تھی، مگر انھیں اس فتح سے بھی خاک خوشی نہ ہوئی۔ دل سے احساسِ سود و زیاں جاتا رہا تھا۔ قافلے گر آگے بڑھتے رہے تو کیا اور ٹھہر جائیں تو کیا؟ نہ اگلے وقت تھے نہ اگلے لوگ، نئے زمانے کے ساتھ نئی پود میں وہ ارادوں کا استمرار کہاں تھا، وہ حوصلوں میں استقلال نہیں تھے۔ جب مزاجوں میں امتزاج ہی نہ رہے پھر دونوں زمانوں میں ہم آہنگی کیوں کر ممکن تھی۔ اور میر نہال حالات و حادثات سے سمجھوتہ نہ کر سکے، اور پھر انھیں تفریق کی کھائی پاٹ کر کونسی الگ اپنی دنیا دوبارہ آباد کرنی تھی؟

فصلِ بہار جا چکی تھی، موسمِ گل ختم ہوا، خزاں کا راج تھا اور اس کی بے رنگی سے خاک ہی خاک اڑ رہی تھی۔ زمین و آسمان دھندلا گئے، نقشِ پا مٹ گئے۔ فضا تیرہ و تار تھی اور نفس کی ہر آمد و شد تھکا دینے والی۔ اور میر نہال دیومالائی کہانیوں کا ایک گم شدہ وجود ہو کر رہ گئے۔ دل کی نزاکتیں چھن چکی

تھیں، ذوقِ لطیف و نفیس اکارت ہو گیا تھا اور وہ ایاغ ہستی جو مئے صد رنگ سے چھلکا کرتے تھے اب خشک اور خالی پڑے تھے اور ہر حُسن و احساسِ لطیف جو تارِ رگِ جاں کی طرح زندگی سے پیوست تھا ٹوٹ چکا تھا۔ فرنگیوں نے آکر انسان اور زندگی کے ہر پہلو سے تمام مال و متاع لوٹ لی۔ وہ پُرانی شان و شوکت، وہ رفعتیں، وہ عظمتیں اور وہ جلال و جمال جن سے زندگی جگر جگر کر رہی تھی فنا ہو گئے۔ سب عزم اور جرأتیں، ناز و تمکنت خاک میں مل گئے اور قلبِ مضطر کی جگہ خونِ تمنّا اور حسرتوں کے داغ تھے ـــــ رہوارِ وقت ایڑ لگا کر اڑا چلا جا رہا تھا اور مایوسیاں ہم رکاب تھیں ہندوستان کا چہرہ سنگسار ہو کر مسخ ہو گیا تھا۔

میر نہال پڑے ہوئے خالی خولی خلا کو گھورتے اور ان کو ہر سمت تنزّل اور انحطاط کا دور دورہ نظر آتا۔ خاک کے ذرّے ان کے لیے ویرانہ بن گئے تھے مگر وقت بڑی سُرعت سے گردش کر رہا تھا اور زمانہ بے مہری سے آگے بڑھتا جاتا تھا۔ ہزیمت خوردہ زندگی نڈھال تھی اور گھایل انسان وقت و زندگی سے مات کھا کر تھکا ہارا جہاں کا تہاں بہت پیچھے کھڑا کا کھڑا رہ گیا اور حیرت سے جہاں کو تک رہا تھا۔ گلی میں لوگ نئی نئی غزلیں گاتے ہوئے گزرتے جن کی دھنیں بھی عامیانہ ہوتیں:

فراقِ جاناں میں ہم نے ساقی لہو پیا ہے شراب کر کے
تپِ الم نے جگر جو بھونا تو ہم نے کھایا کباب کر کے
مرے جنازے پہ میرا قاتل یہ کہہ رہا تھا نماز پڑھ کے
بس اب تو یہ بھی عذاب اترا چلا ہوں کارِ ثواب کر کے

میر نہال ان غزلوں کو سنتے، نفرت و بیزاری سے کروٹ بدل لیتے اور پھر وہی احساس بے سر و سامانی ان پر اپنا تسلّط جما لیتا اور انھیں معلوم ہوتا کہ کسی نے ان کو تحت الثریٰ میں پھینک دیا ہے۔ عجب انقلاب زمانہ تھا۔ ہر چیز درہم برہم ہو گئی۔ وہ ربط و ضبط

وہ توقیر وقدر کسی میں نوازن نہ رہا۔ نظریے اور خیالات جو میر نہال کی جوانی سے اب تک ایک خاص منتہائے کمال کے حلقہ بگیر تھے اپنا وجود قایم نہ رکھ سکے۔ اور خیالوں کی وہ مقناطیسی قوت جس نے ایک کشش پر تمام شاعروں اور قدردانوں کو جمع کر رکھا تھا جاتی رہی۔ اب قدر و قیمت کے پیمانے بدل چکے تھے۔ مینائے شاعری میں بال پڑ چکا تھا۔ فن و ادب، معراج و کمال کی اساس جھکولا کھا چکی تھی۔ شعر و شاعری بام بلند سے لڑکھڑا کر نیچے آپڑی۔ اظہار و معانی کی جلا اُتر گئی، بیان و کلام رکیک و لچر ہو گئے اور رجز سوقیانہ اور ابہام کچھ نہ رہا، اور زندگی بجائے زندگی کے موت کا شائبہ ہو ہو کر رہ گئی۔ وہ لوگ کہاں جا بسے، وہ سحرالبیان شاعروں کی جادوگری نہ رہی۔ وہ مشاق طرز شناس حسن و خیال کی عسرتوں کے ساتھ ہی دامن ہو چکے تھے۔ کہاں ہیں وہ میر و مومن، کدھر گئے وہ غالب و سودا؟ درد و انشا جا چکے اب تو ذوق بھی نہ رہے۔ اس دور کو کیا ہوا، وہ شام و سحر کدھر گئے؟ زمانے نے ادب و شاعری کے قلعوں کو بند کر دیا اور وہ سب وقت کے انباروں میں مخفی ہو گئے۔ نہ اب وہ جبیں تھی نہ وہ سجدہ گاہ نہ اب مسجود۔

زندگی یوں بھی گزر جاتی ہے کہ نہ احساسِ لطف و کرم ہی یاد ہوتے ہیں نہ قہر اور جفائیں۔ یہ ہی حال میر نہال کا تھا۔ اصغر بارہا ایسا ہوا کہ ابا کے پاس انگریزی کپڑے پہنے ہوئے آیا۔ میر نہال نے دیکھا اور ایک لفظ بھی نہ کہا۔ وہ یہ بھی بھول چکے تھے کہ ان کو انگریزی کپڑوں سے کبھی نفرت اور چڑ تھی۔ نثار احمد اذان دیتے۔ ان کی پاٹ دار آواز گونجتی۔ اس میں وہی جاہ و جلال ہوتا۔ میر نہال اذان سنتے اور جل شانہ کہتے مگر نماز کے لیے کھڑے نہ ہوتے۔ ان کے قویٰ فولاد سے زیادہ بھاری ہو گئے تھے۔ اٹھنا بیٹھنا بھی دوبھر معلوم ہوتا اور طاعت و بندگی پر طبیعت مائل نہ ہوتی۔ اپنے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے غفور کو بلانا پڑتا۔ وہ آتا اور ناک بھوں چڑھا کر

بے دلی سے کام کر دینا۔ اس کے کام میں لا پرواہی آ گئی تھی، مگر وہ اس پر بھی کچھ نہ کہتے۔ انھوں نے غم دہر کو اپنا لیا تھا اور سرد مہریوں کے عادی بن گئے تھے جس طرح انھوں نے زندگی کو نخوت و ناز سے گزارا تھا اسی نخوت سے اس کی جفا کاریاں جھیل رہے تھے۔

بیوی بھی ان کو زیادہ دیکھنے نہ آتی تھیں، بیگم نہال کی آنکھیں جا چکی تھیں اور اب ان کا صرف یہ کام رہ گیا تھا کہ وہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی چھالیہ کترتی رہتیں اور الجھے ہوئے تاگوں کے گچھوں کا ڈھیر ان کے قریب پھیلا رہتا۔ ان کی بے نور پتلیاں مانند دکھائی دیتیں اور وہ ٹھہری ہوئی نگاہوں سے سامنے گھورتی رہتیں۔ ان کے گالوں پر ناک کے قریب سے ٹھوڑی تک دونوں طرف دو گہری گہری لکیریں پڑ گئی تھیں اور جھریوں کا جال پڑ کر منہ کی کھال لٹک آئی تھی اور چہرے سے خوشی و رنج کی کوئی علامت ظاہر نہ ہوتی۔ وہ محویت سے الجھے ہوئے تاگوں کی لچھیاں گھٹنوں میں پھنسا کر سلجھایا کرتیں۔ جو تاگے ٹوٹ جاتے ان کو گرہ دے دے کر جوڑتی جاتیں اور رنگلی پر لپیٹ لپیٹ کر پنچکیں بناتی رہتیں۔ ان کے ہاتھ چلتے رہتے اور اس کے ساتھ ذہن بھی پرانی یادوں کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف رہتا۔

گو دلچین لکڑی لے کر چلنے لگی تھی مگر تھی تندرست اور بیگم نہال اسی کی خدمتوں کی محتاج تھیں۔

جمال بیگم بھی عمر کے بوجھ سے جھک گئی تھیں۔ دنیا زمانے سے شکوہ شکایت اب بھی تھے مگر اب وہ کبھی کبھی طرح دے جایا کرتی تھیں۔ مسرور پڑھنے میں صفر رہے اور سلسلہ تعلیم دسویں جماعت تک بھی نہ پہونچا۔ چنانچہ لکھنا پڑھنا چھوڑ کر ایک آدھ جگہ ملازمت کی مگر مزاج کے تیز تھے اور کسی سے نہ بنتی تھی اور ہر جگہ سے علیحدہ ہو جاتے تھے۔ لہٰذا اپنی چچی کے پاس چلے گئے۔ شمس بظاہر نمازی اور پارسا

تھے لیکن در پردہ گھر کی چھوکری پر ڈورے ڈالتے جو دلچین کا ہاتھ بٹانے کے لیے ملازم رکھ لی گئی تھی۔

وحیدہ بیگم البتہ خوش وخرم تھیں۔ والدین کو خط پابندی سے لکھتی رہتیں۔ ان کی بیٹی رقیہ بھی اپنے گھر کی ہو کر بال بچے دار ہو گئی تھی اور لڑکا تعلیم سے فارغ ہو کر ملازمت کر رہا تھا۔ مہرو گاہے ماہے ماں کو خط بھیجتی لیکن اپنی پریشانیوں کا خود کبھی تذکرہ نہ کرتی۔ شادی کے بعد صرف دو بار ہی میکے آئی تھی۔ معراج شکی مزاج تھے اور اپنی بیوی کا دلی آنا جانا نہ چاہتے تھے۔

اور وقت منزل بہ منزل کوچ در کوچ آگے بڑھتا رہا اور زندگی جور و جفا سے بے پرواہ اور حادثات سے بیگانہ گزرتی رہی۔

۵

ماں کے مرنے کے بعد سے جہاں آرا کو اصغر خود سنبھالنے لگا تھا، اور رات کو بھی وہ اپنے ابّا کے پاس سوتی۔ نہلانا، دُھلانا، کھلانا پلانا سب کچھ اسی کے ذمے تھا اور بعض اوقات وہ بیٹھ کر اس کے پھٹے اُدھڑے کپڑوں میں کھونپ بھی بھر لیتا۔ البتہ جب وہ دفتر چلا جاتا تو بچی نانی کے پاس رہتی مگر شام کو واپس آتے ہی وہ بیٹی کو اپنے پاس بلا لیتا۔ کبھی زہرہ بھانجی کو پہنچانے آتی اور اصغر کو کام کرتا ہوا دیکھتی تو اس کو بہنوئی پر بہت ترس آتا اور اکثر وہ کہتی:

"یہ کیا ٹانک رہے ہیں۔ یہ کوئی مردوں کے کرنے کے کام تھوڑی ہیں۔ جس کا کام اسی کو ساجھے۔ لائیے مجھے دیجیے، میں سی دوں۔"

"رہنے دو زہرا میں خود کر لوں گا۔ میں تو بدقسمت ہوں بیکر مقدّر میں یہی لکھا تھا۔"

مگر وہ اصرار سے کہتی:

"بس چھوڑیے، ادھر دیجیے۔"

زہرہ جوان ہو کر بہت خوبصورت ہو گئی تھی اور اپنے حسن و جمال کے ساتھ اس کو جذبۂ نسائیت اور اپنی جنس کا پورا پورا احساس بھی تھا۔ وہ اکثر اصغر کو نگاہِ لطف و مہر سے دیکھتی اور اصغر کو بھی اس کی موجودگی خاص طور پر محسوس ہوتی اور دل پوشیدہ مسرتوں سے دھڑکنے لگتا۔

ایک شام کا ذکر ہے کہ زہرہ جہاں آرا کو باپ کے پاس چھوڑنے آئی تو اصغر دونوں ہاتھوں میں سر پکڑے ہوئے بیٹھا تھا اور بشرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ اس کو مغموم و ملول دیکھ کر نہ معلوم کیوں زہرہ کو بڑی تکلیف ہوئی اور اچانک اس کا قلب رحم سے تڑپنے لگا۔ وہ اس کے پہلو میں بیٹھ گئی اور بولی:

"آخر آپ ہمیشہ اس قدر رنجیدہ کیوں رہتے ہیں۔ آپ کو نہیں معلوم آپ کو اس طرح دیکھ کر مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ کسی سے اپنی بات کہہ کر جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ بھلا اندر ہی اندر اس طرح گھٹنے سے کوئی فائدہ ہے؟"

اصغر نے ایک سرد آہ بھر کر کہا:

"بھلا کس کو پڑی ہے جو میری آگ میں گرے گا۔ میں تو کسی ٹوٹے دل کی درد بھری صدا ہوں اور کسی بے قرار روح کی پکار۔ کون میرے رنج و غم سنے گا۔"

زہرہ نے اپنی ملائم اور نازک انگلیوں سے اصغر کے بالوں کو دھیرے دھیرے چھوتے ہوئے پیار سے کہا:

"بہر خدا ایسی باتیں تو منہ پر نہ لایئے۔ آپ کو نہیں معلوم میرا دل کٹا جاتا ہے۔"

اصغر بولا:

"میری چاہ کس کو ہے۔ کب کسی نے میری پرواہ کی ہے؟"

زہرہ کے دل میں عشق و محبت کا سمندر موجزن موج ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

اور اصغر کی مایوس باتیں سن کر جذبات کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ بے تاب ہو کر آہستہ سے بولی:

"کوئی ہو نہ ہو۔ میں تو ہوں......"

اصغر کا دل پہلو میں اُچھلا اور اس نے پلٹ کر زہرہ کو دیکھا۔ عشق و مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ اس کی متوالی آنکھوں میں جوشیلی محبت کا وہ خمار تھا جو مدّتوں کے انتظار کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ ایک ہی نگاہ میں اصغر کے درد و رنج ایک خواہش بن کر مچلنے لگے اور اس نے زہرہ کو اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔۔۔۔ رُوئیں رُوئیں میں بجلیاں دوڑنے لگیں۔ زہرہ کا دل اس نئے تجربہ سے گھبرایا مگر پھر لذت سے دھڑکنے لگا۔ مگر فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ شرم و حیا سے اپنے آپ کو اصغر کی گرفت سے چھڑا کر سٹپٹا کر بھاگ گئی، اور محبت کے پہلے پہلے راز کو اس نے اپنے سینے میں دل سے لگا کر اس طرح محفوظ کر لیا کہ کسی پر افشا نہ ہو سکے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

اس واقعہ کے بعد پھر وہ کئی دن تک اصغر کی طرف نہ آئی۔ لیکن اصغر کے رنج و غم کہیں بہار گئے تھے اور دل کو مسرتوں کے بہانے ہاتھ آ گئے تھے۔ حُسن خود پذیرائی کو بڑھا تھا اور محبت خود پیشوائی کو آئی تھی اور اصغر کی سپاٹ زندگی میں چپکے سے بہار آ گئی اور اس کے دل کی کلی کھل گئی اور اسے زہرہ کے دوبارہ آنے کا قیامت کا انتظار رہنے لگا۔ مگر وہ کسی طرح نہ آئی۔ اصغر سے صبر نہ ہو سکا تو وہ اپنی ساس کے گھر گیا، لیکن زہرہ کے دوپٹے کا آنچل تک نظر نہ آیا اور وہ مایوس واپس آ گیا۔ اس نے دوسرے روز جہاں آرا کو بھیجا کہ بُلا لائے مگر زہرہ نے بھانجی کو بھی اپنے پاس روک لیا۔ اصغر کا عشق شوق کی منزلوں سے اُڑ رہا تھا اور اس نے مجبور ہو کر زہرہ کو ایک

خط لکھا لیکن اس کا بھی اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

زہرہ اصغر سے ملنے میں جس قدر کتراتی تھی اتنی ہی اصغر کو اس کی لو لگی ہوئی تھی، اور اس خاموش پس و پیش سے اصغر کو الجھن ہونے لگی اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر کرے تو کیا کرے۔ بے سوچے سمجھے اور عقل و ہوش سے بے بہرہ ہو کر وہ زہرہ کے خیالوں میں اتنی دور نکل آیا تھا جیسے کوئی شکاری اپنے شکار کے پیچھے پیچھے گھنے جنگلوں میں پہونچ کر اپنا راستہ بھی بھول جاتا ہے۔ ادھر زہرہ کا بھی یہی حال تھا۔ مگر دوشیزگی کی ایک شرم و حیا تھی جو اس کی پیش قدمی میں مانع تھی۔ اصغر کے سامنے دوبارہ جاتے ہوئے اسے ہچکچاہٹ ہو رہی تھی کہ وہ کس طرح اس کے سامنے جاکر اس کی نظروں سے نظر ملائے۔

ایک دن شام کو اصغر ان ہی خیالوں میں انگنائی میں ٹہل رہا تھا اور اسی فکر میں تھا کہ زہرہ سے ملنے کی اب کیا صورت ہو۔ جہاں آرا گیند سے کھیل رہی تھی۔ شام کو ہی صحن دھلا تھا اور ایک کونے میں پانی کھڑا ہو گیا تھا۔ بچی کی گیند لڑھک کر پانی میں چلی گئی۔ جہاں آرا دوڑتی ہوئی گیند لینے جو گئی تو پاؤں پھسل گیا اور گر پڑی۔ اصغر نے جلدی سے جاکر اس کو اٹھا لیا اور چمکارنے لگا۔ اس کے گھٹنے چھل گئے تھے اور کپڑے کیچڑ میں لت پت ہو گئے تھے۔ وہ کپڑے بدلوانے میں چیخیں مار مار کر رونے اور زہرہ کو پکارنے لگی۔ اصغر نے اس کے کپڑے بدلنے کی بہتیری کوشش کی مگر وہ مچل مچل کر رونے لگی۔ کہ کپڑے خالا ہی سے بدلواؤں گی۔

بیگم شہباز نے جو بچی کے اس طرح تڑپ تڑپ کر رونے کی آواز سنی تو چنبیلی کو دیکھنے بھیجا کہ آخر جہاں آرا اس طرح کیوں رو رہی ہے۔

"میاں کیا ہوا؟ ننھی کیوں ضد کر رہی ہیں؟" چنبیلی نے جہاں آرا کو گود میں لینے کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

اصغر کو جہاں آرا پر غصہ آ رہا تھا اور وہ ماتھا پیٹ کر بولا :

"یہ تو مجھے دیوانہ کر کے چھوڑے گی ایک تو کیچڑ میں گر کے چوٹ لگالی اور اب کپڑے بھی نہیں بدلوائی۔ ایک ماں اپنی خالہ کی رٹ لگا رکھی ہے۔ نہ اس کی ماں مرتی نہ اس کا یہ حشر ہوتا۔"

چنبیلی نے بلقیس کو یاد کر کے ایک آہ بھری اور جہاں آرا کے پاس جا کر اسے بہلانے لگی۔ مگر جہاں آرا بھی ضد کی پوری تھی، چنبیلی کو ہاتھ تک نہ لگانے دیا۔ بلکہ دہاڑیں مار مار کر زہرہ کے لیے روتی رہی۔ چنبیلی بولی :

"اچھا چلو چندا میں تمہیں خالہ جان کے پاس لے چلوں۔"

اصغر نے جھنجھلا کر کہا :

"چھوڑ دو، چنبیلی، روتا رہنے دو۔ اس کو اب بن ماں کے رہنے کی عادت پڑنی چاہیے۔ غریب زہرہ آخر اس کا کب تک کرے گی، دوسرے کہاں تک جان ماریں گے۔"

جہاں آرا کی سسکیاں بھرنے پر چنبیلی کو واقعی ترس آ رہا تھا۔ اس نے اصغر سے کہا :

"میاں معصوم ہیں۔ وہ کوئی یہ باتیں تھوڑی سمجھتی ہیں۔ میں ابھی زہرہ بیوی کو بھیجتی ہوں۔"

بیگم شہباز نے پوچھا :

"ارے ننھی کیوں رو رہی ہیں ؟"

"زُہرہ بیوی کے لیے ضد کر رہی ہیں۔"

اور بیگم شہباز نے بیٹی سے کہا :

"ارے بی بچی ہلکان ہو رہی ہے۔ اسے جا کر چپ کرا آؤ۔"

زہرہ جہاں آرا کو بہت چاہتی تھی اور اپنی شرم ولحاظ بھول بھال اس کے پاس آگئی۔ روتے روتے جہاں آرا کی ہچکی بندھی ہوئی تھی۔ آنسوؤں سے گال میلے ہو رہے تھے اور اس کا گڑیا جیسا چہرہ مغموم تھا۔ زہرہ کو دیکھتے ہی وہ اس سے چمٹ گئی۔ زہرہ نے پیار کر کے اس کا منہ ہاتھ دھلا کر کپڑے بدلوائے اور کھلونے دیئے اور وہ کھیل میں لگ گئی۔

اصغر زہرہ کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت اس کا دل چاہتا تھا کہ زہرہ کو اپنی آغوش میں بھینچ لے۔ زہرہ اس کی طرف سے پیٹھ موڑے انجان بنی بیٹھی رہی۔ نا سمجھی میں زہرہ اصغر کو غمزدہ دیکھ کر بہک گئی اور اپنی سربستہ محبت کا اظہار کر دیا حالانکہ اب وہ اپنی لغزش پر نادم تھی۔ مگر احساسِ انفعال کے ساتھ اصغر کا ہر لمس محسوس ہوتا، اور لذتوں کا عنوان بن جاتا۔ اور جسم و جان، قلب و روح سرشار اور مخمور ہو جاتے اور وہ رازِ محبت کے بے پایاں کیف و سرور کو اپنے سینے سے اس طرح لگائے رکھتی کہ کہیں عیاں نہ ہو جائیں۔

جہاں آرا کے چپ ہو جانے کے بعد زہرہ کو اصغر کی قربت شدت سے محسوس ہو رہی تھی مگر فرطِ حیا نے اتنا نہ کہا کہ نگاہ بھر کر اصغر کو دیکھ لے۔ چنانچہ وہ جانے کے لیے اٹھی۔ اصغر نے اس کا راستہ روک کر کہا:

"آخر تم اس روز ایسے کیوں بھاگ گئی تھیں۔ اور پھر میرے بلانے پر بھی نہ آئیں۔"

زہرہ بولی: "مجھے جانے دیجیے۔"

"یہ تم نے خوب کہی۔ میرے دل میں محبت کے جادو جگا کر، میری زندگی کی شبِ تاریک کو روشن بنا کر اب دامن کشاں ہونا چاہتی ہو جب کہ میرا سازِ دل تمہارے نغموں سے گونج رہا ہے۔"

"میرا مطلب یہ نہیں تھا جو آپ سمجھے ہیں۔ ان باتوں کو اہمیت نہ دیجیے" زہرہ نے اسی طرح نگاہیں جھکائے ہوئے جواب دیا۔

"اہمیت کیسے نہ دوں" اصغر نے درد و گداز سے کہا "میری مسرتوں کی انتہا تم ہی ہو اور میرے دل میں روشنی تم سے ہے ....."

"مجھے جانے دیجیے۔ اماں راہ دیکھ رہی ہوں گی ....."

اور اس نے جانے کو قدم بڑھایا لیکن اصغر نے اسے دبوچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ زہرہ نے اپنے کو چھڑانے کی تھوڑی جد و جہد کی اور پھر آہستگی سے اپنے کو اصغر کے حوالے کر دیا .....

ٍ ٍ ٍ ٍ

اور اس آغاز کے بعد تو دونوں کے دل اقلیمِ عشق میں آ گئے۔ محبت کی پینگیں بڑھنے لگیں۔ چھپ چھپ کے ملاقاتیں ہوتیں اور عشق کے لطیف و شیریں سوز و ساز نے دونوں کو بے خود و وارفتہ بنا دیا۔ زہرہ تو شگفتہ کنول کی طرح حسین و گداز تھی اور انوارِ عشق کی تجلیوں نے اس کے حسن پر اور جلا کر دی اور اصغر کے دلِ غم دیدہ کی تشنہ کامی کو آرام آ گیا۔ وہی چاہ کی ریت تھی اور وہی پریم پریت کی مایا۔ ابھی بلقیس کی موت کو چھ مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ اصغر دوسری شادی کے خواب دیکھنے لگا۔ مرد کس قدر سنگ دل ہوتے ہیں۔

۶

تیس مارچ ۱۹۱۹ء کو اصغر کوئی پانچ بجے دفتر کا کام ختم کر کے اٹھا اور گھر جانے کے لیے سڑک پر آیا۔ سڑک یہاں سے وہاں تک سنسان پڑی تھی۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شہر میں کوئی بلا آگئی ہے جس کے ڈر سے سب چھپ گئے ہیں۔ جب وہ چاندنی چوک میں پہنچا تو وہاں گوروں کا پہرہ تھا اور ہندوستانی سپاہی گلی کوچوں میں گشت لگا رہے تھے۔ آج دوپہر کو ہندوستانی ہجوم پر انگریزی سرکار نے گولی چلائی تھی۔ اصغر کو دفتر میں بھی ہنگامے کے شور شرابے اور گولیوں کی کی آواز سنائی دی تھی۔

ہندوستان کی مصیبتوں کے دن آگئے تھے۔ جب سے ۱۷ء میں ہوم رول کی تحریک چلی تھی انگریزوں کے خلاف نفرت اور غصے کی آگ دلوں میں بھڑک رہی تھی۔ ۱۱ء میں لوگوں کو جو سرکارِ انگریزی سے خوش فہمیاں تھیں کہ ان کے راج میں ہندوستان کے دن پھر جائیں گے اور غربت دور ہو کر خوش حالی آجائے گی، خیالِ خام نکلیں اور رولٹ بل کے پاس ہوتے ہی رہی سہی امید دل پر پانی پھر گیا۔

اور ہندو مسلم نے ایک زبان ہو کر احتجاج کی آواز بلند کی اور جنم بھومی کی رکھشا کے لیے ہزاروں کی تعداد میں لوگ ایک ہو کر کھلم کھلا اپنی آزادی کے مطالبے کرنے لگے جلوس نکالتے، بھارت ماتا کی جے کے نعرے لگاتے۔ انقلاب زندہ باد کی پرجوش آوازیں حب الوطنی پر ابھارتیں۔ غلامی کی ہتھکڑیاں توڑنے والوں کے پاس ہتھیار کے نام ایک کیل اور ایک کانٹا بھی نہ تھا۔ وہ یکتا دیگانہ آن بان والی دلی جو ہمیشہ آزادی کی علمبردار رہی تھی اور جس نے منہ زور غنیموں کی ہمتیں توڑ دی تھیں اس دلی میں انگریزی فوج نے نہتی جانوں پر گولیوں کی بارش کر دی۔

دیواروں پر جابجا جلی حروف میں نعرے لکھے ہوئے تھے:

رولیٹ بل تو پاس ہوا

انگریزوں کی حلیہ تنگ ہوئی

اصغران کو سرسری طور پر دیکھتا ہوا اپنے راستے چلتا رہا۔ ان عبارتوں کو پڑھ کر وہ متاثر نہ ہوا۔ اس کی اپنی زندگی کے اتنے تفکرات اور جھمیلے تھے کہ سیاسی جھگڑوں میں پڑنے کے واسطے نہ وقت تھا نہ فرصت اور نہ اسے اس بات سے کوئی واسطہ کہ ملک تباہ ہو یا برباد، غلام رہے یا آزاد، دنیا باقی رہے یا کل کائنات ختم ہو جائے۔ اس کی بلا سے۔ تغیرات اور انقلابوں کے باوجود دنیا قائم تھی۔ سیاست میں وقت ضائع کر کے اسے کونسا نفع ہوگا اور اس کے نشیب و فراز کونسی اس کی قسمت جگا دیں گے یا بگڑی بنا دیں گے جن کو گلوں سے دامن بھرنے کی تمنا ہو وہ شوق سے اپنی انگلیاں لہو لہان کریں۔ اس کی اپنی چھوٹی سی محدود دنیا الگ تھی جس میں ان باتوں کی کوئی وقعت نہ تھی۔ وہ عشق کا بندہ تھا اور عشق ہی اس کے نزدیک وہ حقیقت تھی جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی، اور شیوۂ عشق ہر دکھ کا درماں اور ہر زہر کا تریاق ہے۔ عشق کی بقا سے زمین و آسمان

متحرک ہیں اور قلبِ انسانی تازہ و پائندہ رہتا ہے۔ انسان پیدا ہوتے ہیں جیتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ پیدائشِ آدم سے لے کر آج تک نہ معلوم کتنے پدم انسان دنیا میں آئے اور ان کی پشتہا پشت ختم ہو گئیں۔ ان ہی سلسلوں میں صدیاں بیت گئیں اور سینکڑوں قرن اسی طرح گزر جائیں گے۔ لیکن عشق حیاتِ جاوداں لے کر آیا ہے جس کو کبھی موت نہ آئے گی۔ عشق آتا ہے اور جب دل کو چھیڑتا ہے تو حضوری نصیب ہوتی ہے اور آرزوئے حسن بیدار ہو کر ہر چیز نگار خانۂ حُسن بن جاتی ہے۔ جو عشق کی پرستش نہیں کر سکتا۔ وہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں۔

اصغر پھر مبتلائے عشق تھا اور وہ اپنی دلنواز محبوبہ کو پرچانے کی لگن میں لگا رہتا ـــــ وہ ان ہی خیالوں میں منہمک جا رہا تھا کہ اپنی ماں سے زہرہ کے بارے میں گفتگو کرے کہ چند آوارہ لونڈوں نے اسے انگریزی کپڑے پہنے دیکھ کر اس کے مُنہ کے قریب مُنہ لاکر زور سے کہا:

"بول گئی مائی لارڈ ککڑوں کوں"

اصغر خفیف ہو کر دوسری گلی میں مُڑ گیا۔

گلی حسبِ معمول پُر سکون تھی اور کسی قسم کی شورش کا اثر معلوم نہ ہوتا تھا۔ ایک پھول والا اپنی کھال میں مست ایک تازہ بہ تازہ غزل بڑے لٹکے سے گا رہا تھا، جیسے دُنیا میں کچھ ہوا ہی نہیں اور وہ ہر چیز سے بے تعلق تھا:

اب لڑکپن چھوڑ دے عہدِ شباب آنے کو ہے
ان حبابوں کی کٹوری میں گلاب آنے کو ہے
اس پتے سے پوچھیو قاصد مرے دل دار کو
چشم نرگس، چال متوالی، شباب آنے کو ہے

غزل سُن کر اصغر کے دل میں ایک چنچل موج اٹھی اور زہرہ کے ثبت کیے ہوئے

بوسوں کی یاد سے اس کے ہونٹ جلنے لگے اور اس کے جذبات اور گداز جسم کی گرمی اس کی رگ و پے میں دوڑنے لگی، اور وہ زُہرہ سے ملنے کے لیے اپنے گھر کی طرف مڑا لیکن پھر خیالات نے پلٹا کھایا اور اس نے یہی مناسب سمجھا کہ پہلے اپنی ماں سے جاکر شادی کے متعلق بات چیت کرے۔ ذہن میں انتشار تھا اور خیالات ڈانواڈول اور وہ پھرتی سے چلنے لگا۔

جب وہ کوچہ پنڈت میں داخل ہوا تو اس کی نظر سب سے پہلے مرزا دودھ والے پر پڑی جو دحشت زدہ اور ہوتق دکھائی دیتا تھا اور بال بکھرے ہوئے دیوانوں کی طرح جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اور غم تھا۔ مرزا کی بیوی جو کبھی کبھی اپنے میاں کا ہاتھ بٹانے کو دوکان میں بیٹھ جایا کرتی تھی اس وقت دہاڑیں مار مار کر بین کر رہی تھی :

" خدا غارت کرے اِن فرنگیوں کو۔ ہائے میری کوکھ اُجاڑ دی۔ اِن کافروں نے میرا بچہ مجھ سے چھڑا دیا ـــــ اِن پیارے بیٹوں کا ستیاناس ہو...... "

اصغر حال معلوم کرنے کو صدّیق بنیے کی دوکان پر رُکا۔ کئی گاہک دوکان پر کھڑے ہوئے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا :

" میں نے کیا بادشا ذری جلدی کرنا ورنہ گھروالی ٹانٹ کے بال اُتار لے گی "

دیوار میں کابک کی طرح ہنڈیاں جڑی ہوئی تھیں۔ صدیق نے ڈوئی ہنڈیا میں ڈال کر دال نکالی اور گاہک کے کپڑے میں ڈال دی۔ اصغر نے صدیق سے پوچھا :

" بھئی صدیق! مرزا کو کیا ہوا ؟ "

"ہوا کیا؟" صدیق بولا: "اس کا بیٹا جاتا رہا۔ بھلا چنگا کڑیل جوان تھا۔ سویرے ہی کرڑھائی مانجھ دھو رہا تھا۔ پھر وہ ترکِ موالات کرنے چل دیا۔ ٹھائیں سے گولی سینے کے پار ہو گئی۔ اور جو میاں سچ پوچھو تو جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ سرکار کے برخلاف جانے کی یہی سزا ہے ....."

اصغر کو یہ سُن کر رنج ہوا اور وہ مرزا اور اس کی بیوی پر افسوس کرنے لگا۔ پلٹ کر اُس نے مرزا کو دیکھا جو ایک پتلی گلی کی طرف جا رہا تھا۔ اچانک صدمے سے وہ اپنے آپے میں نہ رہا تھا۔ اسی وقت ہوا کا ایک تند جھونکا آیا اور خاک کا ہبولا چکر کھا کر اٹھا اور کاغذ کے پُرزے اس کی تیزی میں بڑھتے ہوئے اوپر گئے اور جیسے ہی ہوا کا زور ختم ہوا ایک ایک کر کے لاچاری سے زمین پر گرنے لگے۔ مرزا گلی میں مڑ گیا اور اصغر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

۷

جب اصغر گھر پہونچا تو معلوم ہوا حبیب الدین آئے ہوئے ہیں۔ عرصہ سے ان کی صحت کچھ گرتی جا رہی تھی۔ تھوڑا سا کام کرنے سے تھکن ہو جاتی۔ چنانچہ انھوں نے رخصت لے لی اور علاج کی غرض سے دلی آگئے۔ اصغر نے انھیں دیکھا تو بولا:

"ارے آکا بھائی! آپ کب تشریف لائے؟ کسی کو اطلاع بھی نہیں دی۔"

"بھئی میں نے سوچا جب خود ہی آرہا ہوں تو اطلاع کیا دوں — خیر تم سناؤ، شہر کی کیا خبریں ہیں؟"

اصغر نے جواب دیا:

"چاندنی چوک خالی پڑا ہے۔ اور سڑکوں پر بھی ہُو حق کا عالم ہے۔ چوہے کا بچہ تک نہیں دکھائی دیتا۔ اور ابھی جب میں کوچہ پنڈت میں پہنچا ہوں تو معلوم ہوا مرزا دودھ والے کا بیٹا بھی گولی کھا کر شہید ہو گیا۔"

"ارے یہ تو بہت برا ہوا۔ وہی نا جو اُس کی دوکان پر بیٹھتا تھا۔ وہ تو بالکل جوان اور اچھی شکل کا تھا۔"

"جی ہاں وہی۔ وہ بھی جلوس میں شریک تھا اور کام آگیا۔"

"سچ سچ۔ بڑی افسوس ناک موت ہے۔ میاں انگریز کو تو سارا خطرہ مسلمانوں سے ہے۔ اور ان ہی کو مٹانے کے درپے ہیں۔ اور اب تو صاف صاف کہتے ہیں کہ اگر ہم ہندوستان میں مسلمانوں کو کچلنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر اطمینان سے حکومت کریں گے۔"

میر نہال قریب ہی پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ آنکھیں بند تھیں مگر کان بیٹوں کی باتوں پر لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے خبر سنی اور کسی قسم کی رائے زنی نہ کی۔ مگر اُنکے جھرّیوں بھرے چہرے سے خوشی ظاہر ہو رہی تھی اور ان کے پوپلے منہ پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ اسی اثنا میں میر نہال کے پاس کچھ ملنے جلنے والے آگئے اور وہ سب ماضی کو یاد کر کے پرانی باتیں کرتے رہے۔

نسیم اب بارہ برس کا تھا اور حبیب الدین اسے بھی اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ اس کی بچپن کی شوخیوں اور چلبلاہٹ نے سنجیدگی اختیار کر لی تھی اور وہ بہت سمجھدار ہو گیا تھا۔ ناک نقشہ دادا پر گیا تھا اور اسے دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ جوانی میں وہ میر نہال کی طرح وجیہہ اور خوبصورت نکلے گا۔ وہ اس وقت بہت بُردبار بنا ہوا بیٹھا تھا۔ ادب سے بڑوں کی باتیں سُن رہا تھا۔ حالانکہ ابھی یہ باتیں اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں اور اسے ان میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ کوئی لطف آرہا تھا۔ لیکن جب حبیب الدین گفتگو شروع کرتے تو وہ بڑے غور سے ان کی باتیں سنتا۔ اسے اپنے باپ کا اندازِ تقریر بہت پسند تھا اور اُن کی پروقار بھاری آواز انتہائی مرعوب کُن معلوم ہوتی تھی، اور دورانِ گفتگو میں وہ یہ سوچ سوچ کر متحیر ہوتا کہ اتنی دلکشی سے بولنے کا راز کیا ہے باتوں کے سلسلے بند نہ ہوتے اور ان کے لچھے کے لچھے اس طرح نکلتے چلے آتے جیسے کپّی میں سے سر رسر رتاگا نکلتا رہتا ہے، اور وہ دنگ

بیٹھا رہتا۔ کیوں کہ وہ اکلوتا بیٹا تھا اور حبیب الدین اس کو بہت چاہتے تھے، وہ ناز و نعم میں پل رہا تھا۔ باہر بھی حبیب الدین کے ماتحت اپنے افسر کا بیٹا ہونے کی وجہ سے اس کی عزت کرتے اور ہمیشہ ادب سے پیش آتے۔ اتنی کم عمری میں وہ اپنے کو لیے دیئے رہنے لگا۔ ابھی سے وہ خوددار اور غیور تھا اور اس میں خاص احساس برتری آ گیا تھا۔ میرہال کے کسی دوست نے پوچھا:

"صاحبزادے کون سے درجے میں پڑھتے ہو؟"

"جناب میں چھٹی جماعت میں ہوں"

دوسرے لوگ بھی اس سے اور باتیں پوچھنے لگے اور نسیم نے سب کا جواب تسلی بخش اور بڑی معقولیت سے دیا۔ لوگوں کی توجہ بیٹے پر دیکھ کر حبیب الدین دل میں نازاں ہو رہے تھے اور نسیم کی سنجیدگی اور شائستگی پر مسکرا رہے تھے۔ پھر انھوں نے نسیم سے کہا:

"بیٹے ذرا دادا آبا کو بھی وہ ہماری پسند کی نظم سنا دو۔"

نسیم پہلے تو ذرا شرمایا پھر بے دھڑک وہ نظم سنائی جو جنگ بلقان کی فتح کے فوراً بعد لکھی گئی تھی۔ چونکہ اس نظم سے مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی ہوتی تھی وہ اب پھر مقبول ہو گئی تھی:

سرفروشی کی تمنا پھر ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

وقت آنے دے بتا دیں گے تجھے اے آسماں
ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے

رہ روِ راہِ محبت تھک نہ جانا راہ میں
لذتِ صحرا نوردی دوریٔ منزل میں ہے

سب سننے والوں نے دل کھول کر تعریف کی اور حبیب الدین سے کہنے لگے :

"ماشاء اللہ بڑے ہونہار صاحب زادے ہیں۔"

دراصل پڑھنے کے طرز سے زیادہ نظم کے جوش و کیفیت سے لوگ زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ حبیب الدین کو بیٹے پر فخر تھا۔ میر نہال نے پوتے کو دیکھا اور ان کو یہی معلوم ہوا کہ وہ ہو بہو ان کی تصویر ہے اور ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملانے لگے۔ اصغر نے نسیم کی پیٹھ ٹھونک کر شاباشی دی اور جیب سے ایک روپیہ نکال کر اُسے دینے لگا۔ نسیم نے باپ کی طرف دیکھا۔ حبیب الدین بولے :

"جب تمہارے چچا دے رہے ہیں تو لے لو۔"

اور نسیم نے روپیہ لے لیا۔

اتنے میں سعید حسن آ گئے۔ حبیب الدین کے یہ پُرانے دوست تھے اور دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ حبیب الدین ان کو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور دونوں گلے ملے اور پھر حبیب الدین بولے :

"بھئی فرزندِ ارجمند مبارک ہوں۔"

سعید حسن کی شادی ثریّا سے ہو گئی تھی اور وہ بہت خوش تھے۔ اور سعید حسن بیٹھتے ہوئے بولے :

"مجھے تو خیال بھی نہ تھا کہ تم یہاں ہو گے۔ کب آئے ؟"

"آج ہی صبح سات بجے کی گاڑی سے پہنچا ہوں۔"

اِدھر اُدھر کے قصّوں کے بعد موجودہ سیاست اور حالاتِ حاضرہ پر باتیں ہونے لگیں۔ سعید حسن کو وطن اور تحریکِ آزادی میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی زندگی جس ڈھرے پر پڑ جاتی وہ اسی کے عادی ہو جاتے۔ طبیعت کی کاہلی انھیں اس بات پر مائل نہ ہونے دیتی کہ وہ ذرا سا بھی عقل و شعور پر زور ڈال کر

غور و فکر کریں اور بدلے ہوئے حالات سے باز پرس کریں۔ جب تک وہ خود حالات کی زد میں نہ آ جائیں یا واقعات و حادثات ان کی ذاتیات میں بلاواسطہ دخل اندازی نہ کریں کچھ نہ کہتے تھے۔ سیاست کے جوڑ توڑ تو ان کی سمجھ سے قطعاً باہر تھے۔ انھیں حکومتِ برطانیہ سے تو کوئی پرخاش نہ تھی، وہ ان کا بگاڑتی ہی کیا تھی، البتہ تہذیبِ نو کو بُرا سمجھتے تھے کیونکہ اس کا اثر ان کی اپنی زندگی کی نشست و برخاست پر براہِ راست پڑتا تھا۔ جہاں انھیں ولایتی رہن سہن سے بدظنی تھی وہیں انگریزی حکومت سے انھیں کوئی شکوہ و شکایت نہ تھی۔ جب تک ان کی اپنی زندگی بے شور و شر آرام سے گزرتی رہتی، آمنّا و صدقنا۔ جیسا کہ ہندوستان کے بے شمار باشندوں کا عالم تھا جو ہر چیز کو قسمت اور تقدیر پر مبنی سمجھ کر راضی بہ رضا رہتے اور بڑے صبر و شکر کے ساتھ زندگی کا جوا کھینچتے رہتے۔

جب حبیب الدین نے کہا:

"اب وقت و حالات کا تقاضا ہے کہ سب مل کر آزادی کے لیے قدم بڑھائیں۔ کیوں سعید حسن تمہاری کیا رائے ہے؟"

تو اس پر سعید حسن نے جواب دیا:

"یار پرے ہٹاؤ۔ خدا کی دین ہے، وہ دیتا بھی ہے لیتا بھی ہے۔ وہ جانے اس کے کام۔"

اور جب ان کی زبان کا تانتا ایک دفعہ ٹوٹ جائے تو پھر ان کو روکنا مشکل ہوتا۔ اور اپنے کہے پر زور دینے کے لیے حسبِ عادت ایک قصہ سنانے لگے:

"کبھی وہ کہانی نہیں سُنی؟ ایک نائی تھا جو بادشاہ سلامت کی حجامت بنانے پر مامور تھا۔ اس کے پاس دو اشرفیاں تھیں اور وہ انھیں ہمیشہ اپنی بساط میں رکھتا تھا

اور صبح اور شام انھیں نکال کر دیکھتا اور خوش ہوتا۔ ایک روز بادشاہ نے اس سے پوچھا، "کہو ہماری رعایا کس حال میں ہے؟" نائی نے دست بستہ ہو کر عرض کی: "جہاں پناہ! حضور کو دعائیں دیتی ہے اور آپ کی سخاوت کے گُن گاتی ہے۔ غریب سے غریب کے پاس بھی دو اشرفیاں ضرور ہیں۔" یہ سُن کر بادشاہ نے وزیر کو اشارہ کیا اور اس نے نو ہری لینے کے بہلانے نائی کی بساط کھولی تو کیا دیکھا کہ دو اشرفیاں رکھی ہوئی ہیں۔ وزیر نے چپکے سے وہ نکال لیں۔ جب شام کو نائی گھر پہونچا اور بساط کھولی تو دیکھا کہ اشرفیاں غائب۔ میاں اس کے تو ہاتھوں کے توتے اُڑ گئے اور اشرفیوں کے غم میں یہ نوبت پہنچی کہ وہ بیمار پڑ گیا۔ جب کئی روز وہ محل میں حاضر نہ ہوا تو بادشاہ نے ہرکارے کو بھیج کر طلب کیا۔ اور جب نائی حاضر ہوا تو بادشاہ نے پھر پوچھا: "کہو اب ہماری رعایا کا کیا حال ہے؟" نائی نے روہانسو ہو کر جواب دیا: "حضور جان کی اماں پاؤں تو عرض کروں، کہ تمام رعایا بے حال ہے۔ امیر سے امیر تک کے پاس بھی دو اشرفیاں تک نہیں۔" بادشاہ نے یہ سُن کر تبسم فرمایا اور وزیر کو اشارہ کیا اور اس نے نائی کی بساط کھولی اور اشرفیاں واپس رکھ کر بولا: "مگر تمہارے پاس تو دو اشرفیاں ہیں۔" نائی خوشی کے مارے اچھل پڑا اور جلدی سے بولا، "سب حضور کو دعائیں دیتے ہیں۔" اور سعید حسن آخر میں کہنے لگے:

"آپ موئے جہان موا، آپ بھلے جہان بھلا۔ بھیا آزادی وازادی کے مخمنوں میں پھنسنے سے کیا فائدہ؟ جو کرتا ہے خدا کرتا ہے۔ ہم اس کے معاملوں بولنے والے کون؟....."

۸

حبیب الدین کچھ دن ٹھہر کر واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے کئی دن بعد اصغر کو اپنی ماں سے بات کرنے کا موقع ملا۔ بیگم نہال دالان میں بیٹھی ہوئی الجھے ہوئے تاگوں کو سلجھا رہی تھیں۔ تاگوں کی جو گرہیں نہ کھل سکتیں ان کو وہاں سے توڑ کر دوسرے سرے میں جوڑ دیتیں۔ عمر کے ساتھ ان کے قویٰ بھی ناطاقت ہوتے جا رہے تھے اور کمر جھک گئی تھی۔ بیگم نہال نے پوچھا:

"ننھی کو لے کر نہیں آئے؟ ماشاء اللہ مینا کی طرح چہکتی ہے اس کے لیے میرا جی ترپتا ہے۔"

"اماں دفتر سے سیدھا یہیں چلا آ رہا ہوں۔ میری زندگی تو جنجال ہو گئی۔ اِدھر جہاں آرا کی دیکھ بھال کروں اُدھر گھرداری سنبھالوں یا کماؤں؟"

بیگم نہال نے بڑی ممتا سے کہا:

"ارے ننھے کیا میں نہیں جانتی؟ خدا گواہ ہے جب تیرا خیال آتا ہے تو میری راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔"

اصغر نے ایک لمبی آہ بھری اور باہر دیکھنے لگا۔ انگنائی میں کہیں کاغذوں کی ردّی، کہیں صراحیوں کے ٹوٹے ٹھیکرے اور کہیں ترکاریوں کے چھلکے اور الابلا اِدھر اُدھر پڑی ہوئی تھی اور پورے گھر کا نظام تل پٹ نظر آتا تھا۔ حلال خوری نخرے چونٹے ہو گئی تھی اور مہینہ میں کئی کئی ناغاں کر دیتی اور آتی تو بس چلت پھرت کا کام کیا اور یہ جا وہ جا۔ صحن میں جھاڑو دینا اس کی جان پہ آتا تھا۔ نظر چوکی اور حمیت ہوئی۔ دلجین کا بوڑھے ہو کر حافظہ کمزور ہو گیا تھا ہر چیز کو رکھ کر کھول جاتی تھی۔ مہندی کے درخت کے پاس نل لگوا دیا گیا تھا اور وہ لوٹا بھرتی تو نل کھلا چھوڑ دیتی۔ گھنٹوں ٹُلل ٹُلل پانی کی دھار بہتی رہتی اور سارے آنگن میں کیچڑ پانی رہتا۔ اس وقت بھی وہ نل کھُلا چھوڑ گئی تھی۔ نئی چھوکری جو اس خیال سے رکھی تھی کہ گھر سنگوا ئے گی تو اس کو اپنی مانگ پٹی ہی سے فرصت نہ ملتی تھی۔ وہ گھر جو مُنہ سے بولتا تھا، جس کی ہر چیز جمی جمائی تھی، کچھ ایسا بدلا کہ زندگی کا شیرازہ ہی بکھر کر رہ گیا۔

اصغر ماں سے بولا:

"اماں مجھے اپنی تو کوئی فکر نہیں بس جہاں آرا کا رہ رہ کر خیال آتا ہے۔ بے ماں کی ہو کر اس کی زندگی ویران ہو گئی۔ اب کوئی ایسا نہیں جو غریب کو وقت پہ کھلا دے پلا دے۔ چاہتا تو نہیں تھا مگر بچی کے آرام کی خاطر سوچتا ہوں دوسری شادی کر لوں۔ ہو گی تو سوتیلی ماں مگر کوئی تو نگرانی کرنے والا چاہیے۔ آج چھوٹی ہے کل کو جوان ہو جائے گی۔ میں کہاں تک پاؤں میں مہندی لگا کر بیٹھا رہوں گا۔"

بیگم نہال کہنے لگیں:

"ہاں میرے لال، گھر کی شوبھا عورت کے دم سے ہوتی ہے۔ تم مرد ذات لاکھ کرو وہ بات نہیں آسکتی۔ اور آج تو تم نے خود میرے دل کی کہہ دی۔ میں تو اب تک یوں نہ بولی تھی کہ کہیں تم برا نہ مان جاؤ۔ اللہ تمہارا گھر پھر سے بسا دے۔" پھر وہ

کسی سوچ میں چپ ہو گئیں۔ غالباً خاندان بھر کی لڑکیوں کو اصغر کی دلہن بنانے کی نظر سے اپنے ذہن میں دیکھ رہی تھیں۔ پھر کہنے لگیں :

"کوئی لڑکی ہے تمہاری نظر میں ؟"

اصغر بولا :

"نہیں میری نگاہ میں تو کوئی خاص نہیں۔ لیکن جہاں آرا کی وجہ سے چاہتا ہوں کوئی ایسی لڑکی ہو جس سے بچی بھی مانوس ہو اور وہ بھی ماں بن کے اس کا کچھ خیال اور محبت کرے !"

"ہاں یہ تو تم نے سمجھداری کی بات کہی ؟" بیگم نہال نے اس بارے میں اپنی رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ساری اونچ نیچ سوچ کر میں سمجھتا ہوں کہ زہرہ سے زیادہ کوئی اور لڑکی مناسب نہ رہے گی۔ وہ خالہ بھی ہے اور جہاں آرا کو بچپن سے پالا بھی ہے بلقیس کے مرنے کے بعد سے تو وہ بھانجی پر جان چھڑکتی ہے اور وہ بھی اسی سے بہت ہلی ہوئی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ زہرہ کی عمر ابھی کم ہے ۔۔۔۔"

"نہیں بیٹا ! وہ نہیں سنا مرد ساٹھا اور پاٹھا، عورت بیسی اور کھیسی۔ میں نے تیرھواں بھی پورا نہ کیا تھا کہ بیاہ دیا۔ اور زہرا اب ایسی چھوٹی بھی نہیں۔ ہاڑھ اچھا ہے۔"

"تو پھر آپ کی اجازت ہے ؟" اس کی آنکھیں اچانک خوشی سے چمکنے لگیں۔

"بھلا تمہارے چین اور خوشی سے بڑھ کر مجھے اور کیا چیز عزیز ہو گی۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔"

ابھی بیگم نہال نے جملہ ختم ہی کیا تھا کہ پیچھے سے بلّی کی باریک میاؤں سنائی دی اور ساتھ ہی خالہ کبڑی : "کٹو، اری کٹو میرے لیے تو ذرا ٹھہر۔" کہتی ہوئی بلّی کے پیچھے پیچھے آ گئیں۔ ان سے دور دراز کی رشتہ داری تھی۔ کئی مہینے سے میر نہال کے

ہاں آئی ہوئی تھیں۔ ان کے آل اولاد تو تھی نہیں چھڑا دم تھا، شادی کے بعد ایک بچہ ہوا تھا اور اس بچے کی دفعہ ہوا لگ گئی یا نہ معلوم کیا بگاڑ پڑ گیا تھا کہ کبڑی ہو گئیں۔ ان کو میاں نے جب ہی چھوڑ دیا تھا۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا، کبھی ایک عزیز کے ہاں چار مہینے نکال لیے، کبھی دوسرے کے ہاں جا کر پڑ رہیں۔ اسی طرح ساری عمر تیر ہو گئی۔ ان کی آنکھیں سبزی مائل کرنجی تھیں اور ان میں عقاب کی سی تیزی تھی، اور آواز اتنی باریک تھی کہ کانوں کے آر پار ہو جاتی۔ جب کچھ نہ ہوگا تو یقیناً کلنگ کی کلنگ رہی ہوں گی۔ کیونکہ کمر دوہری ہو کے بھی ٹانگیں سارس کی طرح لمبی لمبی تھیں اور ہاتھ پیر بھی مردانہ تھے۔ چلنے میں دونوں ہاتھ آگے پیچھے ہلتے اور گردن کچھوے کی طرح آگے کو نکل آتی۔ جب وہ چلتیں تو یہی معلوم ہوتا کہ کچھوا چل رہا ہے۔ انھیں بلیاں پالنے کا بہت شوق تھا۔ بلیوں سے ان کا رشتہ کچھ ایسا جڑا تھا کہ بغیر بلیوں کے خالہ کبڑی کا تصور عجیب سا لگتا تھا۔ وہ بلیوں کے سدھانے میں بھی ماہر تھیں۔ ایک بلی تو ان کی جان کے ساتھ ہر دم لگی رہتی۔ جہاں خالہ کبڑی جاتیں وہ بھی کتے کی طرح ساتھ ساتھ رہتی۔ وہ اپنی بلی کو بیٹی کی طرح چاہتی تھیں، اسی طرح بلی کو پیار کرتیں اور ویسے ہی اس کے لاڈ ہوتے۔ صحنچی کے ایک کونے میں بلی کو گود میں دبکا کے بیٹھ جاتیں اور گھنٹوں کتوں سے دنیا جہان کی باتیں ہوا کرتیں۔

کبھی انھوں نے اچھے دن بھی دیکھے تھے، جمع جکڑا پاس تھا اور جب ضرورت پڑتی اپنا صندوقچہ کھول کر ایک اشرفی نکالتیں اور دلچین یا مسرور کو دے کر تڑوا لیتیں۔ اگر کبھی انھوں نے انکار کر دیا تو خالہ کبڑی اپنی بلی سے مخاطب ہو کر ان کا گلا اس طرح کرتیں جیسے وہ بھی انسان ہے اور ان کی باتیں سمجھتی ہے۔ لیکن تعجب کی بات یہ تھی کہ بلی میاؤں ہمیشہ برمحل کرتی۔ جب وہ ان کی ہم خیال ہوتی تو ہلکی سی

میاؤں کر کے ان کی بات پر صاد کرتی اور جب وہ ان کی بات سے متفق نہ ہوتی تو زور دار میاؤں کر کے اختلاف کا اظہار کرتی۔

خالہ کبڑی نے الف سے یے تک اصغر کی ساری روداد سن لی تھی اور بلّی سے کہنے لگیں:

"دیکھا کتّو دنیا کتنی مطلبی ہے۔ کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ آج مرے اور کل دوسرا دن، ہیں ناکتّو؟" اور بلّی نے چھوٹی سی میاؤں کی اور ہاں میں ہاں ملائی۔ ان کی آواز پر اصغر نے پلٹ کر دیکھا۔ خالہ کبڑی چبوترے پر کھڑی بلّی سے باتیں کر رہی تھیں۔ اس کو یہ سان گمان بھی نہ تھا کہ کوئی دوسرا اس کی باتیں سن رہا ہوگا۔

اور خالہ کبڑی نے جمال بیگم کے پاس جا کر یہ شگوفہ چھوڑا:

"اے بہن تم نے کچھ اور بھی سنا؟ وہ اصغر زہرہ سے شادی کرنیوالے ہیں"۔

جمال بیگم نے پیشانی کوٹ کر کہا:

"ہے ہے خالہ کبڑی جو کچھ کہہ رہی ہو معلوم بھی ہے؟"

"بڑھاپا ضرور ہے پر یہ کان خدا نہ کرے ایسے بیٹ بھی نہیں ہوئے، خدا پاک کی قسم میں کوئی جھوٹ طوفان تھوڑی اٹھا رہی ہوں۔ بھلا مجھے کو نسا ثواب ملے گا۔ کل ہی میں نے اصغر کو بڑی آپا سے ذکر کرتے سنا تھا۔ اور اسی وقت میں نے کتّو سے کہا تھا دنیا کسی کی ہیست نہیں۔ میری کتّو سے پوچھ لو"۔ اور انھوں نے بلّی سے کہا: "میں سچ کہہ رہی ہوں ناکتّو؟" اور بلّی نے فوراً برجستہ میاؤں کر کے ان کے کہے کی گواہی دی۔

جمال بیگم نے دونوں کان پکڑ کر اپنے کلّوں پر طمانچے مارے اور زور زور سے توبہ کی: "لو غضب خدا کا۔ اے بی دنیا کے خون سفید ہو گئے۔ اللہ مغفرت کرے اس مرنے والی کو۔ ابھی تو اس کا کفن بھی میلا نہ ہوا ہوگا کہ خصم کو اپنا بیاہ کرم

کرنے کی پڑ گئی۔ اس بیچاری کی روح کیا کہے گی"۔ اور وہ زور زور سے توبہ تلّا کرنے لگیں خالہ گبڑی بولیں:

"تمہیں اللہ جیتا رکھے۔ بہت حق بات کہی ہے۔ بوا مرد کی ذات تو ہوتی ہی بے وفا....."

دوسرے روز جمال بیگم ڈولی چڑھ کے بیگم شہباز کے پاس ٹوہ لینے گئیں کہ ان کی کیا نیت ہے آخر۔ اور پوچھنے لگیں:

"اے خیر سے زہرہ سیانی ہوگئی ہے کوئی پیام سلام بھی آئے"

"ہاں بہن! جس گھر میں بیری ہو پتھر آتے ہی ہیں"

اس پر جمال بیگم بولیں:

"مگر میں نے تو سنا ہے تمہارا خیال اصغر سے ہے"

بیگم شہباز کے جیسے بچھو نے ڈنک لیا۔ وہ ایکدم تڑاتڑ کر بولیں:

"اے بوا اللہ اللہ کرو۔ یہ تم سے کس نے کہہ دیا۔ منہ دھو رکھیں، اند... سے بیاہ دوں مگر چاہے دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے پر اپنی بیٹی اس کو ہرگز نہ دوں پہلی کو دے کر دیکھ لیا۔ کلیجے پر داغ کھائے بیٹھی ہوں۔ بلقیس نے کونسا سکھ پایا تھا جو دوسری کو بھی اسی جہنم میں جھونک دوں۔ تو تا چشم کہیں کا۔ میں اصغر کو ایسا نہیں سمجھتی تھی کہ اتنی جلدی بلقیس کو بھول جائے گا اور زہرہ کی آس لگا بیٹھے گا..."

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اصغر نے میر نہال کے پاس جا کر اپنے ارادے کا ذکر کیا اور ان کی اجازت چاہی۔ میر نہال نے سنا اور خوش ہو کر بولے:

"میری طرف سے اجازت ہے ضرور کرو۔ خدا تمہیں کامیابی دے۔ تم ماشاءاللہ جوان ہو بھلا اس طرح یکہ و تنہا کیسے گزارا ہو گا۔ اور کب تک یوں زندگی کٹے

سکتی ہے۔ بغیر بیوی کے گھر سرائے معلوم ہوتا ہے۔ یہ نیک خیال ہے اور عقلمندی اسی میں ہے اور زہرہ بہت مناسب ہے۔ بچّی کی خالہ ہے جو درد اس کو ہوگا وہ کسی دوسری عورت کو نہیں ہو سکتا"

میاں کی رضامندی دیکھ کر نابینا بیگم نہال تیسرے ہی دن سمدھن کے پاس گئیں اور زہرہ کو اصغر کے واسطے مانگا۔ بیگم شہباز دنیا کو برتنا جانتی تھیں۔ اپنی تلخیوں کو چھپاتے ہوئے بڑی خوش خلقی سے جواب دیا:

"اے بہن، ابھی تو بلقیس کے غم کا گھاؤ ہی تازہ ہے مجھے زہرہ کی شادی بیاہ کا دھیان بھی نہیں آتا۔ اب تم نے کہا ہے تو اشفاق کو لکھوں گی۔ جب وہ جواب دیں گے تو سوچوں گی ....."

جب اصغر کو ساس کا جواب معلوم ہوا کہ اشفاق سے پوچھ کر ہاں یا ناکریں گی تو اصغر کو یہ خدشہ دامن گیر ہوا کہ اشفاق ضرور بھانجی ماریں گے۔ چوں کہ بلقیس کی وجہ سے ہم زلفوں میں شکر رنجی ہو چکی تھی۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

جمال بیگم کے کہنے اور بیگم نہال کے براہِ راست پیام دینے کے بعد بیگم شہباز نے زہرہ کو اصغر کے سامنے آنے جانے کو قطعی منع کر دیا۔ بہ ظاہر زہرہ نے بہنوئی سے پردہ کر لیا مگر گھر ملے ہوئے تھے اور دل کی لگی بُری ہوتی ہے۔ وہ چوری چھپے برابر اس سے ملتی رہی اور جمال بیگم کی سب باتیں جو ماں سے ہوئی تھیں اصغر سے کہہ دیں۔ اصغر نے زہرہ سے تو کچھ نہ کہا مگر یہ سن کر اس کے تن بدن میں پتنگے لگ گئے اور وہ جلا بھنا تائی اماں کی شکایت باپ سے کرتے ابا کے پاس آیا۔ اس وقت اندھے حافظ جی ڈیوڑھی میں کھڑے ہوئے ڈنڈے بجا بجا کر "پلاؤ کو کھیے گا، پلاؤ کو کھیے گا" کی رٹ لگا رہے تھے۔

یہ پیدایشی نابینا تھے اور بچپن ہی میں مجذوب ہو گئے تھے۔ بالکل برہنہ رہا کرتے، بال خاک دھول میں اٹے رہتے اور جسم پر مٹی کیچڑ اور غلاظت تھپی رہتی تھی۔ وہ ڈولی میں پڑے پڑے ساری دلّی کا گشت لگایا کرتے اور جب بھی میر نہالیے کے ہاں آتے لگاتار کئی کئی دن رہتے۔ ان کو اپنے سراپا کی تو خیر تھی نہیں، اپنے ہی گو موت میں پڑے ہوئے انگلیوں پر گن گن کر تِک تِک تِک کیا کرتے اور رات کو زمین پر ڈنڈے بجا بجا کر بڑ لگائے رکھتے۔ دوسروں کی نیند حرام ہو جاتی۔ وہ ہمیشہ کباب روٹی یا کسی نہ کسی چیز کی فرمایش ضرور کرتے۔ آج انھیں پلاؤ کی لگ گئی تھی۔ دلچین نے آکر کہا:

"دولہا میاں آج گھر میں پلاؤ نہیں پکّا۔"

اس انکار سے وہ ایک دم جذب میں آگئے اور "پلاؤ، پلاؤ، کوٹھا کوٹھا" چیختے چیختے لکڑی پیٹتے ہوئے زنان خانے میں گھس گئے اور چلّانا شروع کر دیا:

"کوٹھے والی، کوٹھے والی"۔ انھیں دیکھ کر اور عورتوں نے ڈر کے مارے سانس تک نہیں لیا، مگر دلچین ان کا ہاتھ پکڑ کے باہر چھوڑ آئی۔ بعد میں یہ عقدہ کھلا کہ جمال بیگم کے ہاں کہیں سے پلاؤ کا حصّہ آیا تھا اور جب دلچین ان سے پلاؤ مانگنے گئی تو وہ بولیں:

"زمانے بھر کے موئے دیوانے خبطی اس گھر میں آتے رہتے ہیں، میں اس دماغ چلے زِرٹی کو پلاؤ ہرگز نہ دوں گی۔ کالا منہ بے شرم ننگا پھرا کرتا ہے۔"

انجم زمانی بولیں: "ہے ہے آپا! تم کو کیا ہو گیا ہے۔ اب تو تم اللہ والوں سے بھی الجھنے لگیں۔ کیا معلوم اس بھیس میں کون ہے۔ اگر جلال آگیا تو پانی کرکے بہا دیں گے۔"

اور انھوں نے نند کی برہمی کے باوجود پلاؤ اندھے حافظ جی کو بھجوا دیا، لیکن

انھوں نے قبول نہ کیا اور اتنے زور سے چیخے "لے جا، لے جا" کہ جمال بیگم کے کوٹھے تک ان کے غصّہ کی آواز پہنچی۔ ان کی آواز سے جمال بیگم اندر ہی اندر دہل گئیں پر تھیں ضد کی پکی اور اپنے کہے پر اڑی رہیں۔

حافظ جی کا غصّہ دھیما پڑا تو وہ گنڈلی منڈلی مار کر ایک کونے میں پڑ رہے۔ اصغر میر نہال کے پاس آیا اور کہا:

"ابّا میاں میں نے تائی امّاں کا کیا بگاڑا ہے جو وہ میری شادی کی مخالفت کر رہی ہیں۔ میں اپنے واسطے تھوڑی کر رہا ہوں۔ صرف جہاں آرا کا خیال ہے کہ کوئی اس بے ماں کی بچّی کی خبر گیری کرنے والا ہو۔"

میر نہال اپنے بیٹے کی خوشی کو کیسے برباد ہوتے ہوئے دیکھ سکتے تھے، آگ بگولہ ہو کر جمال بیگم پر بگڑنے لگے:

"ان کی ہمیشہ سے یہی خاصیت ہے کہ پرائے معاملوں میں ٹانگ اڑا کر اپنوں ہی کو ذلیل و خوار کرتی ہیں۔ انھیں کیا حق ہے کہ تمہاری شادی بیاہ کے معاملہ میں بولیں۔ وہ کون ہوتی ہیں آخر۔ میں نے ان کو ہمیشہ حقیقی بہن سے بڑھ کر سمجھا اور آج وہ میرے کیے کا یہ صلہ دے رہی ہیں۔ کیا اسی دن کے لیے انھیں اپنے پاس رکھا تھا جس کی گود میں بیٹھیں اسی کے دیدے پھوڑیں۔ کسی کی خوشیاں نہیں دیکھ سکتیں . . . ."

حلال خوری جھاڑو دیتے میں یہ ساری باتیں سن رہی تھی۔ جب وہ اندر کمانے گئی تو جمال بیگم نے اس سے پوچھا:

"کیوں ری، اندھے حافظ جی کس پر بگڑ رہے تھے؟" اب ان کو اپنی غلطی کا کچھ احساس ہو چلا تھا اور وہ حافظ جی کی خفگی سے ڈر رہی تھیں کہ اللہ والے ہیں کہیں بد دعا نہ کر بیٹھیں۔

مہترانی بولی: "بیوی دولھا میاں تو چپکے پڑے ہیں، لیکن آج سرکار بہت گرم

ہو رہے تھے۔"

"اری کس پر؟"

"میں تو جانوں وہ آپ سے غصے ہیں۔"

"اے چل ڈھنڈ۔ ہوش کی دوا کر۔ اے مجھ سے کیوں ناراض ہوں گے، میں نے کونسی چٹکی لی ہے۔"

مہترانی نے جو باتیں سنی تھیں من وعن کہہ دیں۔ اپنا سن کر وہ بھنا گئیں، تلوؤں لگی سر کو چڑھی۔ وہ ہاتھ چلا چلا کر بکنے لگیں:

"میں بھی سمجھ لوں گی۔ آخر مجھے سمجھا کیا ہے۔ مجھے جہاز میں ڈال کر پھینکنے کے کیا معنی ہیں۔ ہرا یرے غیرے نتھو خیرے کے سامنے میرے بکھان کیے جاتے ہیں۔ لو اور سنو کیا ان کی بہو کو لے کر بھاگ گئی۔ اے میری جوتی کو غرض پڑی ہے جو انکے بیٹے کی باتوں میں بولوں۔"

انجم زمانی نے انھیں ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا:

"بیلو بی غصہ میں کہہ دیا ہوگا۔ جہاں دو برتن ہوں کھڑک ہی جاتے ہیں۔"

بیگم نہال بھی انھیں سمجھانے بجھانے لگیں مگر ان پر بھوت سوار تھا اور وہ میر نہال سے اسی وقت سلٹنے پر تلی ہوئی تھیں۔ مگر حافظ جی باہر تھے اور وہ پردے کے مارے نہ جا سکیں۔ جب وہ چلے گئے تو غصے میں دندناتی ہوئی وہ مردانے میں میر نہال کے پاس گئیں اور کہنے لگیں:

"اے اس کا نام تو لو جس نے میری طرف سے جھوٹے سچے تمہارے کان بھرے۔"

میر نہال کو بھی جلال چڑھا ہوا تھا۔ وہ بھاوج سے بات نہیں کرنی چاہتے تھے چپ پڑے رہے۔ مگر وہ ہٹ دھرمی سے کہنے والے کا نام پوچھتی رہیں۔ آخر تنگ ہو کر میر نہال نے جواب دیا:

"میں ہرگز نہیں بتا سکتا۔"

"نہیں بتا سکتے تو نہ بتاؤ۔ لو میرا بھی سلام ہے۔ آنکھ بدلنے سے کوچہ بدلنا

بہتر ہے۔ جب تم مجھ کو کچھ سمجھتے ہی نہیں تو پھر میں بے غیرت بن کر تمہارے در پر کیوں پڑی رہوں ؟"

میر نہال بالکل موم ہو گئے تھے۔ ذرا سی بات بھی ان کے دل کو دُکھا دیتی تھی اور وہ رونے لگتے۔ اگر وہ کہنے والے کا نام بتا دیتے تو بیٹے پر آنچ آتی اور یہ انھیں کسی حالت میں گوارا نہ تھا۔ انھوں نے کہا:

"جو آپ کے جی میں آئے کیجیے۔"

"بس تو بس۔ دیکھ لیا تمہارے دل میں میرے لیے کتنی گنجایش ہے۔ اللہ اللہ خیر صلّا ح تم نام نہ قبولو، میں بھی جوتیاں کھانے یہاں نہیں رہتی۔ بوریا بدھنا سمیٹ کر کل ہی چلی جاؤں گی ......"

اور یہ کہتی ہوئی وہ اندر چلی آئیں اور روتے روتے اپنی آنکھیں لال کر لیں۔ دل میں بل پڑ چکے تھے اور صورت حال سنگین ہو گئی۔ خود کردہ را علاجے نیست۔ نہ بات کو اتنا بڑھاتیں اور نہ یہ نوبت آتی۔ اتنی بدمزگی کے بعد میر نہال کے گھر میں رہنا وہ اپنی توہین سمجھتی تھیں۔ میر نہال کو غصّے کے باوجود دھاوج کے فیصلے سے بہت قلق ہوا اور انھوں نے کہلوایا بھابی سے کہنا:

"ناحق کی ضد نہ کریں جو ہوا سو ہوا، بھلا کہاں جائیں گی۔"

اس کا جواب جمال بیگم نے یہ دیا:

"ہاں کہہ دینا مجھے ٹھہرنے میں کوئی عذر نہیں مگر میری بھی شرط ہے۔ جس نے کہا ہے اس کا نام بتا دیں۔"

اور میر نہال کے لیے یہ ممکن نہ تھا۔ اور جمال بیگم نے جو اپنے جی میں ٹھانی تھی اس سے باز نہ آئیں اور ہفتہ بھر بعد ہی انھوں نے اپنا وہ مکان جو کرایہ پر اٹھا رکھا تھا خالی کروا کے اس میں منتقل ہو گئیں۔

جس دن میر نہال کی بھاوج ان کا گھر چھوڑ کے جا رہی تھیں اندوہِ جدائی کا دن تھا۔ وہ یہاں دلہن بن کر آئی تھیں اور کم و بیش چالیس سال رہی تھیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد گھر دنوں سونا سونا اور برا معلوم ہوتا تھا۔ جب کوئی آدمی ساتھ رہتا بستا ہے تو اس کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اس کا ہنسنا بولنا، اٹھنا بیٹھنا آنکھوں میں سما جاتا ہے اور جب وہ چلا جاتا ہے تو بار بار یہی خیال آتا ہے وہ یہاں رہتا تھا، یہ کمرہ اس کا ہے، وہ چیز اس کی ہے۔ کان جمال بیگم کی آواز کے عادی بن گئے تھے، نگاہیں اُن کی صورت سے مانوس تھیں اور اب جبکہ وہ چلی گئیں اُن کے قدموں کی چاپ ان کے کپڑوں کی سرسراہٹ یاد آتی، کان ان کی آواز کو ترستے اور دل ان کی صورت کو ڈھونڈتا۔ لیکن سوگوار دل کی یہ تلاش بے حصول تھی اور نگاہوں کا انتظار فضول تھا، گویا کوئی دل میں بسنے والا محبوب ہمیشہ ہمیشہ کو جدا ہو گیا تھا۔ اور اس کی جگہ اب کبھی پُر نہیں ہو سکتی تھی۔

۹

اس واقعہ کے بعد میر نہال سُن ہو گئے اور ان کو چپ لگ گئی۔ ان کو اپنے مرحوم بھائی سے بے پناہ محبت تھی۔ بچپن سے لے کر جوانی تک اسی گھر میں پل کر ساتھ رہے تھے اور زندگی کی راہوں پر ساتھ چلے تھے۔ دونوں بھائیوں نے مل کر زمانہ کی بدلتی نگاہیں دیکھی تھیں۔ جب دنیا میں انھوں نے جنم لیا تھا اس کو موت کے مرحلوں سے گزرتے دیکھا تھا۔ ان کے والد سن ۱۸۵۷ء میں غدر کے بعد ہی جب دلّی میں ہیضہ پھیلا تھا، دار البقا کو کوچ کر گئے تھے۔ شہر سے بھاگنے کے وقت اپنی حویلیاں زیور اور نقدی سے جوں کی توں بھری پڑی چھوڑ گئے تھے۔ پرائز ایجنسی نے جس کا کام گھروں میں جا جا کر تلاشیاں لینا اور مال و اسباب پر قبضہ جما لینا تھا میر کمال کا سب اسباب لوٹ لیا، جائدادیں قرق کر لیں اور بنیوں کے ہاتھ کوڑیوں کے مول نیلام پر چڑھا دیں۔ مگر جب امان جمی ہوئی اور یہ لوگ پھر واپس دلی آئے تو خالی ہاتھ تھے اور ساری املاک میں سے سوائے دو مکانوں کے کچھ نہ ملا۔ اس پُر آشوب زمانے میں سر چھپانے کو جھونپڑا بھی غنیمت معلوم ہوتا تھا، اور

دونوں بھائی اسی پر قانع ہو کر اپنی عزت د آبرو لے بیٹھے۔ میر جمال، میر نہال سے بڑے تھے۔ لیکن اس فرق کے باوجود آپس میں بہت یگانگت تھی۔ جہاں ایک بھائی کا پسینہ گرتا وہاں دوسرا بھائی اپنا خون بہانے کو مستعد رہتا۔ اور یہ ہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنی بیوہ بھاوج کو بہن کی طرح عزیز رکھا تھا۔ جمال بیگم کے چلے جانے سے میر نہال کی آنکھ میں آنسو نہ ٹھہرتا تھا اور ہر چیز بُری معلوم ہوتی تھی۔ یہ کسی کے بس کی بات نہ تھی کہ جمال بیگم کو منا لاتا۔ ان کا غصہ مشہور تھا اور وہ اپنی من مانی کرنے میں پوری تھیں...

زندگی کے ہاتھوں میر نہال کو دن بسر کرنے پہاڑ اور شام کاٹنی مصیبت تھی دل میں اب یاد بھی باقی نہ تھی۔ کاروانِ ماضی گزر چکے تھے اور وہ سلسلۂ ذوق و شوق جو وجہ زیست و حسرت تھے بے نام و نشان ہو گئے اور وہ خود آوازِ جرس کی طرح بیابانِ زندگی میں یکہ و تنہا رہ گئے۔ ان کا تکیہ اور چادر میل اور مٹی سے چیکٹ ہو کر سیاہ ہو جاتا لیکن ان کو احساس بھی نہ ہوتا۔ جب سے بیوی اندھی ہوئی تھیں کھانا بھی پھیکا میٹھا جیسا سامنے آجاتا کچھ کہے بغیر کھا لیتے۔ غفور اب ان کا کام کرنے میں مستقل بڑبڑ کرتا رہتا اور وہ اُف تک نہ کرتے۔ وہ زمانے کے عتاب و ستم اسی ناز سے اٹھا رہے تھے جس طرح جاہ و تحمل کی زندگی انھوں نے بانکپن سے گزاری تھی۔

بیگم شہباز نے کوئی فیصلہ کن جواب نہ دیا تھا اور اصغر امید و بیم کی کشاکش میں مبتلا تھا۔ زہرہ سے ملاقاتیں جاری تھیں اور شادی کے عہد و پیماں بھی خفیہ خفیہ ہو چکے تھے۔ اور اس بنا پر اسے یقین تھا کہ آخرش حالات اس کے موافق ہو جائیں گے۔

حبیب الدین اور زیادہ بیمار رہنے لگے تھے آخر طویل رخصت لے کر دِلّی ہی آ گئے مرض نے اتنا لاغر کر دیا تھا کہ آدھے بھی نہ رہے تھے۔ ان کے رہنے کا بندوبست مردانے میں میر نہال کے پاس کر دیا گیا۔ پہلے بھی حکیم اجمل خاں کے زیرِ علاج تھے لہٰذا ان ہی کو بلا کر پھر دکھا دیا گیا اور ان کے لمبے چوڑے نسخے جن کی کٹائی پسائی اور چھنائی میں گھنٹوں لگ جاتے

تھے اور کالے کالے قدّے جو انتہائی کڑوے کسیلے ہوتے، پلائے جاتے جن کو حلق سے اتارنے میں اُبکائی آجائے۔ لیکن انسان کو صحت اتنی پیاری ہے کہ اس ملغوبے کو بھی پی لیتے مہینہ بھر حکیم صاحب کا علاج رہا، لیکن صحت کے آثار کچھ امید افزا نہ تھے ان کی حالت روز بروز بگڑتی جارہی تھی، کچھ دنوں میں وہ پلنگ سے لگ گئے۔

اب گھر میں حبیب الدین کی بیماری کے علاوہ بات کرنے کا کوئی اور موضوع نہ رہا۔ سب ان کی صحت کی دعائیں مانگا کرتے۔ جوان بیٹے کی بیماری سے بیگم نہال کے دل پر بن گئی۔ نت نئے وہم ان کو آتے رہتے اور وہ کہتیں :

" یُو اتن کا روگ ہو تو دوا دارو سے جائے۔ دور پرے مجھے تو اوپری اثر معلوم ہوتا ہے "

اور حبیب الدین کو قرآن شریف کی ہوا دی جاتی۔ حبیب الدین بہت خوبیوں والے اور خلیق انسان تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے پرایوں میں یکساں ہردل عزیز تھے اور ان کے دوستوں کا دائرہ بہت وسیع تھا اور دلّی کا کونسا کوچہ تھا جہاں ان کے میل ملاقاتی نہ ہوں۔ ان کے ملنے جلنے والے روز ایک نیا نسخہ بتا جاتے اور جو جس کو جانتا حبیب الدین کے واسطے لے آتا۔ ایک دن ایک صاحب حضرتِ بیخود کو لے آئے جو شاعر ہونے کے علاوہ جن اتارنے کے عامل بھی تھے۔ انھوں نے ساری رام کہانی سن کر ایک تعویذ دیا کہ رات کو عطر میں بسا کر تکیہ کے نیچے رکھ لینا اور اس رات جو خواب آئے یاد رکھنا، دوسرے روز بیخودؔ خود تشریف لائے اور حبیب الدین سے پوچھا :

" ہاں میاں خواب میں کیا نظر آیا ؟"

حبیب الدین کہنے لگے :

" میں نے دیکھا کہ میں ایک لق ودق جنگل بیابان میں تن تنہا چلا جا رہا ہوں اور دل میں کہہ رہا ہوں یاالٰہی یہ کونسا میدان ہے۔ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں ایک شخص جس کے ماتھے پر

دونوں بھووں کے عین بیچ میں ایک گول نشان چمک رہا تھا اور ڈاڑھی بانات کے ٹکڑے کی طرح سرخ تھی میرے پاس آیا اور کہنے لگا، آؤ میرے ساتھ چلو۔ اس کی آواز نہایت شیریں تھی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ تھوڑی دور چلا ہوں گا کہ میں نے گردن اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس کی ڈاڑھی سرے سے غائب ہو گئی اور لال لال شعلے نکلنے لگے جو بڑھتے بڑھتے اس قدر بڑھے کہ سارے میں پھیل گئے اور بجائے ڈاڑھی کے میدان میں آگ لگ گئی۔ لپٹوں کی گرمی سے میرا حلق خشک ہو گیا۔ پھر میری آنکھ کھل گئی"

بجو دَ پہلے بہت غور سے حبیب الدین کا خواب سنتے رہے پھر بولے:

"بے شک و شبہ ہے تو آسیبی خلل۔ کسی جید جن کا سایہ ہے۔ لیکن میں نے اپنی عمر میں بڑے بڑے جلالی جنوں کو چٹکی بجاتے اتار دیا ہے ان میں طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ بعضے تو ایک ہی دفعہ کے عمل سے کافور ہو جاتے ہیں اور بعض بہت ہیٹلے ہوتے ہیں۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ میرا پالا ایسے ہی موذی سے پڑا تھا مگر میں بھی اللہ کا نام لے کر اس کے اسطرح پیچھے پڑا کہ وہ بھی یاد کرتا ہوگا کہ کوئی حضرت بجو دبھی تھے۔ یہ ایک بنیے کی لڑکی پر عاشق تھا۔ بہت غصہ ور۔ جب اس پر آتا تو بری طرح مارتا اور وہ پٹخیاں کھاتی اور مارے سہم کے زرد پڑ جاتی۔ بس رات دن کونے میں بال منہ پر ڈالے ہوئے چپ چاپ بیٹھی رہتی۔ جناب بڑے بڑے عالموں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ کسی طرح اس ظالم کو شیشے میں اتار لیں مگر وہ کسی کے قابو میں نہ آتا تھا۔ مجھ کو جو خبر لگی تو میں نے قسم کھائی جو اس جن کو بوتل میں نہ بند کر دیا ہو تو بجو د نام نہیں۔ صاحب تین روز حاضرات کی ہمارے اور اس کے جواب و سوال ہوتے رہے۔ میں کہتا اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو سیدھی طرح لڑکی کو چھوڑ کر چلے جاؤ۔ وہ اکڑ کر کہتا "نہیں جاتے، کر لو جو جی میں آئے۔ کیا بگاڑ لو گے ہمارا" آخر چوتھے روز میں نے کہا، دیکھو اب بھی شرافت سے چلے جاؤ۔ نہیں تو ایسی پٹخنی دوں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائیگا۔ اس پر اس نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا بہت دیکھے ہیں تم جیسے، پھر تو حضرت مجھے بھی جلال آگیا

اور میں نے فوراً حصار کھینچا اور بیٹھ کر جو پڑھنا شروع کیا ہے تو میاں ابھی تو آدھا بھی نہ پڑھا تھا کہ منت سماجت کرنے لگا پر میں نے ایک نہ سُنی ساب تو اس کا یہ حال ہوا کہ ایک چیخ زمین پر تو ایک آسمان پر۔ ہائے، مرا ہائے مرا مجھے بخشو۔ اب نہیں آؤں گا، مگر میاں میں نے بھی اس کو خوب مزا چکھایا اور جب اس سے تین قول لے لیے تب کہیں اس کی جان چھوڑی۔ بس تمہارے جن کو بھی چت کر دوں گا۔ تم خود دیکھنا دھواں بن کر بوتل میں سما جائے گا۔"

اس کے بعد انھوں نے اپنا عمل شروع کر دیا جو چالیس روز کا چلّہ کھینچ کر پورا ہوتا تھا، ساتھ ہو فیا کے سچے پھول مریض کے سرہانے روز رات کو رکھے جاتے اور سویرے بنجو دصاحب کے ہاں یا تو شمس دفتر جاتے ہوئے دے آتے یا پھر مسرور پہنچا آتا۔ تیسرے چوتھے وہ خود بھی آکر کیفیت پوچھتے، اجنّا کے قصے سناتے اور گھنٹوں شعر و شاعری کا سلسلہ قایم رہتا چونکہ سائل سے ان کی چشمک رہا کرتی تھی اس کی بائیں کرتے۔ بنجود کے چشم دید واقعات کی مزیدار حکایتوں میں حبیب الدین اپنی بیماری کو بھول جاتے میر نہال کا وقت بھی خوش گواری سے کٹ جاتا۔ لیکن چلّہ کشی کے بعد بھی وہ جن شیشے میں نہ اترنا تھا نہ اترا۔ حبیب الدین کا حال اور پتلا ہو گیا۔ نقاہت ایسی بڑھی کہ خود کروٹ بھی لینے کے نہ رہے۔

میر نہال پڑے پڑے بیٹے کو دیکھا کرتے۔ حبیب الدین کی طرف سے انہیں کھٹکا لگ گیا۔ اب وہ خاصے فکرمند رہنے لگے تھے، جس کو بھی حبیب الدین کی علالت کی خبر ملتی وہی دوڑا دوڑا خیریت معلوم کرنے چلا آتا اور ان کے پاس تمام دن اور اکثر رات کو بھی دوست احباب اور رشتہ داروں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ چھٹی کے دن اور اتوار کو شمس، اصغر اور نظر الحسن بھی آجاتے اور سب مل کر حبیب الدین کے قریب بیٹھ کر پچیسی کھیلتے یا شطرنج کی دو چار بازیاں ہو جاتیں، حبیب الدین سب کو کھیلتا ہوا دیکھتے رہتے اور اکثر مات کھانے والے کو چال بھی بتا دیتے۔ سب کی موجودگی سے میر نہال کا

اکیلاپن جاتا رہتا اور وہ سب کو ہنستا بولتا دیکھ کر خوش ہوتے۔ جو اپنے کو پیارے ہوں ان کے ساتھ مل بیٹھنا بھی کتنا پیارا اور خوشی سے بھرا ہوتا ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

جب یونانی دوائی، ٹھنڈائی سے کوئی افاقہ نہ ہوا تو اصغر ڈاکٹر مترا کو لے آیا۔ اس نے دیکھتے ہی کہدیا ان کو تپ دق ہے اور ان کے دونوں پھیپھڑوں پر مرض کا زور ہے لیکن اس نے کہا:

"بابو گھبرانے کا ایسا کچھ بات نہیں ہے۔ ہم علاج کرے گا۔ ایشور کی دیا سے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔"

اور اس نے ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر مہنگی دوا تجویز کی جو صرف اسی کے شفاخانے سے مل سکتی تھی اور ساتھ ہی ان کو پھلوں کا رس اور مرغی کی یخنی جو بوتلوں میں بند خاص انگلستان سے آتی تھی کھانے کو بتائی۔ جتنی مرتبہ وہ دیکھنے آتا آٹھ روپے اپنی فیس کے تو لیتا تھا ہی، تانگے کا کرایہ الگ دینا پڑتا۔

اسی دوران میں ایک دن جو دلچین لوٹتے ہوئے چولھے کو لیپنے بیٹھی اور راوے میں سے راکھ کا ڈھیر نکالا تو اس میں ایک مٹی کا پتلا نکلا جو اس نے فوراً کلیم بیگم اور حبیب الدین کی دلہن کو لے جا کر دکھایا اور کہا:

"لو بیوی میں جھوٹ تھوڑی کہتی تھی۔ کسی نے میاں پر جادو کر دیا ہے۔ جب ہی تو موئی کوئی دوا نہیں لگتی۔"

عورتوں کے نازک دل جادو کے ڈر سے کانپ اٹھے۔ پتلے کو تو خیر غفور جمنا میں پھینک آیا مگر بیگم نہال نے آخون جی صاحب کو بلوایا۔ انھوں نے سفید چینی کی طشتریوں پر زعفران سے ایک عمل جادو کا توڑ کرنے کو لکھ کر دیا یہ اکیس روز کا عمل تھا اور ایک طشتری تین دن تک دھو کر پلائی جاتی۔

لیکن اب تو روز گھر میں نئی نئی اور عجیب عجیب باتیں رونما ہونے لگیں۔ ایک دن کسی نے پوَن پھینکی اور ایک مٹی کی ہنڈیا جس میں سیہی کے کانٹے اور آٹے کا پتلا تھا کھجور کے بیچ میچ تنے سے ٹکرا کر نیچے گری۔ دوسرے روز مہندی کی جڑ میں ماش کی دال اور خشکا پڑا ہوا ملا۔ گھر میں تو پکا نہ تھا۔ یہ کیسے آیا اور کون ڈال گیا کسی نے نہ دیکھا۔ ایک رات کو ہوا میں اڑتی ہوئی چھری گھر پر سے گزرتی ہوئی گئی۔ اتفاق سے یہ ساری ٹوٹکے ٹونیاں اور لوٹے ٹوٹکے دلہین ہی کو ملتے اور نظر آتے۔ وہی آکر گھر والوں کو بتاتی۔ دلہین چونکہ ہندو سے مسلمان ہوئی تھی، سفلی عمل اس کے لیے قابلِ قیاس تھے۔ مگر سب ہی کو ان باتوں پر یقین آجاتا۔

محلے کی غریب بڑھیاں ٹھکریاں اور عورتیں اپنے میلے کچیلے لبادے لگے برقعے سروں پر ڈالے شپڑ شپڑ کرتی خیر صلاح آتیں:

"بی اب جی کیسا ہے تمہارے ننھے کا ماشاءاللہ جیتا رکھے غریبوں کا بڑا درد ہے ان کے دل میں، مجھے جب دیکھتے تھے ایک روپیہ ایسے چپکے سے دیدیتے تھے کہ دوسرے ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہوتی تھی۔ ان کا احسان بھولوں گی تھوڑی ہی"۔

دوسری کہتی: "مجھ رانڈ پر تو ان کا کرم ہے ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج تھی۔ بیوی اللہ تمہارے سرتاج کو قیامت تلک سلامت رکھے۔ میرے یوسف کو انھوں نے ہی دفتر میں لگوایا تھا۔ اے بیگم میرا تو رواں رواں چوبیسوں گھڑی دعا کرتا ہے کہ اللہ انھیں آرام کردے"۔

کپڑے میلے ضرور تھے مگر دل کثیف نہ تھے۔ جس جس کے ساتھ حبیب الدین نے چھوٹا موٹا سلوک کیا تھا وہ سب آتیں، خلوص سے دعائیں دیتیں، اپنی اپنی عقل اور استعداد کے مطابق ماں اور بیوی کی درد سے غم خواری کرتیں، ڈھارس بندھاتیں اور اس کے ساتھ مولوی ملّا اور تعویذ دینے والوں کے اتے پتے بتاتیں۔ کوئی کہتی:

"بیوی محبوب الٰہی کی چوکھٹ سے کوئی بے آس نہیں لوٹتا۔ وہاں کی خاک کی چٹکی میں بھی شفا ہے۔ ان کی درگاہ پہ جاکر میاں کی صحت کے لیے چادر چڑھاؤ۔ اللہ نے کیا تندرست ہو جائیں گے۔"

کوئی یقین دلاتی:

"اب سے دور میرے چنو کے ابا بھی ایسے ہی بیمار پڑے تھے۔ بہت علاج معالجے کیے پر بیوی دکھ کسی طرح پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ اللہ بھلا کرے ہمسائی کا کہ انھوں نے سلطان جی کی باولی کا پانی صراحی میں بھروا کر لا دیا۔ لو بیٹی چار ہی دن میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے۔ بس بی تم بھی اللہ کا نام لے ان ہی کے ہاں کا پانی پلانا شروع کر دو......"

حبیب الدین کی بیوی سب کی باتیں سنتیں مگر وہ دیکھ رہی تھیں کہ میاں کی حالت دن بہ دن ابتر ہوتی چلی جا رہی ہے اور پڑے پڑے ان کی کمر لگ کر زخم پڑ گئے ہیں۔ ان کے دل کی جو حالت تھی وہ خدا ہی بہتر جانتا تھا۔ نہ راتوں کی نیند تھی نہ دن کا قرار۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

انسان جب زیادہ مایوس ہو جاتا ہے تو حقیقت سے کترانے لگتا ہے اور طرح طرح کے جھوٹے سہارے ڈھونڈتا ہے۔ اور نظر الحسن ایک مولوی صاحب کو لے آئے۔ یہ توتا سبز مخمل کی شیروانی، اطلس کا سرخ پاجامہ پہنے سنہری کلاہ اوڑھے ہوئے تھے۔ سنگِ اسود کی طرح بالکل سیاہ گول ڈاڑھی تھی اور گھونگریالی زلفیں شانوں پر پڑی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں کئی سلائیاں سرمے کی پھرا رکھی تھیں۔ یہ روحانیات کے عامل تھے اور بھوت پریت کا سایہ، نذر گزر، بد ارواح سب کا اُتار کرتے تھے۔ بہت سوں کو ان کے ہاتھوں شفا ہو چکی تھی۔ انھوں نے قصائی کے ہاں سے چھُرا منگوایا اور اس پہ پڑھ کر پھونکا پھر چھرے کو سات بار حبیب الدین کے سر سے

چھواتے ہوئے پیر کے انگوٹھے تک لے گئے اس کے بعد اسے کالے کپڑے میں لپیٹ کر رکھدیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ان کے آگے کوئی نہیں ٹھہر سکتا اور کہنے لگے :

" اللہ کا نام سچا اور اس کا کلام برحق ہے۔ بابا ہم اپنے لیے کچھ نہیں لیتے۔ ہم کو لینا منع ہے۔ اگر لے لیں تو ہمارے عمل کی تاثیر چھین جائے گی۔"

وہ کامل سات روز حبیب الدین کو چھرے سے جھاڑتے رہے۔ اور آٹھویں روز ایک بے داغ سفید مرغ، ڈھائی سیر بالوشاہیاں اور سات روپے نقد مُردوں کی فاتحہ درود اور صدقے کے نام پر لے کر وہ ایسے گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اور ان کا عمل بھی بیکار رہا۔

دوا دارو اور عملیات سب بیکار ثابت ہو رہے تھے اور یہ دیکھ دیکھ کر میر نہال کا جی بیٹھا جاتا اور اس خیال سے کہ نہ معلوم خدا کو کیا منظور رہے اور کل دیکھیے کیا ہو وہ سبک سبک روتے اور ان کو اپنے تمام فقرا اور صوفی دوست خصوصاً کمبل شاہ یاد آتے جو حبیب الدین کے مرض کو یقیناً سلب کر لیتے۔ بیگم نہال آٹھ آٹھ آنسو بہاتیں اور روزانہ گائے کا گوشت منگوا کر صدقہ اتروائیں۔ دیجان کو ٹھے پر جا کے گوشت چیلوں کو کھلا دیتی۔ ایک بوٹی اچھالتے ہی بے شمار چیلیں جھپٹ کر آئیں اور گوشت کو پنجوں میں دبا کر اڑ جاتیں۔ کلیم بیگم نے بھی داتا دربار سے دو کالے بکرے صدقے کیے۔

لیکن صد افسوس حبیب الدین کی حالت نہ سنبھلی۔ ان کا چہرہ دھُلی ململ کی طرح سفید پڑ گیا۔ گال پچک کر ہڈیاں نکل آئیں۔ آنکھوں کے نیچے گہرے گہرے سیاہ حلقے پڑ گئے اور جسم کی تمام تر تازگی اور توانائی بیماری کی نذر ہوگئی۔ آثار اچھے نظر نہیں آرہے تھے مگر شرف اللہ کہتے :

" انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ یہ ساری باتیں صحتمندی کی علامت ہیں۔"

اور وہ کسی جادو گنڈے کرنے والے کو کہیں سے پکڑ کر لے آئے۔ لیکن حبیب الدین نے کہا:

"یہ سب خرافات ہے۔ میں اس کو نہیں دکھاتا بھلاتا۔"

غالباً انھیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ سب تدبیریں بے مصرف ہیں۔ لیکن شرف اللہ نے کہا: "ایک دفعہ میری خاطر ان کو دکھا لیجیے۔" امید ہے عجیب پُر فریب حقیقت ہے اور وہ یہ کہہ کر راضی ہو گئے کہ: "اچھا بھئی تم بھی اپنے جی کی جی میں نہ رکھو۔"

یہ شخص شکل صورت سے کہانیوں کا جادوگر معلوم ہوتا تھا۔ اس نے سفلی عمل کرنے کے لیے نجاست کھائی تھی اور ایک تیلی کے مردہ پیدا ہوئے بچے کی لاش پر بیٹھ کر منتر پڑھا تھا اور اس کی روح کو قابو کیا تھا۔ اس نے آٹا گوندھ کر ایک گڑیا بنائی اور انتر منتر پڑھ پڑھ کر کیکر کے کانٹے اس میں گھونپ دیے۔ پھر اس نے حبیب الدین سے کہا کہ چھری لے کر گڑیا کو بیچ میں سے کاٹ دیجیے۔ بس ادھر کاٹا ادھر جادو کا اثر جاتا رہا۔

جادو کا اثر تو کیا زائل ہوا، حبیب الدین کی حالت ایسی نازک ہو گئی کہ لینے کے دینے پڑ گئے اور انھیں اکتوبر کی ایک ہنستی ہوئی چمکیلی صبح کو مردانے سے پلنگ سمیت اٹھا کر زنانخانے میں لے گئے تاکہ ان کی تیمارداری صحیح اور وقت پر ہو سکے۔ بیٹھک خالی ہو گئی، اور میر نہالی کی ساری امید منقطع ہو گئی۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ مریض اب دواؤں کی حد سے گزر چکا، اب دعاؤں کا وقت ہے۔ وہ اتنا روئے کہ ہچکیوں کے ساتھ پلنگ بھی ہلتا رہا۔ بیٹے کے غم میں ان کا دل پگھل پگھل کر آنسوؤں میں ڈھلتا اور وہ بیٹے کے بچ جانے کی دعائیں مانگتے رہتے۔ روز دو آدمی ان کو کھٹولے پر بٹھاتے اور ڈنڈا ڈولی کر کے اندر لے جا کر حبیب الدین کے قریب بٹھا دیتے اور وہ دو ڈھائی پہر حبیب الدین کے پاس بیٹھے رہتے۔ حالانکہ

ان کا دل یک لخت بیٹے کے پاس سے ہلنے کو نہ چاہتا تھا مگر وہ ضعیفی سے ناطاقت ہو گئے تھے۔ گھنٹہ دو گھنٹے سے زیادہ بیٹھنے کی ہمت نہ رہی تھی اور وہ بیٹھک میں واپس آجاتے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

عیادت کرنے والوں کا ایک تانتا بندھ گیا تھا۔ جو بیویاں دلّی میں رہتی تھیں وہ ڈولیاں چڑھ چڑھ کے دن دن بھر کو آتیں اور وہ عزیز و رشتہ دار جو دوسرے شہروں میں رہتے تھے آکر اٹھواروں رہتے۔ وحیدہ بیگم اور مہرو بھی بھائی کی تشویشناک حالت سن کر آگئیں اور جیسے ہی بھائی کی صورت دیکھی تو دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ حبیب الدین کے چہرے اور پیروں پر ورم آگیا تھا۔ وہ سمجھ گئیں کہ بھائی دو چار ہی دن کے مہمان ہیں۔

دن بھر سب حبیب الدین کے پاس بیٹھے رہتے اور رات کو باری باری جاگتے۔ ان کی حالتِ غیر دیکھ کر سب کے اوسان جاتے رہے تھے، کس کا بولنا اور کیسا چالنا اشاروں میں باتیں کرتے اور بیٹھ موڑ موڑ آنسو خشک کر لیتے۔ ایک دن حبیب الدین نے اپنی بیوی کو چوری چوری آنسو پونچھتے ہوئے دیکھ لیا اور بولے:

"رونے کی کیا بات ہے خاطر جمع رکھو۔ میں جلد ہی اچھا ہو جاؤں گا۔ تم بلا وجہ اپنے کو پریشان کیے لیتی ہو۔"

بیوی نے جلدی سے آنسو پی کر بظاہر مسکراتے ہوئے کہا:

"ہاں کیوں نہیں اللہ میں بڑی قدرت ہے انشاء اللہ آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔۔۔"

۱۰

مرنے سے تین دن پہلے حبیب الدین نے اپنی اماں سے کہا:

"اماں میرا دودھ بخش دیجیے اور اگر میں نے کوئی گستاخی کی ہو تو معاف کر دیجیے۔"

اور انھوں نے ہر ایک سے اپنا کہا سُنا معاف کروایا اور ان کی بیوی نے سب کے سامنے ان کو حقِ مہر سے آزاد کر دیا۔

اس کے بعد وہ پُرسکون ہو گئے اور ان پر غفلت طاری ہو گئی، اور وہ اسی عالم میں کبھی ان لوگوں کے نام لے لے کر سلام کرتے جن کو مرے ہوئے برسوں گزر چکے تھے، اور اس طرح کہتے جیسے ان کو دیکھ رہے ہوں:

"دیکھو وہ کیسے نورانی کپڑے پہنے ہوئے لوگ میرے استقبال کو کھڑے ہیں۔"

اور کبھی مسکرا کر کہتے: "کیسی کیسی بزرگ ہستیاں مجھ کو اپنے پاس بلا رہی ہیں۔"

انتقال والی رات انھوں نے بڑے رسان سے کہا:

"جزاک اللہ! کتنا عمدہ ہے۔"

شمس جو اُن کے پلنگ سے لگا بیٹھا تھا، پوچھنے لگا:

"آپ کچھ کہہ رہے تھے؟"

جیب الدین نے اس طرح جواب دیا جیسے وہ کسی اور ہی عالم میں پہنچ گئے ہوں:
تمھیں تو ——— دادا ابّا مجھے گلاب کا کتنا خوشبودار پھول دے رہے ہیں ......
تو چچا جمال بھی ان کے ساتھ مجھے لینے آئے ہیں ......"

پھر وہ خاموش ہو گئے۔ اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سرمدی سکون سے شادماں ہو کر ان کا چہرہ نورانی ہو گیا اور شمس کو بالکل یہ معلوم ہوا کہ گلاب کی خوشبو آرہی ہے۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک سرد جھونکا آیا اور اس کے ساتھ لوبان کی لپیٹ اس کے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ وہ فوراً درود پڑھنے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اپنے دل کو سنبھالتے ہوئے شمس نے جیب الدین سے کہا:

"اس کی طرف لو لگائیے اور کلمہ پڑھیے۔"

جیب الدین نے اسی طمانیت سے کہا:

"سبحان اللہ! کیسا پُر فضا مقام ہے اور کیسی پاکیزہ صورتیں ہیں۔ ایک مجھے ......"

یہ کہتے کہتے ان کے لب بند ہو گئے اور آنکھیں ایسے خمار سے ٹھہر گئیں، جیسے وہ کہیں ستاروں سے بھی پرے دیکھ رہی ہوں۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

رات کو گیارہ بجے جیب الدین اس خاموشی سے چلے گئے کہ قریب بیٹھنے والوں کو بھی ان کے چلے جانے کی خبر نہ ہوئی۔ اصغر، شمس اور ان کی بیوی ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے جیب الدین کو ہلکے سے کسمساتے ہوئے دیکھا تھا مگر انھیں کیا خبر تھی کہ یہ زندگی کی آخری حرکت تھی اور موت کی انگڑائی۔ جب اصغر نے انھیں جھک کر دیکھا تو روح عالم بالا کو پرواز کر چکی تھی، صرف جیب الدین کا خول باقی تھا۔ گھر میں ایک

کہرام بپا ہوگیا۔ چاہنے والے دہاڑیں مار مار کے رونے لگے۔ ان کی بیوی کے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹھنڈی کردیں اور ان کے رنگین کپڑے اتار کر سفید کپڑے پہنا دیے۔ سب ایک دوسرے سے گلے مل مل کر روتیں اور سینے کوٹ کوٹ کر بین کرتیں۔ مہرو روتے روتے غش کھا گئی اور بیگم نہال بیٹے کی لاش کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد آکر چھوتیں اور "میرا لال" کہہ کر پیشانی چوم لیتیں۔ شور و فغاں کی آواز باہر تک جا رہی تھی۔ محلے والے جاگ اٹھے۔ عورتیں چھتوں پر چڑھ چڑھ کر پوچھتیں۔ کسی نے آہ کی، کسی نے آنسو بہائے اور کوئی ہمدردی کرکے چپ ہو گئی، اور پھر سب جا جا کر سو گئیں۔

میر نہال، شدتِ الم سے پلنگ پر اپنا سر دے دے مارتے۔ ہچکیوں سے ان کا سارا ڈول ہل جاتا۔ نسیم سو رہا تھا۔ وہ رونے دھونے کے شور غل سے سہم کر اٹھ بیٹھا اور ماں کے پاس آگیا۔ وہ پتھرائی ہوئی نظروں سے سکتے کے عالم میں بیٹھی ہوئی سب کو دیکھ رہی تھیں۔ جب نسیم ان کے پاس آیا تو وہ ایک دم اپنے اپنے بچے سے لپٹ گئیں اور پھر ان کا رونا دیکھ کر سننے والوں کا جگر ٹکڑے ہوتا تھا۔ مگر سب کو روتا دھوتا دیکھنے کے باوجود نسیم کی سمجھ میں نہ آیا کہ مرنا آخر ہوتا کیا ہے؟ اس کی عقل چکر میں تھی اور وہ گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتا۔ ایک نامعلوم خوف اس پر مسلط ہو گیا اس کو یہ یقین نہ آتا تھا کہ اس کے ابا مر گئے ہیں بلکہ اس کے خیال میں وہ کہانیوں میں سونے والوں کی طرح جادو کی نیند سو رہے تھے اور جب جادو کا اثر دور ہو جائے گا تو وہ جاگ جائیں گے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ جادوگر جس نے اس کے باپ کو سلا دیا ہے۔ گھر کے کسی تاریک کونے میں سے نکل آئے گا۔ اس کا ننھا سا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

رات بھر سب قرآن خوانی کرتے رہے اور صبح ہونے تک وہ زیر قیامت ایک حد تک ٹھنڈا پڑ گیا اور وہ بلبلاہٹ کم ہو گئی مگر چہرے اترے ہوئے تھے۔

اور آنکھیں سرخ تھیں۔ اب بھی حبیب الدین کی کوئی بات اگر یاد آجاتی تو پھر رو لیتے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اذانوں کے بعد حبیب الدین کی میت کو زنانے سے باہر مردانے میں لے گئے۔ میر نہال نے دیکھا، ان کے دل میں ایک ہوک اٹھی اور ان کا کلیجہ شق ہو گیا۔ دنیا اندھیر تھی، وہ پھوٹ پھوٹ کر بے اختیاری اور لاچاری سے رونے لگے۔ غسال آچکا تھا اور اس نے نہلاتے وقت سونے کی انگوٹھی جو حبیب الدین کی انگلی میں رہ گئی تھی، آنکھ بچا کر اتار لی اور اپنے ڈبے میں رکھ لی۔ احمد وزیر نے گھر گھر جا کر یہ ہونی شدنی منحوس خبر سب رشتہ داروں کو سنا دی۔ اور دو دو چار چار کر کے سارے خاندان والے، عزیز، رشتہ دار، دوست احباب اور محلے کے لوگوں سے لے کر جس نے سنا بچھڑنے والے کا آخری دیدار کرنے جمع ہو گئے۔ بیویوں کی ڈولیوں پہ ڈولیاں آرہی تھیں اور لوگوں کے ہجوم گلی تک میں کھڑے تھے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

دن چڑھ آیا تھا، میت تیار ہو چکی تھی۔ عورتوں کو ان کا منہ دکھا کر جنازہ باہر لائے اور جب لے کر چلے ہیں تو ماتم کی واویلا اور آہ و زاری کا دل ہلا دینے والا طوفان بلند ہوا اور لشکرِ غم پھر یورش کر کے چلے گئے۔

فضا پر حسرت و حرماں اداسی کے پنکھ پھیلائے کھڑے تھے۔ بے کیف ہوا چل رہی تھی اور سوکھے ہوئے پتے، کاغذ کے پرزے اور پروں کو ہوا کے جھونکے اپنی لپیٹ میں لے کر اٹھاتے، آسمان کی طرف تھوڑی دور تک لے جا کر چھوڑ دیتے اور وہ بے بسی سے ایک ایک کر کے زمین پر آپڑتے پھر تتر بتر ہو جاتے۔

میر نہال ناشاد و نامراد ڈولی میں بیٹھ کر جنازے کے ساتھ ساتھ

رہے۔ وہ سَرد دُھنتے اور سسکیاں بھرتے اور کفِ افسوس مَل مَل کر بار بار کہتے :

"اپنے بڑھے باپ کا بھی خیال نہ کیا اور منہ موڑ کر چلے گئے۔ وائے قسمت یہ دن دیکھنے کو میں زندہ رہا۔"

ان کو غم سے زیادہ یہ قلق کھائے جاتا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو کندھا دے کر اس کی آخری آرام گاہ تک نہ پہنچا سکے۔

قبرستان والی مسجد میں بے گنتی و بے شمار احباب و اقربا نے نماز جنازہ ادا کی۔ قبر ابھی تیار نہ ہوئی تھی۔ جب تیار ہوئی تو اصغر اور شمس نے حبیب الدین کو خاک کے بچھونے پر کعبہ کی طرف منہ کر کے لٹا دیا، غلاف کعبہ کا سیاہ ٹکڑا سینہ پر رکھا اور پھر کفن کے بند کھول کر ان کا آخری دیدار کرایا۔ قبر کی کھدی ہوئی تازی تازی مٹی پر میر نہال ڈولی میں بیٹھے رہے۔ جب سب لوگ ان کا منہ دیکھ چکے تو ان کی ڈولی کہاروں نے اٹھا کر قبر کے پاس لگا دی اور انھوں نے بیٹے کی صورت دیکھی۔ ان کی ڈاڑھی الجھی ہوئی اور سفید بال بکھرے ہوئے تھے اور ان کا ناتواں اور نڈھال جسم کانپ رہا تھا۔ مٹی دیتے وقت میر نہال نے بے کس و مجبور ہاتھوں سے مٹی اٹھائی اور آنسو ان کی مٹھی پر ٹپک پڑے اور مٹی کے ساتھ حسرت و محبت بھی مل گئے۔ آخر کو انھوں نے آہستہ سے مٹی قبر پر ڈال دی اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

قیامت کی نیند سو جانے والے کو اوّل منزل پہنچا کر یہ سوگوار قافلہ تھا جو خالی ہاتھ گھر واپس آیا۔ گھر میں چولھا پٹ پڑا تھا لیکن حاضری کا کھانا نصیر الدین کے ہاں سے آگیا تھا۔ اس وقت دن کے تین بج چکے تھے اور لوگوں نے اُگل نگل کر دو چار لقمے حلق سے نیچے اتار لیے جو لوگ ٹھہرے نہ تھے ان کا حصّہ ان کے گھروں

میں بھجوا دیا۔ اصغر دستر خوان پر بیٹھا ہی تھا چنبیلی کو گلی میں کھڑے ہوئے دیکھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ چنبیلی نے ایک رقعہ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا:

"میاں میں صبح بھی آئی تھی لیکن سب کے سامنے زہرہ بی نے دینے کو منع کر دیا تھا۔"

اصغر لرزتے ہوئے ہاتھوں سے خط کھولا اور پڑھنے لگا۔ خط پنسل سے لکھا ہوا تھا اور رات کے گیارہ بجے تحریر کیا گیا تھا:

"مجھے ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ امّاں کل صبح کو میری شادی کہیں اور کر رہی ہیں۔ مجھے تو صرف آپ سے محبّت ہے۔ میں بے قصور و مجبور ہوں سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ لیکن خدا کی مرضی کے سامنے انسان کا بس نہیں چلتا... لِللہ مجھے معاف کر دیجیے گا، اور کبھی کبھی اس چاہنے والی کو بھی یاد کر لیا کرنا۔

خدا حافظ

حیران و پریشان ہمیشہ ہمیشہ
آپکی ___ زُہرہ"

اور خط ختم کرنے کے بعد غالباً اچانک خیال آیا تھا کیوں کہ یہ اشعار نیچے لکھے ہوئے تھے:

جور و ستم و یاس نے قسمتِ ناسپاس نے
عاشقِ نامُراد پہ خنجرِ غم چلا دیا
جاؤ سدھارو میری جاں تم پہ خدا کی ہو اماں
بچھڑے ہوئے ملیں گے پھر قسمت نے گر ملا دیا

اصغر کے دل پر چوٹ لگی اور اس نے چنبیلی کو گھور کر اس طرح ملامت کی گویا یہ سب چنبیلی کے کیے کرتک ہیں۔ اس نے پہلے سے خبر کیوں نہ کی اور یہ شادی کیوں نہ رُکوا دی۔ چنبیلی اصغر کے تیور پہچان کر مطلب سمجھ گئی اور بولی:

"خدا کو یہی منظور تھا میاں۔ اس کے حکم کے آگے کون بول سکتا ہے۔"

اصغر یہ بھی بھول گیا کہ وہ صبح کا بھوکا ہے۔ اس کا دماغ گنگ تھا اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر گم سم بیٹھ گیا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

میر نہال غموں سے چور اور حوادثِ دہر سے پسپا، زندگی کے سامنے سپر ڈالے نڈھال اور بے دم پلنگ پر پڑ گئے۔ آسمان پر گرد و غبار چڑھا ہوا تھا اور ایک اکیلا بھولا بھٹکا ہرا کبوترا اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر چرخ کی بے پایاں تنہائیوں میں پرواز کر رہا تھا۔ صبح کو جہاں میت کے غسل کا پانی گرم کیا تھا جلی ہوئی لکڑیوں کی راکھ اور بجھے ہوئے کوئلے ابھی تک پڑے ہوئے تھے۔ کھجور کی بے برگ و بار پھننگ پر ایک چیل بیٹھی اور تھوڑی دیر تک چلچلائی اور پھر اُڑ گئی اور اس کا سیاہ اور بدصورت تن آسمان کی وسعت میں تنِ تنہا کھڑا رہ گیا۔

زندگی کا طمطراق ختم ہوا۔ حُسن جہاں سے مٹ گیا، مگر عمر کا پیمانہ پُر نہ ہوا۔ جان کی حقیقت باقی تھی اور تارِ نفس کی گردشِ پیہم۔ ان پر کسی کا زور نہیں۔ میر نہال کا دورِ حیات گزر گیا۔ فاخرہ زمانے بیت گئے۔ موت کے سرد ہاتھ نے بزمِ ہستی کے عشرت خانوں کی ایک ایک شمع گل کر دی۔ وقت کی برق پاشیوں نے دلِ جلوہ تاب کو سیاہ کر دیا، اور وہ گلِ خزاں دیدہ کی طرح کمھلا کے رہ گئے، وہ ایک سازِ شکستہ سے زیادہ بے نوا تھے۔ آفاق کی منزلوں سے کون سلامت گزرا ہے، اور میر نہال آلامِ زمان و زمن اور بیدادِ مقدرات کے رحم و کرم پر تلخیٔ حیات

پینے کو باقی تھے۔

وہ حال سے بے حال پلنگ پر مضمحل اور بے جان لیٹے رہے۔ درماندہ آفتاب مسافت طے کر کے مغرب کے غاروں میں روپوش ہوگیا۔ کوّے کائیں کائیں کرکے چلے گئے اور چڑیاں بسیرا لینے کے لیے اپنے آشیانوں کی طرف اُڑ گئیں۔ اور رات اپنے سیاہ دامن میں خاموشی کا بحرِ بے کراں لے کر آئی اور اقلیم جہاں پر اسی کی بادشاہت ہوگئی۔۔۔

کاتب وجیہ اللہ خاں وجیہہ رقم ۱۷ر جنوری ۱۹۶۸ء

اپنے دل کی حفاظت کیجیے

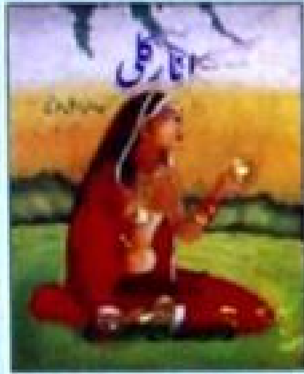


ترجمہ : نذیرالدین مینائی

صفحات : 84

قیمت : -/48 روپے

انارکلی

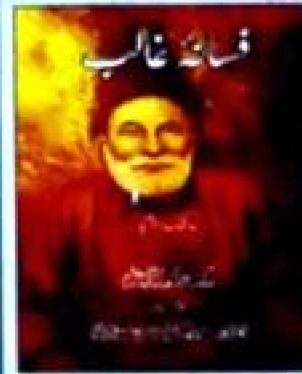


مصنف : امتیاز علی تاج

صفحات : 184

قیمت : -/60 روپے

فسانۂ غالب

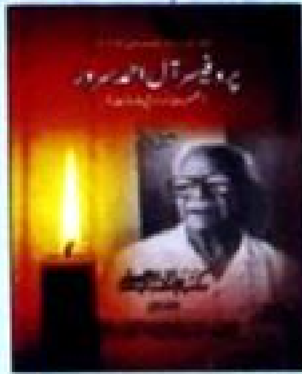


مصنف : مالک رام

صفحات : 192

قیمت : -/72 روپے

پروفیسر آل احمد سرور



مرتبہ : خلیق انجم

صفحات : 88

قیمت : -/48 روپے

فردوس بریں

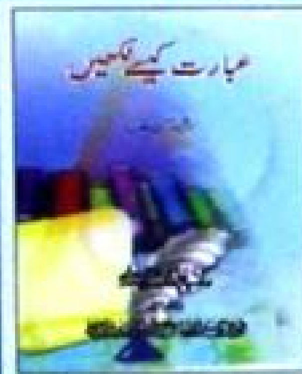


مصنف : شرر لکھنوی

صفحات : 180

قیمت : -/60 روپے

عبارت کیسے لکھیں

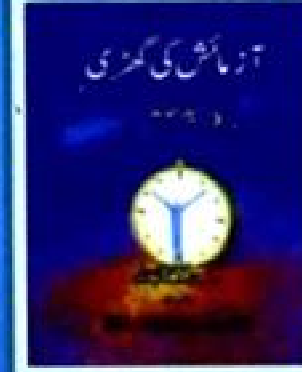


مصنف : رشید حسن خاں

صفحات : 136

قیمت : -/60 روپے

آزمائش کی گھڑی

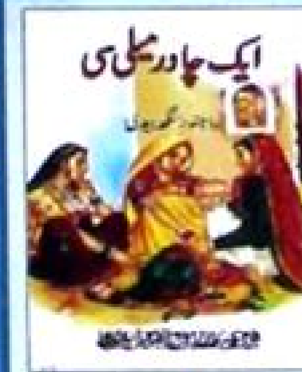


مصنف : سید حامد

صفحات : 136

قیمت : -/60 روپے

ایک چادر میلی سی

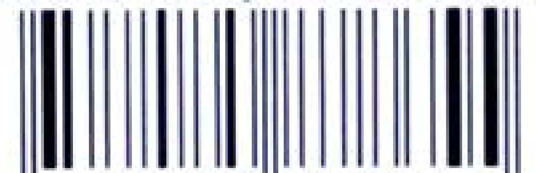


مصنف : راجندر سنگھ بیدی

صفحات : 116

قیمت : -/48 روپے

ISBN: 978-81-7587-865-5



9 788175 878655

₹ 143/-